سلسلۂ مطبوعات ادارۂ نادرات - کراچی

# نادراتِ غالبؒ

مرزا غالب کے غیر مطبوعہ خطوط
بنام منشی نبی بخش حقیر معہ مقدمہ و حواشی

افاق حسین آفاق

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ نادرات - کراچی

# نادراتِ غالبؔ

مرزا غالبؔ کے غیر مطبوعہ خطوط
بنام منشی نبی بخش حقیرؔ معہ مقدمہ و حواشی

آفاق حسین آفاق

بار اوّل سنہ ۱۹۴۹ء



ناشر

ماسٹر الطاف حسین۔ مینیجر۔ ادارہ نادرات ۵/۴۶ نیپیر پارک

کراچی

قیمت:- ۸؍

مشہور پریس کراچی نمبر ۱

سر سیّد رضا علی کے نام

# فہرست

# ہمارے ماخذ

## تصانیف مرزا غالب :-

کلیات نظم فارسی، کلیات نثر فارسی، دیوان غالب، اردوئے معلےٰ، عود ہندی، سبد چیں
خطوطِ غالب مرتبہ پروفیسر مہیش پرشاد، مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی، ادبی خطوطِ
غالب مرتبہ مرزا محمد حسن عسکری، متفرقات غالب مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی۔

---

ذکر غالب مصنفہ مالک رام، غالب مصنفہ غلام رسول مہر، آثار غالب مصنفہ شیخ
محمد اکرام، دہلی کا آخری سانس مولفہ خواجہ حسن نظامی، جلوۂ صحیفۂ زریں مرتبہ طالب
دہلوی، رہنمائے دہلی، تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سیکسینہ۔
آب حیات مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد، خمخانۂ جاوید مصنفہ لالہ سری رام،
گلشن بیخار مرتبہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، تذکرہ سخن شعرا مرتبہ عبد الغفور نساخ،
تذکرۂ ناموران دہلی مرتبہ مرزا نعیم اللہ بیگ کوثر دہلوی، تذکرۂ گلستانِ بے خزاں
مرتبہ میر قطب الدین باطن، تذکرۂ بہارستانِ ناز مرتبہ حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی
گلدستۂ نازنیں مرتبہ مولوی کریم الدین، تذکرۂ بہارِ سخن مرتبہ بابو شیام سندر لال برق
سیتاپوری، جلوۂ خضر مرتبہ صفیر بلگرامی۔

---

# سرنامہ

## (از بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

آفاق حسین صاحب آفاق میرن صاحب کے نواسے ہیں، اُردوئے معلّٰی جن کی نظر سے گزری ہے وہ میرن صاحب سے بخوبی واقف ہیں۔ میرن صاحب کو مرزا صاحب سے عقیدت نہیں عشق تھا اور مرزا صاحب بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے پاس مرزا صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بہت سے خط تھے ان میں سے چند انہوں نے مجھے بھی عنایت فرمائے تھے آفاق صاحب کو مرزا صاحب کے خطوں کا ایک مجموعہ جو اب تک شائع نہیں ہوا ہے ترکے میں ملا ہے یہ سب خط مرزا صاحب کے قدرشناس اور عزیز دوست منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام ہیں۔ مرزا صاحب منشی نبی بخش حقیرؔ کی سخن فہمی اور ذوق کے بہت قائل تھے اور ان سے انہیں خاص تعلق اور خلوص تھا جو ان رقعات کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے اس بنا پر یہ خطوط بہت بیش قدر ہیں۔

آفاق صاحب نے صرف خطوط کی اشاعت پر بس نہیں کی بلکہ مرزا صاحب کے بہت سے نجی اور معاشرتی حالات، قلعہ سے تعلق اور روزمرہ کی زندگی وغیرہ

کی بہت سی باتیں بھی اس مجموعہ میں شامل کر دی ہیں۔ ایک اور اچھا کام یہ کیا ہے کہ ان خطوں میں نیز دوسرے خطوں میں جن اصحاب اور مقامات کے نام آئے ہیں، ان کے حالات بھی تلاش کر کے لکھ دیئے ہیں۔ بعض خطوں کے سنہ اور تاریخ کی تصحیح بھی کر دی ہے۔ کتاب کے (حصہ اول کے) آخر میں مرزا صاحب کے شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں ان کے مختصر حالات زندگی اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ یہ فہرست دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہوں گے کہ جنہیں یہ علم ہو کہ ان کے شاگردوں کی تعداد تیرانوے ہے۔

مرزا غالب پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور ابھی اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ یہ مجموعہ جسے آفاق صاحب نے "نادراتِ غالب" کا نام دیا ہے اس موضوع میں قابل قدر اضافہ ہے اس میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں۔ جو کسی دوسری جگہ نہیں ملیں گی۔ آفاق صاحب نے نہ صرف بہت سے ان غیر مطبوعہ نادر رقعات کو ضائع ہونے سے بچا لیا جو منشی بنی بخش حقیر کے نام ہیں۔ بلکہ اپنی طرف سے تلاش و تحقیق کے بعد ایسے حواشی وغیرہ کا اضافہ کیا ہے۔ جن میں بہت سی کارآمد معلومات ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ سعی مشکور ہو گی۔

عبدالحق

۱۲ مئی ۱۹۴۹ء

# تمہید

بزرگوں کے تبرکات میں مرزا غالب کے یہ غیر مطبوعہ مکتوبات بھی شامل تھے۔ جنہیں "نادرات غالب" کے نام سے ارباب نظر کی خدمت میں سرمایۂ ناز بناکر پیش کیا جارہا ہے۔ یہ خطوط مرزا غالب کے عزیز دوست میر مہدی حسین مجروح اور میر افضل علی عرف میرن صاحب نے فراہم کئے تھے۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ چونکہ میں نے اسی خانوادے میں آنکھیں کھولی ہیں۔ اس لئے اس گنجِ گرانمایہ کو محفوظ رکھنے کا شرف بھی میرا ہی حصہ رہا۔ اس صحیفۂ ادب کا تملک و تصرف ہر چند میرے لئے قابل رشک رہا ہے۔ لیکن دنیائے ادب کو اس سے محروم رکھنا بھی ایک گناہ سے کم نہ تھا۔ ویسے بھی اس کی اشاعت ادبی خدمت کے علاوہ ایک ایسا قومی فرض تھی جسے ادا کئے بغیر سبکدوشی ممکن نہ تھی۔ مجھے اپنی اس سعادت پر بجا فخر ہے کہ یہ کام میرے ہی ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ اردو زبان اپنے سرمایۂ ادب میں اس گرانمایہ اضافہ پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔ اس مجموعہ میں خط عـ۲ جو مارچ ۱۸۴۸ء کا مرقومہ

ہے۔ مرزا غالب کے مطبوعہ و فراہم شدہ اردو مکتوبات میں سب سے پہلا خط
ہے۔ اور اس اعتبار سے اپنی جگہ ایک منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے
یہ خطوط تمام تر منشی نبی بخش حقیر کے نام ہیں۔ دو خط جو ان کے بڑے فرزند
منشی عبداللطیف کے نام تھے وہ بھی اس مجموعہ میں بلحاظِ تاریخ شامل کر دئے گئے ہیں
پہلا خط فارسی کا پنج آہنگ میں موجود ہے۔ دو خط منشی نبی بخش کے نام کے اور ایک
منشی عبداللطیف کے نام کا اردوئے معلّٰی میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مختصر سا
خط مولانا حالی نے یادگار غالب میں درج کیا ہے مزید برآں "یادگار[1] غالب" میں
بعض دیگر خطوط کے اقتباسات مختلف مقامات پر نقل کئے گئے ہیں۔ انہیں اقتباسات
اور انہیں مطبوعہ خطوط سے غالب کے مبصرین و ناقدین اپنی کتابوں میں حوالے
دیکر خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے رہے ہے۔ یہ اقتباسات جب میری نظر سے گزرتے تو
اپنے اس نادر مجموعہ کے غیر مطبوعہ ہونے پر شبہ ہونے لگتا جس سے میرے
احساس تفاخر کو صدمہ پہنچتا تھا۔ آخر ان تصانیف کی ورق گردانی کرنے "عود ہندی"
اور اردوئے معلّٰی کے ایک ایک صفحہ کو چھاننے اور دیگر خطوط غالب کے نسخوں
پہ بارہا نظر ڈال لینے کے بعد مجھے اس نتیجہ پر پہنچکر بیحد خوشی ہوئی کہ جن اقتباسات
کو نقل کیا جاتا ہے وہ یا تو "یادگار غالب" سے لئے گئے ہیں۔ یا صرف ان دو
خطوط کے حوالے ہیں جو اردوئے معلّٰی میں شامل ہیں۔

"یادگار غالب" میں ان خطوط کے اقتباسات کی موجودگی اس امر
کی دلیل ہے کہ خطوط کا یہ مجموعہ مولانا حالی کے پیش نظر رہا ہوگا۔ مولانا
حالی "یادگار غالب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

---

[1] دیکھئے صفحہ ۵۸، ۱۰۶، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۷، یادگار غالب مطبوعہ کریمی پریس لاہور

"پچھلے برسوں جبکہ میں دلّی میں مقیم تھا بعض احباب کی تحریک سے اس خیال کو (مرزا غالب کی زندگی کے عام حالات جمع کرنے کے خیال کو) اور زیادہ تقویت ہوئی۔ میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لیکر جمع کیا اور جسقدر ان میں سے ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا ان کو قلمبند کیا اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں۔ یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں ان کو بھی ضرور تحریر میں لایا۔ مگر ابھی ترتیبِ مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اور کاموں میں مصروف ہوگیا۔ اور کئی برس تک وہ تمام یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں:-

آگے چل کر خواجہ حالی لکھتے ہیں۔

"میں نے ان مٹھوں کو کھولا اور ان یادداشتوں کے مرتب کرنیکا ارادہ کیا مگر ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصانیف پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی اور اس کے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہونگی میں نے دلّی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور انہوں نے مہربانی فرما کر میری تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے لکھ کر میرے پاس بھیج دیئے اور اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اس کی تکمیل ہو سکتی تھی، مکمل کی گئی۔"

خواجہ حالی کے ان بیانات سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کہ مکاتیب کا یہ مجموعہ ان کے پیش نظر رہا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے پانی پت تک کی مسافت طے کی ہو۔

ان خطوط میں بہت سے ایسے خط تھے جن پر مرزا غالبؔ سے تاریخ کا اندراج رہ گیا تھا۔ ایسے خطوط کی تاریخی تدوین کر دی گئی ہے اور پڑھنے والوں کی

سہولت کیلئے تمام خطوط کو بحساب سنین ترتیب دیا گیا ہے۔ مزید دلچسپی کے لئے پیراگراف بھی بنا دئے گئے ہیں۔ مدون تاریخ اور سنین عیسوی و ہجری کو قوسین میں دکھایا گیا ہے تاکہ ان کی تمامتر ذمہ داری میرے سر ہو۔

تاریخی تدوین میں "خطوط غالب" مرتبہ پنڈت مہیش پرشاد سے بہت کچھ مدد ملی لیکن بعض بعض مقامات پر پیچیدگیوں میں اضافہ بھی ہوا۔ تفتہ کے نام جو خطوط ہیں ان میں بعض کی تاریخیں محل نظر ہیں جو ترتیب خطوط پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ خط ۱ کی تاریخ اگست ۱۸۴۹ء کے بجائے مئی ۱۸۴۸ء ہونی چاہیئے۔ خط ۳ ۱۸۵۱ء کے بجائے اکتوبر ۱۸۵۲ء کا مرقومہ معلوم ہوتا ہے۔ خط ۹ مارچ ۱۸۵۳ء کو اور خط ۱۴ ۲۸ مارچ سے ششم اپریل ۱۸۵۳ء تک کسی دن لکھا گیا ہوگا۔ خط ۲۲ کی تاریخ مئی ۱۸۵۵ء معین ہو جاتی ہے۔ شاید پنڈت مہیش پرشاد اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی میری اس حقیر رائے سے اتفاق فرمائیں۔

اس مجموعہ سے دیگر خطوط کی تاریخی تدوین میں بھی بہت مدد ملے گی۔ مثلاً عودِ ہندی میں چودھری عبدالغفور سرور کے نام جو خطوط ہیں ان میں پہلے خط کی تاریخ اپریل یا مئی ۱۸۵۸ء اور خط ۲۵ کی اکتوبر ۱۸۶۰ء معین ہو جاتی ہے۔

نادرات غالب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تحقیقی ابواب پر مشتمل ہے۔ اور دوسرے میں متن و حواشی درج کیے گئے ہیں۔ متن میں جو خطوط شامل ہیں وہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۹ء تک کے دور میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ اتفاق سے مرزا غالب کی زندگی کا یہ دس سالہ دور کافی تاریکی میں تھا۔ ان خطوط سے یہ خلا بھی پورا ہو گیا۔

غالب پر لکھنے والے بہت کچھ لکھ چکے اس لئے غالب کی زندگی سے متعلق مختلف مسائل کی تلاش اور ان پر عبور حاصل کر کے ان کا حل پا لینا بظاہر بے حد

دلچسپ مشغلہ ہے۔ لیکن یہ صبر آزما اور حوصلہ فرسا کاوش کا کام ہے بعض اوقات صدہا اوراق چھاننے کے بعد بھی مقصد بر آری نہیں ہوتی۔ مزید برآں کوئی نئی بات کہنے یا کسی ایسے امر کے خلاف لکھنے کے لئے جو کلیہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہو، بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے حوصلہ چاہئے۔ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ بعض ایسی چیزیں تھیں جو صرف ان خطوط کی وجہ سے روشنی میں آئی ہیں۔ بالکل، "پرتوستان" کی تاریخ تکمیل و ترتیب تصنیف، مرزا کی قلعہ میں حاضری اور انکی پہلی تنخواہ کی کیفیت، بہادر شاہ کی تاریخ علالت، اور اسکی تفصیلات، مرزا کی بھیجنی اور کول، باندہ اور مارہرہ کے سفر کا التوا، نقدی کی شکل میں بادشاہ کو نذر دینے کی کیفیت قلعہ معلّے کے پانچ مشاعروں کا حال، عارف، ان کی اہلیہ، باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی بیماری کا بیان۔ ڈاک کی بدنظمی اور مرزا کا بیرنگ خط بھیجنے کا آغاز، مرزا کی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۵ء تک کی بیماری کی تفصیلات، ڈاڑھوں کے گرنے کا بیان، گراں گوشی اور سامعہ و شامہ کی شکایت، تاہل کی زندگی سے بیزاری اور عام طرز زندگی سے متعلق مرزا کا بیان، تعلیم نسواں سے متعلق مرزا کا نظریہ اور "دس سال" کے زیر عنوان بیشتر چیزیں صرف ان خطوط کی بدولت ہاتھ آئی ہیں۔ اور دریافت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان خطوط کی مدد سے بعض قصائد اور کلام کے کچھ حصے کی تاریخ تصنیف بھی معین کی جا سکی ہے۔ جس سے بڑے کار آمد اور اہم نتائج نکلتے ہیں۔

"مرزا غالب کے شاگرد" ہمارے موضوع سے بظاہر ایک ہٹی ہوئی چیز سہی، لیکن ایک نئی چیز ضرور ہے۔ آج سے پہلے کس نے سوچا تھا اور یہ کسے گمان گزرتا تھا کہ مرزا کے شاگردوں کی تعداد کم از کم تیرانوے ہے۔ ایک ایسے مقام پر جہاں اردو علم و ادب کا چرچا بہت کم رہا ہو اور جہاں اردو ادب سے

تعلق رکھنے والے لٹ کھٹ کر آئے ہوں اور پھر ایسے تنگ وقت میں جبکہ کتاب آدھے سے زیادہ چھپ چکی ہو۔ مرزا کے شاگردوں کی اتنی طویل فہرست مع حالات و نمونۂ کلام مرتب کر لینا کچھ کم لائقِ داد بات نہیں۔ اس دشوار گزار مہم کا خیال میرے محترم دوست مرزا نعیم اللہ بیگ کوثر دہلوی نے دلایا تھا۔ اور یہ مہم ان ہی کی سرگرمیوں کی مدد سے سر ہوئی۔ کوثر صاحب مدتِ مدید سے ایک کتاب موسوم بہ تذکرۂ نامورانِ دہلی کا مسودہ تیار کر رہے ہیں۔ اگر صاحب موصوف اپنی اس تالیف کی جانب بہت جلد ہمہ تن مصروف ہو سکیں تو کتنا اچھا ہو۔ حاشی میں صفحہ ۱۴۴ پر نواب انوار الدولہ شفقؔ کا غیر مطبوعہ سہرا جو غالبؔ و ذوقؔ کے مشہور سہروں کی زمین میں ہے۔ کوثر صاحب کے زیر تالیف تذکرہ ہی سے لیا گیا ہے۔ کوثرؔ صاحب کی اس فراخدلی کا شکریہ ادا کرتے وقت مجھے یقیناً دنیائے ادب کی نمائندگی حاصل ہے۔

ذوق علم و شعر کے اشتراک اور رجحانِ طبیعت کی مناسبت نے منشی نبی بخش اور غالب کے درمیان جو یگانگت پیدا کر دی تھی اس نے ان خطوط کو نجی خطوط کی حیثیت دیدی ہے۔ مرزا کو ہر چیز کی جزئیات و تفصیلات لکھنے کی عادت تھی۔ لیکن جتنی اور جیسی نوعیت کی تفصیلات مرزا نے منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھی ہیں۔ وہ ان کی دوسری نگارشات میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ اور ان کا موضوع بھی مختلف و ممتاز ہے پنج آہنگ میں منشی نبی بخش حقیرؔ کی سخن فہمی اور سخن سنجی سے متعلق ایک فارسی خط بنام تفتہ موجود ہے جس سے منشی نبی بخش کے مزید حالات معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ یہ خطوط چونکہ تمامتر منشی صاحب موصوف کے نام تھے اس لئے ان کے جو حالات و اشعار فراہم کئے جا سکے انہیں ایک علیحدہ باب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے چھپ چکنے کے بعد اتنا اور معلوم ہوا کہ منشی نبی بخش حقیرؔ کی ایک مثنوی موسوم بہ "درودِ غالب" ۱۸۶۲ء میں ستارۂ ہند

پریس آگرہ سے شائع ہو چکی تھی۔ حقیر کا ایک اور شعر بھی معلوم ہوا ہے

حقیر آگرہ میں ہم ملے ہیں غالب سے
زہے نصیب کہ دیدار دوست کا دیکھا

یہ مثنوی چونکہ نظر سے نہیں گزری اس لئے اس کے متعلق کچھ لکھنا ممکن ہی نہیں لیکن اگر "ورودِ غالب" کو تاریخی نام سمجھ لیا جائے۔ تو مرزا کے آگرے جانے کی تاریخ ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۴ء یا ۱۸۳۳ء نکلتی ہے مرزا غالب نومبر ۱۸۲۹ء میں سفر کلکتہ سے دہلی واپس آئے تھے۔ اور منشی نبی بخش حقیر ۱۸۴۷ء میں مرزا کے ہاں دہلی میں اقامت پذیر ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ مرزا ۱۸۳۳ء یا ۱۸۳۴ء میں بھی آگرے گئے ہوں۔

مندرجہ بالا شعر حقیر کی کسی غزل کا مقطع معلوم ہوتا ہے جس کا قافیہ "کا" اور ردیف "دیکھا" ہو گی۔ شعر کا انداز بتا رہا ہے کہ منشی نبی بخش غالب کو اپنے برابر کا سمجھتے تھے۔ اور انہیں کوئی امتیازی رتبہ نہ دیتے تھے "ملے ہیں" کے الفاظ محل نظر ہیں۔

مرزا کی طبی دستگاہ کے متعلق بھی اتنا مواد اور کہیں نہیں ملے گا اس فن میں مرزا کی دسترس کے بیشتر شواہد ان ہی خطوط کی بدولت ہاتھ آئے ہیں۔

غالب کے ان خطوط میں بعض پر سو سال گزر چکے بعض پر ایک صدی ہونے کو آئی۔ لیکن وقت کا امتداد ان کی شگفتگی و تازگی کو افسردہ نہ کر سکا۔ اس میں مرزا کے اجتہاد فکر و جدتِ اسلوب کا سب سے بڑا حصہ ہے مرزا کے مطبوعہ خطوط کی خوبیوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان غیر مطبوعہ خطوط پر "انشائے غالب" کے زیر عنوان ایک جداگانہ باب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب کا سرنامہ ایک ایسی عظیم المرتبت ہستی کے افکار کا نتیجہ ہے

جس کا مرزا غالب کے عزیز ترین دوستوں اور شاگردوں سے بہت قریبی تعلق رہا ہے جس کی ادبی خدمات، انتظامی قابلیت، خوش تدبیری، بلند ہمتی اور پچھلی پچیس تیس سالہ کارگزاریوں کی بنا پر دنیائے ادب "بابائے اردو" کے نام سے پکارتی ہے۔ مولوی صاحب قبلہ نے اپنے افکار، مصروفیات اور ترک "مقدمہ بازی" کے باوجود یہ سطور لکھ کر ان شفقتوں کا اظہار کیا ہے جو آپ میرے حال پر فرماتے رہتے ہیں۔

سر سید رضا علی جنکے نام نامی اور اسم گرامی سے اس کتاب کو معنون کیا گیا ہے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ سیاست میں اگر آپ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ تو دنیائے اردو کے بھی بلند ترین حلقوں میں آپ کے ہر ارشاد کو وثیقہ و سند کا رتبہ دیا جاتا ہے "سرنامہ" اور "انتساب" کی یہ امتیازی خصوصیات بھی میرے لئے کچھ کم فخر کا باعث نہیں۔

ادب پر گفتگو کرتے ہوئے بعض اوقات بڑے پتے کی باتیں زبان سے نکل جاتی ہیں۔ انگریزی ادب کے مورخ پروفیسر سینٹس بری نے مذاق میں کیا بات کہی ہے۔

> "اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں کوئی غلطی نہیں ہے تو وہ مسخرہ جھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی توقع رکھے جس میں کوئی غلطی نہ ہو تو وہ اس سے بڑھ کر لغو ہے"

آرزو ہے کہ مستند نقادوں کے مخلصانہ اور تخلیقی مشوروں سے اس کا دوسرا ایڈیشن ایسا پیش کروں جو ہر اعتبار سے مکمل ہو۔

کاغذ کی دقت اور اسباب طباعت کی گرانی کے باوجود کتاب ظاہری حسن کے اعتبار سے بھی کچھ بری نہیں۔ کتاب کی ضخامت اور اسے بے فائدہ

وزنی ہونیسے بچانے کیلئے ہر امکانی اختصار پیش نظر رہا لیکن کتاب جب اپنی آخری منزل پر پہنچی تو ایک ولد داہم آب (مرزا غالب کے شاگرد) کے اضافے کی شدید ضرورت محسوس کی گئی جس کی وجہ سے نہ صرف اس کی ضخامت ہی بڑھ گئی۔ بلکہ مزید کاغذ کا انتظام بھی کرنا پڑا۔ اس وقت پہلی قسم کا کاغذ دستیاب نہ ہو سکا۔ کتاب کو صرف کاغذ کے لئے روک دینا مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لئے بعض نسخوں کے کاغذ میں کچھ اختلاف پایا جائیگا۔ انشاءاللہ اگلی اشاعت میں یہ ناہمواری دور کردی جائیگی۔

علمی اور تحقیقی کتابوں کے سرورق پر عام طور پر دو ”چوچلے“ سے کام نہیں لیا جاتا۔ ”نادرات غالب“ کے ٹائیٹل کی سادگی اور اس کا ڈیزائن کسی کو پسند ہو یا نہ ہو، مجھے ضرور پسند ہے اور مجھے یقین ہے کہ اکثر اہل نظر کو مجھ سے اتفاق ہوگا۔

آخر میں اگر میں اپنے تمام معاونین کا نام بنام شکریہ ادا نہ کروں تو شاید کفر کا مترادف ہو۔ اس فہرست میں سب سے پہلے اپنے محترم پروفیسر سید وزیر الحسن کا نام لینا ضروری سمجھتا ہوں جنکی قربت اور علاقۂ مہر و اخلاص نے علم و ادب کی خدمت کا صحیح ذوق پیدا کیا اور نہ صرف اپنی لائبریری سے مطالعہ کے لئے کتابیں مرحمت فرمائیں بلکہ اپنے گرانقدر مشورے سے بھی مستفیض فرماتے رہے مولانا غلام رسول مہؔر کی نوازشات کا شکریہ بھی واجب ہے جنہوں نے اپنی وسیع مصروفیات کے باوجود اس کتاب کے حواشی کا مطالعہ فرمایا۔ اور استفسارات کے نہایت فراخدلی سے جواب دیتے رہے۔ ڈاکٹر اظہر علی، مرزا نعیم اللہ بیگ کوثؔر دہلوی، طالب دہلوی، فضل حق قریشی دہلوی، منوؔر لکھنوی، شیوراج بہادر، شیخ محمد اکرام اور ممتاز حسن احسؔن کا بھی بدل ممنون ہوں جنہوں نے مختلف کتابیں پڑھنے کے لئے مرحمت فرمائیں۔ حکیم راغب مرادآبادی، شمس زبیری اور اسلم فرخی کی بھی اعانت کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے نہایت مستعدی سے کاپیوں

کی تصحیح اور پروف پڑھنے کے غیر دلچسپ کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔
خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے علم و ادب اور ملک و ملت کی خدمت کے جذبے سے بہرہ مند فرمائے اور بزرگوں کے اشفاق و عنایات کا اہل بنائے۔

آفاق حسین آفاق
۲۴ مئی ۱۹۴۹ء



مولف

# حصّہ اوّل

# منشی نبی بخش حقیرؔ

مرزا غالب کے ارادتمندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا لیکن جو شخصیتیں اس تعلق کی وجہ سے اردو ادب میں مستقل حیثیت پا گئی ہیں ان میں منشی نبی بخش حقیرؔ کا نام کچھ کم نمایاں نہیں۔ ان کے باہمی مراسم کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ یقینی بات ہے کہ منشی نبی بخش حقیرؔ کو بھی شعر و ادب کا ذوق تھا۔ ۱۸۲۷ء میں دہلی آئے اور غالبؔ کے ہاں قیام کیا۔ دوران قیام میں شعر و سخن کے بھی مذاکرے رہے۔ ذوق علم و ادب کا یہی علاقہ اخلاص و محبت کے رشتہ کا باعث بنا جو تا عمر قائم رہا۔

مرزا غالب نبی بخش حقیرؔ کی صحبت سے بہت متاثر ہوئے جس کا اندازہ اس فارسی خط سے لگانا چاہیے جو ہر گوپال تفتہؔ کو ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء کو لکھا گیا تھا۔ غالب جیسا مزاج دان و مردم شناس شاعر جو اپنے بڑے سے بڑے ممدوح کی ایک حد سے زیادہ "دوبھٹی" نہ کر سکتا تھا، منشی نبی بخش حقیرؔ کے متعلق دیکھئے کیا کہتا ہے:

"خدا نے میری بے کسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درمان اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی۔ دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں۔ مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا۔ یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے۔ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پہ دنیا سے قانع۔"

اسی فارسی خط کی وجہ سے "منشی نبی بخش حقیر" غالب پر کام کرنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ غالب کے سوانح نگاروں اور نقادوں نے ان کے مفصل حالات دریافت کرنے کے لئے بڑی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہوگا لیکن ان کی مساعی کا نتیجہ ظاہر ہے۔ قدیم تذکروں کی ورق گردانی کے بعد بھی بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ نبی بخش حسین بخش کے بیٹے تھے۔ آگرے میں محلہ تاج گنج میں رہتے تھے۔ کول

(علیگڈھ) میں بعہدۂ سررشتہ داری فائز تھے اور میر گلزار علی اسیر[۱] سے تلمذ تھا۔ اس باب میں

---

[۱] میر گلزار علی اسیر ولی محمد نظیر اکبرآبادی کے صاحبزادے تھے ۱۸۷۷ء میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

روح سے مصرعہ ملا جب قالبِ انسان کا
کیا ہی برجستہ ہوا مطلع مرے دیوان کا

ہم کہاں ساقی کہاں ساغر اسیر
یہ بھی ندی ناؤ کا سنجوگ ہے

جو لوگ ہنستے ہیں عاشق کے خون رونے پر
الٰہی ان کو بھی دردِ جگر دیا ہوتا

چلّو بھر پانی میں ہے ڈوبتا غیرت والا
بے حیا گالیاں کھاتا ہے کھڑا دریا میں

لختِ جگر کے پھول کھلا کر بہار میں
کنجِ قفس اسیر پھلٹی بنائیں گے

بارہ برس جو خدمت مرشد کی کی اسیر
تب بھاوڑے کا نام سنا گل صفایہ ہے

شادی کے گل کھلے کہیں غم کے ثمر لگے
فی الواقعی یہ گلشن گیتی دو رنگ ہے

مال رہ جائے کسی پاس نہ دولت رہ جائے
یہ بڑی چیز ہے دنیا میں جو عزت رہ جائے

واعظ کی لاکھ دفعہ اڑائی ہیں دھجیاں ✣ سو بار لتّے زاہدِ مکّار کے لیے

جو حالات پیش کئے جا رہے ہیں ان کا ماخذ یہی خطوط ہیں۔

## منشی نبی بخش کی اولاد۔

منشی نبی بخش کے بیٹوں میں بڑے کا نام عبداللطیف اور دوسرے کا نام نصیرالدین تھا۔ خط نمبر ۵ اور نمبر ۶ میں ایک اور لڑکے کا ذکر آیا ہے لیکن اس کے نام کا مرزا نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ لڑکیوں میں سب سے چھوٹی لڑکی کا نام ذکی النساء بیگم تھا۔

عبداللطیف کی پہلی بیوی سے دو بچے ہوئے۔ مارچ ۱۸۵۱ء میں اکرام الدین عرف عبدالسلام پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش پر غالب نے منشی نبی بخش کو اور عبداللطیف کو مبارکباد کے خط لکھے۔ اور قطعہ تاریخ بھی لکھ بھیجا۔ اپریل ۱۸۵۲ء میں لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام کلثوم بیگم رکھا گیا۔ آخر ستمبر ۱۸۵۴ء میں ان بچوں کی ماں بخار کھانسی میں مبتلا ہوئی اور شروع اکتوبر میں انتقال کیا۔ ان بچوں کو تھوڑے عرصے کے لئے انکی پھپھوں کے پاس اکبر آباد بھیج دیا گیا۔ اس سانحہ کے کچھ عرصے بعد عبداللطیف خود بیمار ہو گئے جس کا سلسلہ جون ۱۸۵۵ء تک چلتا رہا۔ اسی مہینے یعنی جون ۱۸۵۵ء میں عبدالسلام کی رسم بسم اللہ ادا کی گئی اور اس سے اگلے مہینے یعنی جولائی ۱۸۵۵ء میں ان کی دوسری شادی کر دی گئی۔ مرزا غالب عبداللطیف کی دوسری شادی کے مخالف تھے۔

اگست ۱۸۵۵ء میں عبداللطیف میرٹھ میں ملازم ہو گئے۔ غالب کو بھی ان کی تنہائی کا الم تھا۔

عبداللطیف کے نام مرزا کے کل دو خط فراہم ہوئے ہیں۔ پہلا ۱۰ مارچ ۱۸۵۱ء اور دوسرا ۱۶ دسمبر ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ پہلے خط میں عبدالسلام کی ولادت کی مبارکباد اور قطعۂ تاریخ کا ذکر ہے۔ دوسرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللطیف نے بارہ کتابوں اور ایک جنتری کا پارسل مرزا کو بھیجا تھا اور اپنی مہر کھدوانے

کی فرمائش کی تھی۔ جسے مرزا پورا کرنے کو تیار تھے۔ ان بارہ کتابوں کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

عبداللطیف ایک اچھے صحاف بھی تھے اس لئے مرزا غالب نے "دستنبو" کی چند جلدوں کی آرائش و تزئین کا کام ان کے سپرد کرنا چاہا تھا۔ چنانچہ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"چھ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں۔ تزئین تم کرو۔"

لیکن یہ کام عبداللطیف کے ہاتھوں انجام نہ پایا اور انھوں نے معذرت چاہی جسے مرزا نے قبول کیا۔ اصل حقیقت جو کچھ بھی تھی وہ تفتہ نے مرزا کو لکھ بھیجی۔ چنانچہ جواب میں تفتہ کو لکھا:

"ظاہرا منشی عبداللطیف نے پہلو تہی کی۔ اب تم جلد ہائے کتاب کے باب میں برادرزادہ سعادت مند کو تکلیف نہ دو۔"

اپریل ۱۸۵۳ء میں عبداللطیف نے اپنی کچھ فارسی نظم و نثر مرزا کے پاس بغرض اصلاح بھیجنے کا ارادہ کیا جو شاید کبھی پورا نہ ہوا لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی فارسی ذوق رکھتے تھے اور انھیں بھی شعر و سخن کا شوق تھا۔

عبداللطیف کی بیماری پر مرزا غالب نے متعدد ادویہ معہ ترکیب استعمال تجویز کیں جن کا ایک علیحدہ باب میں "غالب کی طبّی دستگاہ" کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔

منشی نبی بخش کے دوسرے بیٹے نصیرالدین کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ ان کی شادی ۱۸۵۱ء میں ہوئی تھی۔

ذکی النسا بیگم منشی نبی بخش کے ہمراہ ۱۸۴۷ء میں مرزا کے ہاں آئی اور

ان سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ جب کبھی اپنے بھائی بہنوں سے لڑتی تو کہتی کہ میں مرزا صاحب کے ہاں چلی جاؤں گی۔ ہر آنے جانے والے کے ہاتھ مرزا کو کوئی نہ کوئی پیام ضرور بھیجتی۔ مرزا ان پیامات کے جواب میں جس شوخی اور ظرافت سے کام لیتے تھے وہ ان خطوط سے ظاہر ہے۔ اگست ۱۸۵۴ء میں اسے پردے بٹھایا گیا۔ جولائی ۱۸۵۵ء میں بات ٹھہری اور جون ۱۸۵۶ء میں شادی ہو گئی۔ منشی نبی بخش نے اسی کی شادی کے لئے پلنگ کے پایوں کی فرمائش کی تھی جو غالباً پوری نہ ہوئی۔

## نبی بخش اور تفتہ

ان دونوں کے باہمی مراسم کی ابتدا کا حال معلوم نہ ہو سکا اور نہ یہ اتنا اہم ہے۔ نبی بخش بھی آگرے کے رہنے والے تھے۔ تفتہ کا بھی اکبر آباد سے کچھ تعلق تھا۔ ممکن ہے ان حضرات کے آبائی تعلقات ہوں اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان دونوں صاحبوں کی باہمی ملاقات کی تقریب کوئی ادبی صحبت یا ذوق سخن کی مطابقت ہو۔

باہمی بے تکلفی اور یگانگت کے باعث دونوں ایک دوسرے کے درد کے شریک تھے۔ نبی بخش کو جب احتراق کی شدت نے بہت ستایا تو تفتہ نے غالب کو لکھا کیونکہ وہ بھی اسی مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ غالب نے طب محمد حسین خانی میں سے ایک نسخہ معہ ترکیب استعمال لکھ کر بھیج دیا۔

تفتہ نے اپنا پہلا دیوان ۱۸۴۸ء کے آغاز میں مکمل کر لیا تھا۔ اس کے دیباچہ کے لئے انھوں نے غالب کو لکھا۔ غالب نے اپنی روش کے مطابق اس کا دیباچہ لکھ دیا۔

تفتہ کو یہ دیباچہ پسند نہ آیا اور شکایت کی کہ آپ نے میری ہجو ملیح لکھی ہے۔ غالب اس سے بہت آزردہ ہوئے اور ایک نرم و سخت خط تفتہ کو لکھا۔ منشی نبی بخش

بیچ میں پڑے اور ان کی سفارش سے غالب اور تفتہ کے درمیان جو ایک قسم کا حجاب پیدا ہو گیا تھا ہٹ گیا۔

۱۸۵۵ء میں تفتہ نے اپنا دوسرا دیوان مکمل کر لیا اور پھر غالب سے دیباچہ لکھنے کی درخواست کی۔ غالب نے بالکل دو ٹوک جواب دے دیا کہ "دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟" غالب کے اس جواب سے تفتہ کو دوبارہ خط لکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ آخر منشی نبی بخش پھر بیچ میں پڑے سعی و سفارش کی لیکن غالب دیباچہ لکھنے پر راضی نہ ہوئے۔ اس طرح تقریباً پانچ ماہ غالب و تفتہ کے درمیان خط و کتابت بند رہی۔

تفتہ یوں تو منشی نبی بخش سے ملنے علیگڈھ جاتے ہی رہتے تھے لیکن جب جے پور کے قضیے میں جانی جی سے کشیدگی ہو گئی تو تفتہ کئی ماہ تک علیگڈھ میں ان ہی کے ہاں رہے۔ ۱۸۵۸ء میں دستنبو کی طباعت کے سلسلے میں انہی کے دوش بدوش کام کیا۔ نومبر ۱۸۶۰ء میں جب نبی بخش کا انتقال ہوا تو تفتہ ہی کے اصرار پر غالب نے مرحوم کا قطعۂ تاریخ وفات لکھا تھا۔

تفتہ نے نبی بخش کی مدح میں دو قطعہ لکھے تھے جن میں سے ایک مرزا غالب کو بہت پسند آیا ؎

دگر کہ گریہ کند سر بمرگ ما زنیاں
دگر کہ از لبش ابنگونہ ہا ہو بچکد

بود حقیر بہ فن محبت آں یکتا
کہ خوں شود دل ما وز چشم او بچکد

· ـــ · ـــ · ـــ · ـــ ·:· ـــ · ـــ · ـــ · ـــ ·

## نبی بخش حقیر کی بیماری۔

مرزا غالب کی طرح نبی بخش بھی احتراق اور فساد خون سے پیدا ہونے والے امراض میں مبتلا تھے۔ ان کی بیماری کا ذکر سب سے پہلے ایک خط بنام تفتہ مرقومہ مئی ۱۸۴۸ء میں آیا ہے۔ اس خط سے عارضہ کی نوعیت کا تو پتہ نہیں چلتا البتہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مرض کوئی سوداوی تھا۔ کسی بدایوں کے حکیم کے زیر علاج تھے اور بار، الجبن کے استعمال سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ مرزا نے "طب محمد حسین خانی" میں سے ایک نسخہ جو انھیں یاد تھا لکھ کر بھیج دیا۔ ترکیب استعمال بتلائی اور لکھا کہ فائدہ اس کا بیس دن میں معلوم ہوگا۔ یہ نسخہ پانی کے مدبر کرنے کی ترکیب تھی جو کسی علاج کے دوران میں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۰ء میں احتراق کی شدت کا ذکر آیا ہے۔ مرزا لکھتے ہیں:

"میرا اور آپ کا لہو ملتا ہے۔ جب وہاں احتراق کی شدتیں ہیں تو یہاں اس کا ظہور کیوں نہ ہو۔"

بیماری کا یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ ۲ر جنوری ۱۸۵۱ء کی تحریر سے بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس وقت تک مرض میں شدت باقی تھی۔ مارچ ۱۸۵۱ء میں مرزا نے ایک عرق تجویز کیا۔ اس عرق کے استعمال سے مرزا کو فائدہ ہوا تھا۔ کم از کم جولائی ۱۸۵۱ء تک اسی آزار میں مبتلا رہے۔ مارچ ۱۸۵۲ء میں آشوب چشم کی شکایت ہوئی۔ مارچ ۱۸۵۳ء میں امراض سوداویہ نے پھر زور پکڑا۔ نیم کی پتیاں پی کر گھی میں بیسن کی ٹکیاں ڈال کر کھاتے رہے۔ مرزا نے "نیم کی منتی" تجویز کی اور اس کے ساتھ مناسب غذا بالتفصیل بتائی۔ غالباً آخر مارچ ۱۸۵۴ء میں احتراق کا زور گھٹ گیا تھا۔ مرزا لکھتے ہیں:

"یہ کافر احتراق کی بیماری جس رنگ میں ظہور کرے

زائل ہونا نہیں جانتی تخفیف اس میں بمنزلۂ صحت کے ہے۔"

نومبر ۱۸۵۴ء میں سامعہ و شامہ میں فرق آگیا تھا۔ مرزا سے مشورہ لیا اور یہ بھی درخواست کی کہ شاہی اطبا سے مشورہ لے کر کوئی نسخہ لکھ بھیجئے۔ مرزا نے جواباً لکھا کہ ان امراض کا علاج منحصر کثرت تنقیہ میں ہے اور اس کو حضورِ طبیب و فراغِ خاطر شرط ہے۔ اس کے بعد منشی صاحب کی بیماری کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔

## غالبؔ سے اصلاح۔

بعض تذکروں میں منشی نبی بخش کو میر گلزار علی اسیر کا شاگرد لکھا ہے ممکن ہے غالب سے مراسم پیدا ہو جانے کے بعد منشی نبی بخش نے مرزا سے اصلاح لینی شروع کر دی ہو۔ ایک خط مرقومہ ۴ رجون ۱۸۴۸ء سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی بخش نے اس تاریخ سے قبل مرزا سے اصلاح لینی شروع کر دی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں:

"رباعیاں آپ کی بھیجی ہوئی میرے پاس موجود ہیں۔ بعد اصلاح کے آپ کے پاس بھیجدوں گا۔ گھبرائیے نہیں اور خاطر جمع رکھئے۔"

ایک اور خط مرقومہ ۷ر اکتوبر ۱۸۵۳ء میں بھی ایک غزل کا ذکر آیا ہے جسے مرزا بعد اصلاح واپس کر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اگلی غزل پہلے تو میاں محمد حسین دہلوی لائے اور پھر آپ نے خط میں بھیجی۔ ایک شعر اس میں میرے انداز کا تھا۔ وہ میں نے آپ کو لکھ بھیجا تھا اور باقی اور اشعار سب اچھے اور بے عیب اور ہموار۔ اگر جگہ اصلاح کی ہوتی تو میں کبھی چشم پوشی نہ کرتا۔ تم سے میرا یہ معاملہ نہیں ہے کہ خوشامد

کروں۔ تمہارا کلام میرا کلام۔ تمہارا ہنر میرا ہنر۔ تمہارا نقص میرا نقص۔ اب دیکھو اس غزل میں ایک شعر موقوف کر دیا گیا اور مطلع میں اور ایک بیت میں تغیر الفاظ ہو گیا۔ جن شعروں پر صاد ہے وہ بہت خوب ہیں۔ واہ واہ سبحان اللہ اور جن پر صاد نہیں، وہ خوب ہیں۔ بس۔"

## سخن فہمی۔

غالب کو خاطر خواہ داد نہ ملنے کی ہمیشہ شکایت رہی۔ اسی کس مپرسی کو اپنی بے کسی اور تنہائی کے عالم پر محمول کیا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کے کرمفرماؤں میں مولوی صدر الدین خاں آزردہ اور مولوی فضل حق خیر آبادی جیسے لوگ شامل تھے لیکن دینی علوم کے تبحر کے ساتھ مرزا کی آزادہ روی نبھ نہ سکتی تھی۔ آخر انھیں ایک ایسا ذی علم ہم سن مل گیا جس کے ساتھ وہ ادب و انشا کی سخن طرازی اور شعر و سخن کی بزم آرائی کر سکتے تھے جس کی افتاد طبیعت بھی ان سے میل کھاتی تھی جس کے ساتھ وہ اچھی طرح گھل مل سکتے تھے اور جس شاگرد سے استاد اپنی کاوش فکر و رشحات قلم کی داد چاہ سکتا تھا۔ مرزا غالب کے دوستوں اور ارادتمندوں میں منشی نبی بخش حقیر ہی ایک ایسا شخص تھا جو ان کی فارسی نظم و نثر کا خواہاں رہا کرتا تھا اور اسی فارسی نظم و نثر پر مرزا کو ناز تھا جس کے متعلق وہ اپنے ایک قطعہ میں لکھتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست

نبی بخش حقیر کی سخن فہمی اور سخن سنجی سے متعلق مرزا نے جو خط تفتہ کو لکھا تھا اس کا خلاصہ نقل کیا جا چکا ہے۔ حقیر کو جہاں فارسی نظم و نثر میں دسترس حاصل تھی

وہاں اردو کلام کے بھی شائق تھے۔ اس لئے مرزا کے رشحات قلم ونتائج فکر کے منتظر رہتے مرزا بھی جب تک اپنا اردو کلام اور فارسی نظم ونثر حقیر کو نہ بھیج لیتے تھے انھیں بھی چین نہ آتا تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کیسی تاریخ اور کیسی نقل۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جو نظم ونثر تمہاری نظر سے نہ گذرے وہ ضائع ہے ؎

وائے برجانِ سخن گر بہ سخنداں نہ رسد۔"

غالب کو نبی بخش سے بھرپور داد ملتی تھی۔ مرزا اپنی ایک غزل کی داد پانے پر انکساری کا اس طرح اظہار کر رہے ہیں:

"تم غزل کی تعریف کرتے ہو۔ میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں۔ پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ سو یہی روٹیاں یہی دال سالن۔"

نبی بخش کو جب کسی شعر کے مفہوم میں تامل ہوتا تو بلا کسی تکلف کے مرزا سے دریافت کر لیتے۔ بعض اوقات مرزا کو تعجب بھی ہوتا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بھائی۔ بڑا تعجب ہے۔ تم اس شعر کے معنی پوچھتے ہو۔"

مرزا غالب ان کی سخن فہمی وسخن سنجی کے آخری وقت تک قائل رہے۔ چودھری عبدالغفور سرور اپریل یا مئی ۱۸۵۸ء میں نبی بخش سے ملے اور اس ملاقات کی مرزا کو اطلاع دی۔ مرزا جواباً تحریر کرتے ہیں:

"آپ کی اور بھائی نبی بخش صاحب کی ملاقات سے میرا دل بہت خوش ہوا۔ یاد رہے کہ سخن فہمی اس بزرگوار کا حصہ ہے۔"

---

## بہ نظر اصلاح دیکھو۔

مرزا غالب کے زمانے میں بھی بڑے بڑے جید عالم موجود تھے۔ اور انھیں ان بزرگوں کے سامنے اپنا کلام پیش کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوتی رہی۔ لیکن غالب جیسے مزاج داں و مردم شناس شاعر نے کبھی یہ الفاظ کہہ کر اپنا کلام نہیں سنایا کہ "بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرمائیے" یہ شرف صرف منشی نبی بخش حقیر کو حاصل ہوا۔ مرزا ۸ / مارچ ۱۸۵۵ء کو لکھتے ہیں :

"ان دنوں دو رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کو بہ نظر اصلاح دیکھو۔"

مرزا کے یہ الفاظ نبی بخش حقیر کے ذوق شعر و سخن فہمی پر دال ہیں۔

## فرمائشیں۔

غالب اور نبی بخش حقیر دو برابر کے دوست تھے اس لئے ان میں کوئی تکلف نہ تھا۔ نبی بخش کی جانب سے اردو کلام اور فارسی نظم و نثر کی فرمائش تو غالب کی دلی مراد تھی لیکن پاکھل کے اچار مربہ کی فرمائشیں بھی ایسی تھیں جنھیں مرزا نے بخوشی پورا کیا۔ مرزا نے بھی اپنے ایک دوست کی خاطر ہاتھرس کے چاقوؤں کی فرمائش کی تھی۔ البتہ مہر نیمروز کے چند نسخوں اور پلنگ کے پائوں کی فرمائشیں ایسی تھیں جنھیں مرزا پورا نہ کرسکے۔

## ہدایا و تحائف۔

غالباً حقیر اور مرزا کے درمیان کوئی ہدایا و تحائف کا سلسلہ نہ تھا۔ ان خطوط میں صرف ایک جگہ ایک ہدیہ کا ذکر آیا ہے۔ نبی بخش کی بہو کی وفات پر مرزا غالب نے مرزا یوسف علی خاں کو رسم تعزیت بجالانے کے لئے علیگڈھ بھیجا تھا۔ مرزا یوسف علی خاں جب واپس ہوئے تو نبی بخش نے ان کے ہاتھ جاجم بھیجی۔

مرزا لکھتے ہیں:

"آداب بجا لاتا ہوں اور حاجم کا سلام عرض کرتا ہوں
یہ تکلیف کیوں کی۔ اس کی ضرورت کیا تھی۔..."

## دوستوں کی خدمت اور سفارشیں۔

منشی نبی بخش اپنے دوست احباب کی امداد کے لئے بھی مستعد رہتے تھے انھوں نے دو بار منشی ہرگوپال تفتہ کی غالب سے سفارش کی اور جو حجاب غالب اور تفتہ کے درمیان پیدا ہو گیا تھا وہ ان کی وساطت سے دور ہو گیا۔

جوالا سنگھ نبی بخش کے ایک اور دوست تھے۔ ان کا دلّی کی کسی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ حاکم مرزا غالب کا دوست تھا۔ نبی بخش نے جوالا سنگھ کو مرزا کے پاس بھیجدیا اور درخواست کی کہ انھیں حاکم سے ملوا دیجئے۔

## دستنبو کی طباعت۔

مرزا غالب نے انگریزی حکام سے تجدید مراسم و روابط کی خاطر ایک کتاب بنام دستنبو مشتمل بر حالات غدر لکھی تھی۔ چونکہ یہ کتاب افسران بالا کو پیش کرنی مقصود تھی اس لئے مرزا کی خواہش تھی کہ کتاب اچھی چھپے۔ غدر کے ہنگامہ کی وجہ سے دہلی میں کوئی مطبع رہا نہ تھا۔ اس لئے کتاب مجبوراً آگرے میں چھپوانی تھی۔ منشی نبی بخش بھی اتفاق سے ان دنوں اکبر آباد تھے۔ اور ان کی فارسی دسترس اور سخن فہمی پر مرزا کو پورا پورا بھروسہ بھی تھا چنانچہ کاپی کی تصحیح نبی بخش کے ذمہ کر دی۔ نبی بخش نے یہ خدمت بخیر و خوبی انجام دی۔ غالب نے تفتہ کو لکھا تھا کہ ایک قطعۂ تاریخ خود لکھ لو۔ اور ایک ایک مرزا حاتم علی مہر اور منشی نبی بخش حقیر سے لکھوا لو۔ لیکن غالباً ان حضرات نے قطعات تاریخ لکھے ہی نہیں ورنہ دستنبو میں ضرور شامل ہوتے۔

کاپی کی تصحیح کے دوران میں ایک ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آیا۔ دستنبو کے

مسودہ میں ایک لفظ جوار آیا۔ مرزا نے چونکہ اس کتاب میں قدیم فارسی زبان لکھنے کا التزام رکھا تھا اس لئے تفتہ اور نبی بخش کو اس لغت پر شبہ ہوا اور انھوں نے غیاث اللغات میں یہ لفظ دیکھا جب مرزا کو اس کا علم ہوا تو بہت رنج ہوا اور لکھا:

"بھائی میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان اجزا کا جن کی روسے کاپی لکھی جاتی ہے۔ فارسی کا عالم ہے علم اس کا غیاث الدین رامپوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق ان اوراق کے ہو نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔"

مرزا کی اس تحریر سے نبی بخش پر کچھ اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن اُن کا کسی لفظ کے لئے لغت دیکھنا اس امر کی دلیل ضرور ہے کہ وہ کاپی کی تصحیح کے باب میں اپنی ذمہ داری محسوس کر رہے تھے۔

## ملازمت اور پنشن۔

۱۸۵۸ء میں نبی بخش پنشن لینی چاہتے تھے لیکن چند وجوہات کی بنا پر پھر ملازمت کی خواہش کرنے لگے۔ ۱۱ر اپریل ۱۸۵۸ء کو غالب تفتہ کو لکھتے ہیں:

"منشی نبی بخش کی خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ وہ تو پنشن کی فکر میں تھے۔ ظاہراً یوں مناسب دیکھا ہو گا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالےٰ ان کی جو مراد ہو بر لائے۔"

اس کے بعد ایک خط بنام چودھری عبد الغفور سرور میں بھی ان کی پنشن کا ذکر آیا ہے۔ مرزا لکھتے ہیں:

"آپ کی اور بھائی نبی بخش کی ملاقات سے میرا دل

بہت خوش ہوا۔ یاد رہے کہ سخن فہمی اس بزرگوار کا حق ہے
اب آگرے میں بے کار او رپنشن کے امیدوار ہیں۔"

## مکاتبت میں کوتاہی۔

۱۸۵۸ء میں جب مولوی قمرالدین منشی نبی بخش حقیر اور تفتہ تینوں آگرے میں اقامت پذیر تھے تو مرزا نے سوچا کہ ان تینوں کو الگ الگ خط لکھنے سے کیا حاصل چنانچہ تفتہ کو لکھا کہ میں جو تمہیں خط لکھا کروں وہ ان دونوں کو بھی دکھا دیا کرو۔ نتیجہ کے طور پر نبی بخش نے بھی خط لکھنے کم کر دئے اور ان کی خیریت تفتہ لکھ دیا کرتے تھے۔ ایک خط بنام مرزا تفتہ مرقومہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی قمرالدین اور نبی بخش کبھی کبھی خط بھیج دیتے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں:

"وہ آمد خطوط کی موقوف صرف تم تین صاحبوں کے خط آنے کی توقع۔ اس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ ہاں ایک تم کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔"

خطوط کے اس مجموعے میں بھی آخری دور کے خطوط گنتی کے ہیں نبی بخش نے بھی تھوڑے ہی خط لکھے ہوں گے۔ ویسے اس دور کے کم از کم نو خط فراہم نہ ہو سکے ان میں ایک ۱۸۵۷ء کا، سات ۱۸۵۸ء کے اور ایک ۱۸۵۹ء کا ہونا چاہئے۔

## ابتلائے اسیری۔

مرزا غالب ۱۸۴۷ء میں دہلی میں قید ہوئے تھے۔ نبی بخش نومبر ۱۸۵۸ء میں آگرے میں قید ہوئے۔ قید کی مدت تقریباً ایک ماہ یا اس سے کم رہی۔ ان پر جو کچھ الزام تھا اس کی کیفیت تفتہ نے غالب کو لکھ بھیجی تھی لیکن اس کی تفصیلات غالب نے کسی کو نہیں لکھیں۔ نبی بخش اور مولوی قمرالدین کے قید ہونے کی خبر سنی تو غالب نے تفتہ سے ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو اس طرح استفسار کیا:

"میاں، وہ دروغ برگردن راوی نے مجھ کو بہت پریشان کیا ہے۔ واسطے خدا کے جو راوی نے روایت کی ہے وہ مجھ کو ضرور لکھو۔ اور تاج گنج کے رہنے والوں کی ابتری کی حقیقت سے بھی اطلاع دو۔ حکم عفو تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلات حرب ویکارود کر توقیع آزادی پاتے ہیں۔ یہ دو شخص کیسے مجرم تھے جو مقید ہو گئے۔"

اس کے بعد ایک اور خط مرقومہ ۲ نومبر ۱۸۵۹ء میں اس طرح ذکر آیا ہے:

"فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔ خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اظہار کو منع نہ کرتے تو بھی میرا شیوہ ایسا لغو نہیں ہے کہ میں ان کو لکھتا۔"

## سیرت۔

ان خطوط سے منشی نبی بخش کے اخلاق و عادات پر کچھ روشنی نہیں پڑتی البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ آشنا پرور اور احباب نواز تھے اور روزہ نماز کے پابند تھے۔ مرزا غالب تفتہ کو ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بارے اب کہئے۔ بھائی منشی نبی بخش حقیر صاحب اور مولوی قمر الدین خاں صاحب روزوں کے متوالے ہوش میں آئے یا نہیں؟ خدا کے واسطے ان کی خیر و عافیت لکھو اور یہ عبارت بھائی صاحب کی نظر سے گذرا نو شاید وہ مجھ کو خط لکھیں۔"

**وفات:** — یوں تو منشی نبی بخش حقیر غالب کی طرح ایک عرصہ سے

احتراق اور امراض سوداویہ میں مبتلا چلے آتے تھے لیکن ان کے مرض الموت کی نوعیت وکیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ ان خطوط میں ۱۸۵۵ء کے بعد ان کی بیماری کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ دن کے تعین کے لئے تو کوئی شہادت مل نہ سکی لیکن یقینی بات ہے کہ ان کی وفات اکتوبر ۱۸۶۰ء میں کسی تاریخ کو واقع ہوئی۔ ان کی وفات کا جو کچھ اثر غالب پر ہوا وہ تو غالب ہی کے دل کو محسوس ہوا ہوگا۔ البتہ انھوں نے مرزا تفتہ کے اصرار پر ایک قطعہ تاریخ وفات لکھ کر مولوی قمر الدین کو ارسال کیا تھا جو مولوی موصوف نے ناپسند کیا۔ ۱۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو غالب نے تفتہ کو اس کی مفصل کیفیت اس طرح لکھی ہے:

"فن تاریخ کو دون مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمہاری طرح یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہو جاتا ہے۔ بہرحال میں نے منشی نبی بخش حقیر مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ منشی قمر الدین خاں صاحب نے ناپسند کیا۔ قطعہ یہ ہے:

"شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق
داشت مذاق سخن و فہم تیز
مرگ ستم پیشہ امانش نداد
کیست کہ با مرگ بسیجد ستیز
سال وفاتش ز پے یادگار
بادل زار و مژہ دجلہ ریز
خواستم از غالب آشفتہ سر
گفت: مدہ طول بگو "رستخیز"

ایک قاعدہ یہ ہے کہ کوئی لفظ جامع اعداد نکال لیا کرتے ہیں بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے جیسا کہ یہ مصرع ؎

در سال نوسس ہر کہ ماند بیند

انوری کے قصائد کو دیکھو دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدہ کے آغاز میں لکھے ہیں جس میں اعداد سال مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ رستخیز کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر مواقع کے مناسب! اگر تاریخ ولادت یا تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھنا تو بے شبہ نامستحسن تھا۔ قصہ مختصر اگر تاریخ کی فکر موجب ادائے حقِ مودت ہے تو میں حق دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا کروں۔"

## حقیر کا کلام۔

مرزا غالب کے "مذاق سخن و فہم تیز" رکھنے والے شاگرد کا کلام بعد تلاش و جستجو بھی اتنا ہی فراہم ہو سکا جو بطور تبرک یہاں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ مختلف تذکروں میں اتنا ضرور لکھا ہے کہ حقیر اردو اور فارسی دونوں میں فکر کرتے تھے۔ لیکن نمونہ کلام میں کہیں چار پانچ اردو اشعار سے زیادہ نقل نہیں کئے گئے۔

ذیل کا ایک شعر ان خطوط کی بدولت ہاتھ آیا ؎

بڑھ گئی توقیر میری اتنا عِ دخل سے
اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مجھ کو اسکے درباں دیکھ کر

باقی ماندہ اشعار جو مختلف تذکروں سے فراہم ہو سکے انھیں یکجا کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے

کیا سبک رو ہیں رہروانِ عدم
کہ کسی کا نہ نقشِ پا دیکھا

شانے نے بل نکال دئے زلفِ یار کے
سیدھا کیا ہے موذیوں کو مار مار کے

مجھ میں اور قیس میں ہے فرق حقیر
وہ مقید ہے اور میں وارستہ

سنتے ہیں گئے مانی و بہزاد عدم کو
اب کھینچیں تو کھینچیں کمرِ یار کی تصویر

عین نورِ نظر گبر و مسلماں ہو تم
چشم بد دور بت و قدرت یزداں ہو تم

گر تو نہیں ہے عاشق پھر یہ حقیر ہر دم
کیوں نالۂ حزیں ہے کیوں آہِ آتشیں ہے

دیر میں ہی ذکر اپنا کعبہ میں بیاں اپنا

ایک ہم ہیں اور جو چاہے کہاں کہاں اپنا

---

وہ نگاہیں جن سے تھی مجھ کو تسلی کی امید
تشنۂ خوں، آفتِ دل دشمنِ جاں ہو گئیں

---

ہاتھ دوڑائے جنوں نے پھر گریباں دیکھ کر
پاؤں پھر وحشت نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

---

گر یہی چاک کی عادت ہے تو اے دستِ جنوں
پیرہن سارے گریباں ہی گریباں ہونگے
قتل تم ہنس کے کروگے تو مریں گے لاکھوں
کشتہ ہر کشتہ کے ہمراہ صد ارماں ہوں گے

---

سایۂ قصر نظر آیا یاد آیا
پھر ہمیں ظلِ ہما یاد آیا

یدِ بیضا کا جو ندکور ہوا
ان کا نقشِ کفِ پا یاد آیا

زخم کے منہ میں بھر آیا پانی
جبکہ پیکاں کا مزہ یاد آیا

پھر گریباں کے اڑینگے پرزے
پھر وہی چاک قبا یاد آیا

خط جو غیروں کو گئے اس نے قلم
ہم کو قسمت کا لکھا یاد آیا

بسکہ مصنوع ہی صانع کی صفت
بت کو دیکھا تو خدا یاد آیا

آج پھر اس بت کافر نے حقیر
وہ ادا کی کہ خدا یاد آیا

# پاکھل

مرزا غالب کی تصانیف و مکتوبات میں پاکھل کا ذکر سوائے ان خطوط کے اور کہیں نہیں ملتا۔ البتہ بہادر شاہ کے ۲۲ر دسمبر ۱۸۴۵ء کے روزنامچہ میں اس کا اس طرح ذکر آیا ہے:

"داروغۂ باغ نے پاکھل کے سنو دانے نذر گذرانے۔ پچاس دانے مرزا شاہرخ کو دئے گئے اور پچاس دانے مربہ بنانے کے لئے دواخانے میں بھیجے گئے۔"
(دہلی کا آخری سانس)

مختلف لغات میں پاکھل یا پاکھر کو گولہ کا درخت لکھا ہے۔ بظاہر گولر جیسے معمولی درخت کا شاہی باغ میں ہونا اور پھر گولر کے سو دانوں کا بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کیا جانا ایک عجیب اور مضحکہ خیز سی بات معلوم ہوتی ہے۔ گولر کے پچاس دانوں کا مرزا شاہرخ کو دئے جانے کا حکم بھی عجیب سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر گولر ایک عام فہم اور غیر ثقیل لفظ ہے۔ پاکھل کوئی فارسی لفظ بھی نہیں جسے غالب نے اپنی فارسی دوستی کی بنا پر استعمال کیا ہو۔

پاکھل کسی قسم کا پھل سہی لیکن اس کے اچار مربہ کا استعمال احتراق کے مریضوں کے لئے فائدہ مند ضرور ہوتا ہوگا۔ حیات بخش باغ میں اس کا ایک درخت تھا جو اکتوبر اور نومبر میں پھل دیتا تھا۔ ان پھلوں کا اچار مربہ ڈال لیا کرتے تھے۔ امرا کو اچار کے حاصل کرنے میں تو اتنی دقت پیش نہ آتی تھی۔ البتہ مربہ صرف خواص کا حصہ تھا۔ چنانچہ مرزا غالب نے بھی مربہ حکیم احسن اللہ خاں کی وساطت سے حاصل کیا تھا۔

منشی نبی بخش نے مرزا غالب سے پاکھل کے اچار مربہ کے لئے کم از کم تین بار فرمائشیں کیں۔ پہلی بار منشی صاحب کے پاس پاکھل کے سرکہ کا اچار پہنچا۔ دوسری بار مربہ اور تیسری بار صرف معذرت۔ مرزا غالب پہلی فرمائش پر یہ سمجھ کر کہ اچار مربہ سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ اچار لے آئے ہیں اور اس وقت تک اس خیال میں ہیں کہ جب چاہوں گا مربہ بھی لے آؤں گا۔ لکھتے ہیں:

"بندہ پرور! پاکھل کا مربہ اور اچار دونوں موجود ہیں۔ خدا حضور کو سلامت رکھے جب چاہوں مانگ لاؤں مگر بھیجوں کیونکر۔ ہاں ڈاک۔ اس کا یہ حال ہے کہ مرتبان کمال یہ ہے کہ ٹین میں رکھ کر بھیجئے الٹا سیدھا لا کلام ہوگا۔ اگر مربہ ہے تو شیرہ اور اگر اچار ہے تو سرکہ گر جائے گا۔ بہر حال اچار پاکھل کا کہ وہ بہ نسبت مربہ کے زیادہ تر سودمند ہے لے آیا ہوں اور میرے پاس رکھا ہے۔ جس طرح حکم کرو اس طرح بھیج دوں۔"

مرزا غالب نے منشی نبی بخش کی دوسری فرمائش بھی پوری کی اور حکیم احسن اللہ خاں کی وساطت سے مربہ حاصل کیا۔ ایک مرتبان میں سربہ مہر

کر کے ایک جانیوالے دوست مرزا احسن علی بیگ کے ہاں بھیجدیا۔ لکھتے ہیں:

"غرض کل رات کو پاکھل کا مربہ مرتبان میں کھو کر اس کو مومی جامہ سے بند کیا اور اس کو اپنی مہر کر کے کلّو کے ہاتھ مرزا کے پاس بھجوا دیا۔ کلّو ان کو مربہ دے کر رات کو اپنے گھر رہا۔ اب صبح ہوئی اور کلّو آیا تو اس نے بیان کیا کہ مرزا احسن علی بیگ نے بندگی کہی ہے اور کہا ہے کہ میں کل نہ جاؤں گا۔ پرسوں جاؤں گا۔ اور مرتبان کو اچھی طرح احتیاط سے لے جاؤں گا۔ حضرت کو معلوم رہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کی عنایت سے مربہ ہاتھ آگیا ہے ورنہ اکثر سائلوں کو سرکار شاہی سے اچار ملتا ہے۔ مربہ ہاتھ نہیں آتا۔ اب اختیار مرزا صاحب کا ہے۔ کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں لے جائیں۔ بندہ بری الذمہ ہے۔"

پاکھل کے اچار مربہ کی تیسری اور آخری فرمائش جنوری ۱۸۵۳ء میں ہوئی۔ مرزا اس فرمائش کو پورا کرنے کے لئے بھی آمادہ نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"حکیم نسیم اللہ صاحب کی روانگی میں پانچ چھ روز اور ہیں۔ اگر بات آگیا تو پاکھل کا مربہ اچار جو کچھ ہو گا ان کے ہاتھ بھیجدوں گا۔"

لیکن اس سال پاکھل کے درخت میں پھل نہ آیا اور اس وجہ سے اچار مربہ نہ ڈل سکا۔ مرزا معذرت خواہ ہیں:

"مدعا یہ کہ پاکھل کے مربہ کا پیام ان کی تحویل ہو۔ وہ آپ سے کہدیں۔ ہر چند وہ کہا ہے جو کہنا چاہئے مگر مجھ پر سے

احتمال قصور جاتا رہتا ہے اور وہ پیام یہ ہے کہ پاکھل کا
حیات بخش باغ میں کل ایک درخت ہے اور وہ اکتوبر
نومبر میں بار لاتا ہے۔ اس کے اثمار کا اچار مربہ بنا لیتے
ہیں۔ اب کے سال وہ درخت کم بخت بارور نہ ہوا۔ اس
راہ سے مربہ ہاتھ نہ آیا۔"

اس کے بعد پاکھل کی کسی فرمائش کا ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ منشی نبی بخش
احتراق میں بدستور مبتلا رہے۔ ممکن ہے انھیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہو اور یہ سمجھا
ہو کہ مرزا نے اس کے حصول کے لئے کوئی کوشش ہی نہ کی بلکہ ایک بات
بنا دی ہے۔

# غالب کی طبّی دستگاہ

مرزا غالب کا جس دور سے تعلق تھا اس دور میں ہر پڑھے لکھے آدمی سے توقع کی جاتی تھی کہ اسے ہئیت، فلسفہ، اور تصوف، فن شعر و سخن، طب اور دیگر علوم سے تھوڑا بہت لگاؤ یا واقفیت ضرور ہو۔ مرزا غالب نے بھی اس دور کے رواج کے مطابق علم طب کا مطالعہ کیا ہو گا لیکن اسے حسن اتفاق سمجھئے کہ انکے حلقۂ احباب میں شاہی اطباء بھی شامل تھے۔ مرزا صاحب خود دائم المرض تھے اس لئے مختلف امراض اور ان کے علاج معالجہ کی تدابیر و ادویہ پر گفتگو ہوتی رہتی ہو گی۔ اس طرح ایک تو مرزا صاحب کو ان نامی گرامی اطبا کی صحبت سے فیض پہنچتا رہا اور دوسرے طب پر بعض اہم کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملتا رہا۔ ڈاکٹر سید قاسم صاحب (پتھرگھٹی، حیدرآباد) کے کتب خانے کی ایک کتاب "ذخیرہ دولت شاہی" پر مرزا غالب کی مہر ثبت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم طب کی یہ کتاب ان کے زیر مطالعہ رہی۔ نیز تفتہ کو ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتے ہوئے "طب محمد حسین خانی" کا حوالہ دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کا بھی مرزا نے بامعان نظر مطالعہ کیا تھا۔

علم طب پر اسی قسم کی مختلف معیاری کتابیں مرزا کے زیرِ مطالعہ رہی ہوں گی۔
مرزا کی تصنیفات میں علم طب سے آگاہی کی سب سے پہلی شہادت مرزا ابو القاسم خاں کا پانچ اشعار کا ایک قطعہ ہے۔ مرزا غالب نے ابو القاسم خاں کو مسہل لینے کا مشورہ دیا جس سے انھیں بہت فائدہ ہوا اور شکریہ کے طور پر یہ مختصر قطعہ لکھ کر مرزا صاحب کو بھیجا ؎

اے مسیحِ زماں تو مے دانی
بجنابت ارادتے کہ مراست

بو علی کی رسد بہ تشخیصت
کی فلاطوں مثالِ تو داناست

مے سزد، گر بگویمت لقراط
ور فلاطوں بخوانمت زیباست

مسہلے دادی و لیفر مودی
لعبل آرہگیاں کہ شفاست

زاں عمل دور شد مرض بالکل
گر بگویم تو ئی مسیح بجاست

اس قطعہ کے جواب میں مرزا نے دو قطعہ لکھے۔ دوسرے قطعہ میں لکھتے ہیں:

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

بو علی و مسیح و افلاطوں
ہر چہ گفتی بگو کہ از تو سزاست

بے ادب باشم ار کنم تکذیب
بی خرد باشم ار شمام راست

نسبت من بہ بو علی سینا
صاف ہمچوں سرابِ با دریاست
بو علیؔ گفتنم روا باشد
خرمیں در کوہ، بو علیؔ سیناست

.........----------.........

ایک بار نواب کلب علی خاں مرحوم فرمانروائے رامپور نے مرزا غالب کو اپنی ناسازیٔ طبیعت کا حال لکھا ۔ انھوں نے عوارض کی تفصیل کے مدنظر اپنی تشخیص کے مطابق نسخہ تجویز کیا ۔ لکھتے ہیں:

"میں طبیب نہیں مگر تجربہ کار ہوں ۔ خدا جانے اور طبیب کیا سمجھتے ہوں گے کہ کیا تھا ۔ میرے نزدیک بہ اشتراک معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا ۔ اب آپ کو حفظ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیل دریائی اور جدوار کا استعمال ضروری ہے اور معجون طلائی عنبری تقویت قلب میں مجوزہ حکیم ببر علیؔ مغفور ہے ۔ ورق طلا عنبر اشہب عرق کیوڑہ، قند، کثرت اجزا اس ترکیب خاص میں ناپسند ۔ کثیر الاجزا اور معجونیں ہیں ۔ مفرح بو علیؔ سینا خمیرہ مروارید، خمیرہ گاؤزباں عنبری، ماء اللحم غیر منشی، ادویہ مفرح و مقوی حرارت و برودت میں معتدل ڈالی جائیں ا گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پی لیا کیجئے ۔ غذائے گوشت و طیور اکثر، بیضۂ نیم برشت اکثر ۔ لیکن یہ خیال رہے کہ بیضۂ مرغ و طیور ایک جلسے میں تناول نہ فرمائیے

بکری کے گوشت کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب
پودینہ کا عرق چھوٹی الائچی کا عرق، ہمیشہ دواخانے میں موجود
رہے عطریات کے استعمال میں مبالغہ ... شوربائے
پارچۂ گوسفند مائدہ خاص پر موجود رہے۔"

منشی ہرگوپال تفتہ نے مرزا غالب کو نبی بخش حقیر کی بیماری کا حال لکھا اور یہ بھی تحریر کیا کہ ماء الجبن سے بھی آرام نہیں ہوا۔ مرزا کا ذہن فوراً "طب محمد حسین خانی" کی طرف منتقل ہوا اور اس کے حوالہ سے یہ نسخہ لکھ بھیجا:

"ایک نسخہ "طب محمد حسین خانی"، میں لکھا ہے اور
وہ بہت بے ضرر اور بہت سودمند ہے مگر اثر اس کا
دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر
پانی لیویں اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر
ملادیں اور اس کو جوش کریں اس قدر کہ چہارم پانی جل
جاوے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں
اور جب باسی ہو جائے اس کو پئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں۔
کھایا کریں۔ پانی دن رات جب پیاس لگے، یہی پئیں۔ تبرید کی
حاجت پڑے اسی پانی میں پئیں۔ روز جوش کرواکر چھنوا کر رکھ
چھوڑیں۔ بیس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا سلام
کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا۔ آگے ان کو اختیار ہے۔"

نبی بخش نے لکھا کہ میں بدایوں کے ایک حکیم کی دوا کر رہا ہوں اسلئے ابھی آپ کی دوا شروع نہیں کر سکتا۔ اس پر مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"آپ غور تو کیجئے، میں نے تو دوا نہیں بتلائی۔ ایک

ترکیب پانی کے مدبر کرنے کی عرض کی ہے۔ صاحبان امراض سوداویہ مزمنہ کو اس پانی کا پینا نفع کرتا ہے۔ اور نفع اس کا برسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور اس پانی کے استعمال کے زمانہ میں دوا کی ممانعت نہیں۔ جو دوا چاہیئے کھائیے اور جو غذا چاہیئے تناول فرمائیے۔ صرف یہ پانی کب دوا ہو سکتا ہے۔ آپ شوق سے اس پانی کو شروع کیجئے اور دوا طبیب کی بدستور کئے جائیے اور غذا موافق طبیب کے کھائے جائیے۔ پانی جب پیجئے تب ہی پانی پیجئے۔ جہاں جائیے آدمی کو حکم کیجئے کہ ایک صراحی اس پانی کی ساتھ لے لیوے اور یہ بھی آپ کے خیال میں رہے کہ اگر ناگاہ کوئی ضرورت لاحق ہوا اور یہ پانی موجود نہ ہوا اور آپ اور پانی بحسب ضرورت پی لیویں تو بھی محل اندیشہ نہیں ہے۔"

ایک بار منشی نبی بخش کے چھوٹے بیٹے کو دست آنے لگے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو اس کے لئے دوا تجویز کی اور لکھا:

"اپنے پیارے بھتیجے کو پیار کرتا ہوں اور اس کی تندرستی کی دعا مانگتا ہوں۔ سنا میں نے کہ پھر اسے دست آنے لگے۔ صاحب اندیشہ نہ کرو۔ جوں جوں یہ بڑھتا جائیگا اور حرارت اس کے مزاج میں آتی جائے گی۔ووں ووں یہ حالت رفع ہوتی جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اصل خبری جوارش عود و جوارش مصطگی بنوا رکھو۔ نہ ہر روز بلکہ گاہ گاہ اس کو چٹا دیا کرو اور خورشہائے ناگوار مت دیا کرو۔"

ذکیہ بیگم اور منشی عبداللطیف کی ناسازئی طبیعت کا حال سنا تو اسے گرمی کا باعث جان کر تحریر فرمایا:

"حال منشی عبداللطیف اور ذکیہ کا معلوم ہوا۔ گرمی کا موسم ہے۔ میں جانتا ہوں ان دونوں کو زہر مہرہ کا استعمال مفید ہوگا کبھی کبھی شربت نیلوفر میں گھس کر پلا دیا کریں اور چاٹ لیا کریں۔ بھائی لڑکوں کا گھر ہے شربت نیلوفر۔ شربت بنفشہ، عرق نعناع کی سکنجبین، عرق کاسنی، عرق بادیان، اس طرح کی چیزیں گھر میں تیار رکھو۔ گاہ گاہ استعمال میں آتی رہیں۔"

ایک جگہ خود منشی بخش کو ایک عرق پچاس دن متواتر پینے کی تاکید کرتے ہیں:

"واسطے خدا کے۔ اب کول آ گئے ہو۔ وہ عرق شروع کرو جس طرح عرض کیا گیا ہے۔ کبھی شربت نیلوفر کے ساتھ اور کبھی شربت مرکب کے ساتھ۔ بندۂ خدا ایک پچاس دن میرا کہا مانو اور اس عرق کو پیو۔ جب تمام ہونے کو آئے نسخہ تمہارے پاس ہے پھر کھچواؤ اور دس دن کم دو مہینے اسکا استعمال کرو۔ ضرور۔ ضرور۔ فقط۔"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ عرق غالب کا آزمودہ تھا۔ اسی کے متعلق لکھتے ہیں:

"حضرت عرق پئے جائیے۔ اور گھبرائیے نہیں۔ دیکھنا کیا فائدہ کرتا ہے۔ مجھ کو تو مفید پڑا الیقین ہے کہ تم کو بھی نفع کرے گا۔"

منشی نبی بخش نے ایک بار لکھا کہ میں نیم کی پتیاں پی رہا ہوں۔ مرزا صاحب نے نیم کی مستی تجویز کی اور اس کی ترکیب استعمال اور مناسب غذا بھی بتائی۔ لکھتے ہیں:

"نیم کی پتیاں تم پیتے ہو، خوب کرتے ہو۔ یہ کہ اس کو کھا کر ایک بیسن کی ٹکیا گھی ڈال کر کھاتے ہو۔ یہ ترکیب عامیانہ ہے۔ ہاں یہ مسلّم کہ چنے کی روٹی ان امراض میں اگر غذا منحصر اسی پر کی جائے اور مدت تک یہ طریق نبھ جائے تو بہت نافع ہے۔ میں ایک بات تمہیں اور بتاتا ہوں۔ تم نیم کی مستی پیا کرو۔ یعنی بعض نیم رستا ہے اور اس میں سے ایک رطوبت نکل کر جم جاتی ہے۔ اسے نیم کی مستی کہتے ہیں۔ سبیل اس کی یہی ہے کہ دو پیسے بھر سے شروع کرو اور پانچ ماشہ بڑھاتے جاؤ جب پانچ تولہ پر آجاؤ تو تھم جاؤ۔ بھلا زیادہ نہیں تو بیس دن تو پانچ پانچ پیسہ بھر ہو۔ پرہیز بدستور۔ بیشتر چنے کی روٹی کھایا کرو۔ دوا پی کر ٹکیاں کھانی زائد ہے۔ چنے کی روٹی کے ساتھ وقت غذا کے گھی بقدر برداشت کھاؤ۔ گھیا۔ توری۔ خرفے کا ساگ، بتھوے کا ساگ۔ کھیرا۔ ککڑی جس کا قلیہ مرغوب ہو کھاؤ۔ دیکھو تو یہ ترکیب موافق آتی ہے یا نہیں۔"

ایک بار منشی نبی بخش نے اپنے بیٹے عبداللطیف کے ضعف دل و دماغ کا حال لکھا۔ مرزا صاحب نے فوراً نسخہ تجویز کیا۔ لکھتے ہیں:

"منشی عبداللطیف کا ضعف دل و دماغ گویا خلقی ہے۔ اس کی فکر زیادہ نہ کرو۔ نوشدارو، خمیرہ گاؤزبان، خمیرہ آبریشم، دواء المسک، اس طرح کے مرکبات کا استعمال

چلاجائے۔ نہ علی الدوام بلکہ گاہ گاہ۔"

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"منشی عبداللطیف کا حال معلوم ہوا۔ خدا پر نظر رکھو اور تقویت کی رعایت کئے جاؤ۔ لکھ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں کہ جدوار بہت مفید ہوگی۔ اگر وہاں اچھی نہ ملے تو مجھ کو لکھ بھیجو۔ میں یہاں سے بھیجدوں۔"

ان شہادتوں سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مرزا غالب نے نہ صرف طب کی بہت سی کتابیں پڑھی تھیں بلکہ انھیں بہت سے نسخے بھی زبانی یاد تھے اور ان کی ترکیب استعمال، پرہیز اور غذا کی مناسبت کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مریض کو دیکھے بغیر عوارض کی تفصیلات پڑھ کر مرض کی تشخیص کر سکتے تھے۔ اور مناسب نسخہ تجویز کر سکتے تھے۔ یہ سب باتیں ایک طبیب حاذق ہی کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مرزا غالب نے اسے پیشہ نہ بنایا اور طبابت نہ کی۔

# تاریخ پرتوستان

مرزا غالب کی مالی امداد کرنے کی غرض سے پیر نصیر الدین عرف کالی صاحب اور احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں نے بہادر شاہ کی توجہ تاریخ خاندان تیموریہ لکھوانے کی طرف مبذول کرائی جسے بہادر شاہ نے منظور کیا اور مرزا غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب اور چھ پارچہ کا خلعت معہ تین رقم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ وحمائل مروارید دربار عام میں عطا کیا اور تین سو روپے ششماہہ کے مشاہرہ پر یہ خدمت سپرد کی۔ کتاب کا نام پرتوستان رکھا گیا جسے مرزا نے دو حصوں میں منقسم کیا۔ پہلے کا نام مہر نیم روز اور دوسرے کا نام ماہ نیم ماہ رکھا۔ پہلے حصہ میں مختصر حالات ابتدائے آفرینش سے امیر تیمور تک اور کسی قدر مفصل حالات امیر تیمور سے ہمایوں کے انتقال تک بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ یا تو لکھا ہی نہیں گیا اور اگر کچھ لکھا بھی گیا تو اس کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔

خواجہ حالی مہر نیم روز اور ماہ نیم ماہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مہر نیم روز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے

کے لئے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ بعد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہو گیا اور اس حصہ کا صرف نام ہی رہ گیا۔"

خواجہ حالی کے اسی بیان کے مطابق مرزا ۱۸۵۷ء تک مہر نیمروز لکھتے رہے حالانکہ یہ کتاب ۱۸۵۴ء میں فخر المطابع سے شائع ہو چکی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر، امتیاز علی عرشی، شیخ محمد اکرام، مالک رام اور دیگر ماہرین غالبیات متفق ہیں کہ "مہر نیمروز" مارچ ۱۸۵۲ء سے قبل مکمل ہو چکی تھی اور اسکی دلیل میں مرزا کا ایک خط بنام مولوی رجب علی جو مارچ ۱۸۵۲ء کا مرقومہ ہے پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں لکھا ہے:

"ذرہ پرور، مہر گسترا آں سواد جزوے چند بیش نیست سلبعد حمد و نعت و منقبت و مدح والی عصر و سبب تالیف کتاب کہ آئین نامہ طرازان ہنگامہ آراست از کشورکشایان تا نصیر الدین سلطان ہمایوں سخن راندہ ایم - باقی داستان فرداست۔"

مروجہ مہر نیمروز میں ابتدائے آفرینش سے ہمایوں تک کے حالات درج ہیں۔ "کشورکشایان" سے مراد جس کا اوپر حوالے میں ذکر ہے سوائے امیر تیمور یا بابر کے اور کون ہو سکتا ہے۔ "سبب تالیف" میں مرزا لکھتے ہیں:

"فرماں نیز چناں بود کہ سر آغاز ایں خرد افزا نامہ از شہریارِ رستم سر ہنگ خاتم وظیفہ خوار دارا دربان سکندر پیش گاہ نہ سپہر نظر کردہ از ہفت اختر دشش سوئے فرمانروائے ہفت کشور صاحبقرانِ روشنگر امیر تیمور نامجوئے نام آور کہ در زندگی کیوان ایوان و انجم انجمن بود و پس از ہشتن تن کوثر آبشخور و مینو نشیمن است بداں آئین سخن رود کہ شاہنامہ

فردوسی کہ قلمش اژدر از دستی پور دستاں داستانسرا است.
تقویم پارینہ و شرفنامۂ نظامی کہ صریر کلکش قافلہ خضر و سکندر را بانگ دراست کاغذِ توتیا شود۔ ناگاہ پیش ازاں کہ فرخ سرگزشتہائے ہمایوں نیاگان گیتی خداوند فراہم آدم فرماں رفت کہ از آغازِ آفرینش سخن راند۔"

ظاہر ہے کہ اوّل اوّل "مہر نیمروز" میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کے حالات درج کرنا طے پایا تھا۔ لیکن جب مرزا ہمایوں کا حال شروع کرنے والے تھے تو حکم پہنچا کہ آغاز ابتدائے آفرینش سے ہونا چاہیئے۔ اس لئے یہ تحقیق کر لینے کے بعد کہ تیمور سے ہمایوں تک کا حال مارچ ۱۸۵۲ء تک لکھا جا چکا تھا یہ سمجھ لینا کہ مہر نیمروز اسی تاریخ تک تکمیل کو پہنچ چکی تھی کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔

شیخ محمد اکرام "مہر نیمروز" پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے آثار غالب میں تحریر فرماتے ہیں:

"مہر نیمروز" یعنی شاہان تیموری کی تاریخ کا پہلا حصہ مارچ ۱۸۵۲ء سے کچھ پہلے مکمل ہو گیا اور ۱۸۵۵ء میں بادشاہ کے ایما سے مطبع فخر المطابع میں چھپ کر شائع ہوا۔ لیکن دوسرا حصہ لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی وجہ معلوم نہیں کیونکہ بادشاہی سلسلہ پہلے حصے کی تکمیل کے پانچ چھ سال بعد تک قائم رہا لیکن ممکن ہے کہ بہادر شاہ جو سادہ اور موثر طرز تحریر پسند کرتا تھا اسے مرزا کی ٹیڑھی ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انبار میں اصل مطلب خبط کر دینا ناپسند ہوا ہو

اور اس نے اس کتاب کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو۔ یہ صحیح ہے
کہ مرزا کی فارسی نثر غلط ہند و ستانی محاوروں سے پاک ہے
لیکن جہاں تک معنی کا تعلق ہے۔ اس پر ان کی بتائی ہوئی پیانہ
کی مثال صادق آتی ہے کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں مغز کا نام نہیں۔
اور یہی وجہ ہے ا۔ باوجودیکہ مہر نیمروز جو مغلیہ بادشاہوں کی
تاریخ ہے اور جس کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے کہ اسے آخری
مغلیہ بادشاہ کے زیر فرمان درباری مورخ نے لکھا۔ بہت
ہونی چاہیے۔ کچھ بھی نہیں۔"

اکرام صاحب کے اس نظریہ سے مجھے اختلاف ہے "مہر نیمروز" کی تصنیف میں کسی مزید تحقیق سے کام نہیں لیا گیا بلکہ یہ طے پایا تھا کہ تاریخ وکتب سیر سے التقاط حالات کیا جائے اور مرزا اسے اپنی خاص روش کی فارسی کا جامہ پہنا دیں۔ اس لئے ایک ایسی تاریخ جو دوسری تواریخ کے خلاصہ حالات پر مشتمل ہو نہ مستند و گرانمایہ ہو سکتی ہے نہ تاریخی اعتبار سے اہم۔ اور یہ بہادر شاہ کا منشا بھی نہ تھا حکیم احسن اللہ خاں نے یہ ایک ایسی سبیل نکالی تھی جس کی کاٹ شیخ ذوق اور ان کے حلقہ احباب کے بس کی بات نہ تھی۔ مزید برآں مرزا غالب سبب تالیف کتاب میں لکھتے ہیں:

"کہ بداں آئین سخن رود کہ شاہنامۂ فردوسی کہ
قلمش از درازدستی پور دستاں داستاں سراست تقویم
پارینہ وشرف نامۂ نظامی کہ صریر کلکش قافلہ خضر و سکندر
را بانگ دراست، کاغذ تو تیا شود۔"

ظاہر ہے کہ مصنف کے پیش نظر کتاب کی تاریخی اہمیت نہیں بلکہ عبارت

آرائی تھی۔ ان کا مقصد گذرے ہوئے نامور فارسی انشا پردازوں سے بازی لے جانا تھا۔ اور یہی کوشش تھی کہ اپنی نثر میں شاعرانہ خیالات کے نظم ونسق، شوخی اور بانکپن کی اچھوتی لذت کو ایسے عجیب وغریب انداز سے پیش کریں جس کے آگے متاخرین کی کاوشیں ماند پڑ جائیں۔ اس مقصد میں مرزا کو پوری کامیابی ہوئی۔ مولانا حالی نے جہاں مرزا کی نثر کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں وہاں حزیں، ابوالفضل اور ظہوری سے انکا موازنہ بھی کیا ہے۔ یہاں بھی اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"سبب تالیف کتاب" کے آخری حصے میں مرزا غالب اپنی طرز بیان ہی کی داد کے خواہاں نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اگر میں کسر نفسی کی تمام رسوم کے برخلاف اپنی طرز بیان کی داد لوگوں سے چاہوں تو اسے ایک امر بے جا نہیں بلکہ تنقید و تمیز کی بات سمجھنی چاہیے۔

مرزا کوئی مورخ نہ تھے جس کا انھوں نے خود اس طرح اظہار کیا:

"میں فن تاریخ ومساحت وسیاق سے آشنا بیگانہ ہوں کہ ان فنوں کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازانِ دفتر شاہی خلاصۂ حالات ازروئے کتب اردو میں لکھکر میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ میں اس کو فارسی میں کرکر حوالہ کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں۔ میں اسی قدر ہوں کہ نظم ونثر کو لقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں۔

ما قصۂ سکندر ودارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

بہادر شاہ کو اس تصنیف کی تاریخی حیثیت برقرار رکھنی منظور ہوتی تو اس زمانے میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرِ رخشاں جیسا تاریخ کا ماہر موجود تھا۔

ان کی خدمات سے ضرور فائدہ اٹھایا جاتا یا کم از کم ان کا مشورہ مرزا کے لئے لازمی قرار دے دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

مرزا کی طرز نگارش، مشکل پسندی اور بہادر شاہ کی پسند یا ناپسند کے ضمن میں بس اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ جب جولائی ۱۸۵۰ء میں تاریخ نگاری کی خدمت سپرد کی گئی تو غالب کا پایہ نظم و نثر فارسی میں بہت بلند ہو چکا تھا۔ ان کی شہرت ایران تک پہنچ چکی تھی اور ان کا انداز تحریر کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھا۔ بہادر شاہ نے تو شاید مہر نیمروز کا ایک صفحہ بھی نہ پڑھا ہو کیونکہ انھیں فارسی انشا سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔

مہر نیمروز کے "سبب تالیف کتاب" سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ امیر تیمور سے ہمایوں تک کے حالات پہلے لکھے گئے اور ابتدائے آفرینش سے لے کر امیر تیمور تک کے واقعات اس کے بعد مرتب کئے گئے۔ ان خطوط سے اس کی پوری تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں۔ مرزا جو کچھ لکھتے تھے اس کی ایک نقل منشی نبی بخش کو بھجوایا کرتے تھے۔

مرزا جولائی ۱۸۵۰ء میں بادشاہ کے ملازم ہوئے۔ یکم جنوری ۱۸۵۱ء تک امیر تیمور سے لے کر بابر بادشاہ تک کے حالات لکھ چکے تھے اور بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے مسودہ صاف کرا رہے تھے۔ ۲ر جنوری ۱۸۵۱ء کو منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

> "ہاں صاحب! اب بابر بادشاہ کا حال تمام لکھ چکا ہوں۔ اب مجھ کو یہ لکھ بھیجئے کہ وہ جو میں نے آپ کو بھیجا ہے وہ کہاں تک ہے۔ خاتمہ کا فقرہ یا شعر، جو کچھ ہو، وہ لکھ کر بھیج دو تاکہ میں وہاں سے لکھ کر تم کو بھیج دوں۔ اب چھ مہینے پورے

ہو چکے۔ جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک۔ اب میں دیکھوں یہ ششماہہ
مجھے کیوں ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آئندہ ماہ بماہ
کردیں گے تو تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا اسلام ہے
ابھی بابر کا حال حضور میں بھی نہیں بھیجا۔ کل مسودہ تمام ہوا۔ صاف
ہو رہا ہے۔ اب صاف کر کر دے دونگا اور ماہ بماہ کی استدعا
کرونگا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی۔ اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے
اس کو تمام کیا۔ اس سبب سے فرصت تم کو لکھنے کی نہ ہوئی۔"

مارچ ۱۸۵۱ء میں ہمایوں کا حال بھی لکھا جا چکا تھا یعنی جولائی ۱۸۵۰ء سے مارچ ۱۸۵۱ء تک مرزا غالب امیر تیمور سے ہمایوں تک کے حالات لکھ چکے تھے اور یہی تاریخ پرتوستان کا پہلا حصہ تھا جس کا نام مہر نیمروز رکھا گیا تھا۔ ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء کو مرزا لکھتے ہیں:

"میں حضرت ہمایوں کا حال تمام لکھ چکا ہوں۔ اب
از سر نو کسی کاتب سے لکھوا کر تم کو بھیجوں گا۔ خاطر جمع رکھنا۔
امیر تیمور، چار پشتیں بعد ان کے، بابر تک ایسی گزریں کہ
جس میں کشور کشائی و لشکر کشی نہیں ہوئی۔ بابر۔ ہمایوں،
یہ تین بادشاہ اولوالعزم کا حال بسبیل اجمال لکھ چکا ہوں۔
اب حضرت اکبر شاہ کا حال شروع کرونگا۔ نوروز کا ہنگامہ تھا اور قصیدہ کی فکر تھی اس
واسطے ابھی نثر کیطرف توجہ نہیں ہوئی۔ اور ابھی دو چار دن دم لے لوں تو اب پھر
سرگرم کار ہو کر اکبر شاہ کا حال لکھنا شروع کرونگا۔ تمہارے واسطے کاتب
خوشنویس صحیح نویس سے لکھواتا ہوں۔ گھبرانا نہیں۔" یہاں تک پہنچنے کے بعد تحریر تاریخ
مرزا کی بیماری، قصائد کی فکر اور مختلف وجوہات کی بنا پر تقریباً ایک سال تک
ملتوی رہی۔ جولائی ۱۸۵۱ء کو مرزا لکھتے ہیں:

"ان دنوں بہ سبب عید کے قصیدے کی فکر کے
مجھ کو فرصت تحریر نہیں ملی۔"

پھر ۴ر اگست ۱۸۵۱ء کو التوائے تحریر تاریخ کے متعلق منشی نبی بخش کو اس طرح لکھا ہے:

"تقریب عید قریب آگئی تھی۔ قصیدے کی فکر میں
سرگراں تھا۔ بارے عید ہو چکی۔ قصیدہ پڑھ چکا.....
تحریر تاریخ اسی سبب سے ملتوی رہی۔ اب اس کی طرف
متوجہ ہوں گا۔"

اس کے بعد ۶ر ستمبر ۱۸۵۱ء کو ایک استفسار کا اس طرح جواب دیتے ہیں:

"تاریخ کا حال کیا پوچھتے ہو۔ صرف ہمایوں کا
حال لکھ چکا ہوں۔ اکبر بادشاہ کا احوال شروع بھی نہیں
ہوا۔ بھائی مجھ سے یہ دردسر ہو نہیں سکتا۔ بس یہ اتنا
ہی رہا۔"

مارچ ۱۸۵۱ء میں مرزا غالب نے جب ہمایوں کا حال ختم کیا تو حکیم احسن اللہ خاں سے کہا کہ مجھ سے انتخاب حالات ممکن نہیں۔ آپ اردو مسودہ تیار کرا کے مجھے بھیجا کیجیے اور میں اسے فارسی کا جامہ پہنا دیا کروں گا۔ حکیم صاحب نے اسے منظور کر لیا۔ اور اس کے بجائے کہ اکبر کے حالات کا مسودہ تیار کرا کر بھیجتے۔ انھوں نے حضرت آدم سے لے کر چنگیز خاں تک کے حالات بھیجے۔ اور یہ بھی تقریباً سوا سال گذر جانے کے بعد یعنی جون ۱۸۵۲ء میں۔ مرزا نے بہت جلد اسے فارسی کا جامہ پہنا کر معہ دیباچہ واپس کر دیا۔ یہ سب کیفیت مرزا نے

ایک خط مرقومہ ۱۰ اپریل ۱۸۵۳ء میں منشی نبی بخش کے ایک تقاضے کا جواب دیتے ہوئے اس طرح بیان کی ہے:

"کیسی تاریخ اور کیسی نقل۔ کیا فرماتے ہو پہلے مجھ سے حقیقت تو پوچھ لیا کرو۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جو نظم و نثر تمہاری نظر سے نہ گذرے وہ ضائع ہے ؎

وائے بر جان سخن گر بہ سخنداں نرسد

اب سنئے ماجرا کیا ہے۔ جب ہمایوں کے حال تک پہنچا تو میں نے از راہ حیلہ بلکہ بسبیل اظہار حقیقت واقعی حکیم صاحب کارفرما سے کہا کہ مجھ سے انتخاب حالات ممکن نہیں آپ مدعا کتب سیر سے نکال کر زبان اردو میں ایک مسودہ اسکا لکھوا کر میرے پاس بھیج دیا کیجئے۔ میں اس کو فارسی کر کر تم کو دے دیا کروں گا۔ انھوں نے اس کو قبول کر کر ابتدائے آفرینش عالم و ظہور آدم سے میرے پاس مسودہ اردو بھیجا تو گویا اب ایک اور کتاب لکھنی پڑی۔ میں نے اس کا چھوٹا سا دیباچہ لکھ کر ایک اور ہی انداز کی عبارت میں لکھنے شروع کیا۔ آدم سے لے کر چنگیز خاں تک انھوں نے میرے پاس مسودہ بھیجا۔ میں نے اپنے طور پر لکھا اور مسودہ حوالے کیا۔ رمضان کے مہینے سے کہ آج اس کو دس مہینے ہوئے وہ مسودہ آنا موقوف ہوگیا۔ بہ ہمہ جہت چار جزو ہونگے دوچار بار میں نے ان سے تقاضا کیا۔ یہی جواب سنا کہ اب رمضان ہے۔ پھر کہا عید کا ہنگامہ ہے میں نے سوچا

کہ مجھ کو کیا۔ میں کیوں طالب شفقت ہوں۔ تقاضا موقوف کیا
وہ چار جزو میرے لکھے ہوئے حکیم صاحب کے پاس ہوں گے۔
اب کہاں ان سے مانگوں اور کیوں مانگوں۔ جانے دو۔ دور
کرو۔ جو بنا اٹھی ہی نہیں۔ اس سے غرض کیا۔"

ایک خط جو ۱۹ نومبر ۱۸۵۲ء کا لکھا ہوا ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کارپردازان دفتر شاہی نے اردو مسودہ کا تیار کرنا اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ حکیم صاحب نے چنگیز خاں سے لے کر امیر تیمور تک کے حالات کا اردو مسودہ تیار کرانے میں تقریباً دو سال لئے۔ آخر مہر نیم روز اگست ۱۸۵۴ء میں تکمیل کو پہنچ گئی۔ ۳ ستمبر ۱۸۵۴ء بروز یکشنبہ کو بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوئی۔ مرزا کی جو توقعات تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء کو لکھتے ہیں:

"میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلد اس تاریخ کا تمام کر کر وہ نذر کیا۔ اس کا حال سنئے کہ وہ صورت جو پہلے تھی وہ نہیں رہی۔ آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا۔ اب شروع تحریر آفرینش عالم و ظہور آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام پرتوستان رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک۔ اس کا نام مہر نیم روز رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والی عصر تک اس کا نام ماہ نیم ماہ۔ سودہ مہر نیم روز تمام ہوا اور نذر حضور کیا۔ اب اگر زیست وفا کرے گی تو ماہ نیم ماہ لکھا جائیگا۔ توقیع خوشنودی مجھ کو مل گیا یعنی شقہ مشتمل تحسین و اظہار عنایت پر

اسی کو خلعتِ فاخرہ اور جاگیر تصور کرتا ہوں۔ مجھ میں کہیں جانے کا دم نہیں۔ اگر بادشاہ کا توسل نہ ہوتا تو بھی یہیں پڑا رہتا۔ بس میں اس کو غنیمت جانتا ہوں نمبیہ اقدر دان کون کہ میں اس پہ ناز کروں۔ بقول ڈوم کے "جو سمجھے وہ ہمارا غلام جو نہ سمجھے ہم اس کے غلام" ؎

زندگی بر گردنم افتاد بیدل چارہ نیست

چار باید زیستن ناچار باید زیستن"

اس مہر نیمروز کے نسخہ کی تقطیع اور مسطر کیا تھا اسے کس کاتب نے لکھا تھا اور اس کے کتنے صفحات تھے۔ اس کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ جو نسخہ منشی نبی بخش کو بھیجا گیا تھا وہ چھوٹی تقطیع کے بارہ جزو پر مشتمل تھا۔ دست مزد کاتب اور کاغذ پر چار روپے صرفہ آیا تھا۔ مسطر کے باب میں مرزا کے بیان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ گیارہ سطروں کا اور ایک جگہ پندرہ سطروں کا مسطر لکھا ہے۔ حاشیوں پر مرزا نے اپنے ہاتھ سے لغات کے معنی لکھے تھے۔ آخر مئی یا جون ۱۸۵۲ء میں بذریعہ پارسل بھیجا گیا ——

مختصراً مہر نیمروز کی تحریر و ترتیب اس طرح عمل میں آئی:

(۱) جولائی ۱۸۵۰ء سے جنوری ۱۸۵۱ء تک امیر تیمور سے بابر تک کا حال مکمل ہو چکا تھا۔

(۲) ۲۸ر مارچ ۱۸۵۱ء تک بابر بادشاہ سے ہمایوں تک کا حال لکھا جا چکا تھا۔

(۳) جون ۱۸۵۲ء تک حضرت آدم سے چنگیز خاں تک کے حالات مرتب ہو چکے تھے۔

(۴) اگست ۱۸۵۴ء تک چنگیز خاں سے امیر تیمور تک کے حالات مکمل کر دے۔

## ماہ نیم ماہ۔

مہر نیمروز ۱۸۵۴ء میں مکمل ہو کر شائع ہو چکی تھی۔ مغلیہ سلطنت اس کے ڈھائی تین سال بعد تک قائم رہی۔ اگر ماہ نیم ماہ اس عرصے میں نہ لکھی گئی تو اس کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں۔

قلعہ معلیٰ سے مرزا کے باضابطہ مراسم پیدا ہو چکے تھے۔ وہ استاد شاہ بن چکے تھے۔ انھیں اب بادشاہ کے ساتھ خواجہ صاحب کی درگاہ بھی جانا ہوتا تھا۔ دربار میں بھی حاضری دینی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ انھیں کئی بار بادشاہ کی ترجمانی کرنی پڑی۔ مرزا کی ان مصروفیات کے پیش نظر حکیم احسن اللہ خاں نے ماہ نیم ماہ کا اردو مسودہ تیار نہ کرایا ہوگا۔ لیکن اس کی تحریر کے باب میں بھی ایک دلچسپ پہلو نکل آیا ہے جو اب تک محققین غالب کی نظر سے بچا رہا تھا۔

مہر نیمروز کے دیباچہ میں چونکہ مرزا نے ماہ نیم ماہ کا ذکر کیا تھا۔ اس لئے اکثر احباب ماہ نیم ماہ کا تقاضا کرتے تھے۔ ایک بار چودھری عبدالغفور سرور نے ماہ نیم ماہ کی فرمائش کی۔ مرزا نے جواباً لکھا:

> "اکثر صاحب اطراف وجوانب سے ماہ نیم ماہ کے بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب مہر نیمروز کی عبارت کو نہیں سمجھے تو ماہِ نیم ماہ کو لے کر کیا کریں گے۔
>
> صاحب مہر نیمروز کے دیباچہ میں میں نے لکھدیا ہے کہ اس کتاب کا نام "پرتوستان" ہے اور اس کے دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدا خلقت عالم سے ہمایوں کی

سلطنت تک کا ذکر، دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ
تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصے کا نام مہر نیم روز، دوسرے
حصہ کا اسم ماہ نیم ماہ۔ بارے پہلا حصہ تمام ہوا اچھا پا گیا۔
جا بجا پہنچا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ
امیر تمر تک کا نام و نشان مٹ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد
و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔"

یہی عبدالغفور سرور عودِ ہندی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"طاہر وحید انشا طرازی میں یکتا ہے لیکن یہ
انداز کہاں۔ ابوالفضل نثر پردازی میں بے ہمتا ہے مگر
یہ برگ و ساز کہاں۔ چنانچہ مہر نیم روز کی نالش اور ماہ نیم ماہ
کی نمائش اور دستنبو کی خوشبو و رنگینی قاطع برہان کے دلائل
کی دل نشینی شاہدِ مدعا ہے۔"

عود ہندی مرزا کی زندگی میں شائع ہو گئی تھی۔ مرزا نے اس کا دیباچہ
صرف دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی داد بھی دی تھی۔ اگر مرزا نے ماہ نیم ماہ نہیں لکھی
تھی تو اس کی تردید کیوں نہ کی گئی۔ ممکن ہے مرزا نے مصلحت اندیشی سے کام
لے کر اس کے چند قلمی نسخے خاص خاص احباب کو بھیج دیے ہوں۔ کیونکہ اس زمانے
میں ماہ نیم ماہ کا شائع ہو جانا مرزا کے مفاد کے خلاف تھا۔ بہر حال ابھی یہ امر
تحقیق طلب ہے۔

# انشائے غالب

تمام دنیا کے ادبوں میں نظم کو نثر پر تقدم حاصل رہا ہے۔ اردو ادب کے ارتقا میں بھی نظم نثر سے کئی منزلیں آگے رہی۔ اردو نظم میں تو غالب کے دور تک میرا ور سودا جیسے صاف اور سادہ زبان لکھنے والے بڑے بڑے شاعر پیدا ہو چکے تھے لیکن اردو نثر پر ابھی تک فارسی بری طرح مسلّط تھی۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت کا دور دورہ تھا۔ تکلّف، تصنع اور قافیہ بندی سے عبارت کو رنگین بنایا جاتا تھا اور بیدل اور ظہوری کی مرصع نگاری کی تقلید کی جاتی تھی۔ کلکتہ کالج سے البتہ دو چار سادہ تراجم اور دہلی کالج سے صاف زبان میں چند کتابیں شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کی چنداں ادبی اہمیت نہ تھی۔ اردو مکاتیب کو کوئی وقیع حیثیت حاصل نہ ہوئی تھی۔ فضلا و اکابر فارسی زبان ہی میں مراسلت کیا کرتے تھے اور اس میں بڑی کاوش سے کام لیا جاتا تھا۔ مرزا جب کثرت غم و الم سے اتنی کاوش کرنے اور ذہن پر اتنا زور ڈالنے سے معذور ہو گئے تو ان کی طبیعت میں سہل انگاری آگئی جو اردو نثر کے لئے بہت مبارک ثابت ہوئی۔

مرزا نے اردو میں مکاتبت کس تاریخ سے شروع کی۔ ایک ایسا مسئلہ ہے جو شاید کبھی حل نہ ہو سکے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ مرزا نے اس تاریخ سے قبل کوئی اردو خط لکھا ہی نہ تھا۔ مولانا حالیؔ کا خیال ہے کہ جب مرزا قلعہ میں ملازم ہوئے اور مہر نیمروز لکھنے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تو ان کے پاس اتنا وقت نہ رہا کہ فارسی مکتوب نویسی پر کاوش کر سکیں۔ اس لئے انھوں نے اردو خط و کتابت شروع کی۔ مولانا حالیؔ کے اس بیان کی تردید میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ۱۸۵۰ء سے قبل کا ایک خط مرزا تفتہؔ کے نام خطوط غالبؔ مرتبہ مولوی مہیش پرشاد میں موجود ہے۔ اس کی تاریخ صاحب موصوف نے ۱۸۴۹ء معین کی ہے لیکن اصل میں یہ خط اس سے بھی ایک سال قبل یعنی ۱۸۴۸ء کا ہے۔ ہمارے اس مجموعہ میں بھی مرزا کے دو خط ۱۸۴۸ء کے موجود ہیں جس میں پہلا ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کا ہے۔ اس خط کے متعلق یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ مرزا کے فراہم شدہ مکاتیب میں یہ سب سے پرانا خط ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مرزا نے اس سے قبل اردو میں کوئی خط لکھا ہی نہ تھا۔

مرزا نے اردو مکاتبت خواہ کسی تاریخ سے شروع کی ہو۔ لیکن وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب مرزا "طرز بیدل میں ریختہ لکھنا" چھوڑ چکے تھے اور میرؔ کی پیروی کے دور سے گزر کر نہ صرف ایک خاص رنگ کے مالک بن چکے تھے۔ بلکہ خود میرؔ و میرزاؔ کو اپنے سے کمتر درجے کا شاعر سمجھنے لگے تھے۔ ایسے دور میں جبکہ رقعات بیدلؔ اور انشائے مادھو رام کی پیروی کی جا رہی ہو۔ مرزا کا دلی کی سادہ زبان میں اردو نثر لکھنا ایک

زبردست اجتہاد تھا۔ جو ان کی عظیم شخصیت اور آزادہ روی کا پتہ دیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں اپنے اس اندازِ تحریر کے مقبول ہونے کا سان گمان بھی نہ تھا اور اسی وجہ سے ایک عرصے تک ان خطوط کی اشاعت کو اپنی سخنوری اور شہرت کے منافی سمجھتے رہے۔ لیکن جب انھیں اپنی کامیابی اور ان خطوط کی غیر معمولی مقبولیت کا علم ہوا تو وہ خود انکی اشاعت کے لئے کوشاں نظر آنے لگے۔

اردو نثر کی ارتقا میں غالب کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اگر مرزا نے آج سے سو سال پہلے سادہ اور بے تکلف انداز تحریر اختیار نہ کیا ہوتا تو شاید اس وقت ہماری زبان میں اسی طرح کی عبارت آرائی کی جاتی اور ہم اسی طرح قوافی کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے۔ غالب نے اپنے ملکۂ انشا پردازی سے سادہ زبان میں بے تکلفی، جدت، شیرینی، لطافت اور ظرافت کا رس بھر کر اپنے انداز تحریر کو بے حد دلکش اور سہل ممتنع بنا دیا اور اپنی شخصیت کی بوقلمونی طبیعت کی شگفتگی اور زور قلم کو کام میں لا کر اپنے انداز بیان کو وہ تابندگی اور زبان کو وہ تازگی بخشی جس کے سامنے بڑے بڑے انشا پردازوں کی نگارشات ماند اور پھیکی پڑ گئیں۔ ہر چند مرزا کے بعد بھی بڑے بڑے نثار پیدا ہوئے اور اردو زبان بھی کہیں سے کہیں پہنچ گئی لیکن کوئی غالب تک نہ پہونچ سکا۔

اردو مکاتبت مرزا کا ایک تفریحی مشغلہ تھا۔ اس لئے ان کی کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ کسی طرح مکتوب الیہ کا دل خوش ہو جائے اور یہ بات انکی وسیع المشربی بذلہ سنجی اور ظرافت طبیعت کے لئے کوئی مشکل نہ تھی۔ مرزا اظہار بیان کی برجستگی سے تحریر کو مکالمہ کا رنگ دے دیتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ طبیعت کی ظرافت اور شوخی دلچسپی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ القاب و آداب کے فرسودہ طریقے کو یکقلم موقوف کر کے ایک دم اظہار مدعا

اتر آتے ہیں لیکن جن دوستوں سے بے تکلفی نہیں یا جہاں حفظ مراتب کا لحاظ پیش نظر ہوتا ہے وہاں القاب و آداب کو غیر ضروری نہیں سمجھتے۔ سلام و دعا ہر خط میں لکھنے ضرور ہیں لیکن ان میں بھی طرح طرح کی ندرتیں اور ظرافتیں پائی جاتی ہیں۔ خطوطِ غالب کی بہت سی خوبیوں میں سے یہ چند ایسی خوبیاں ہیں جنہوں نے مرزا کی اردو نثر کو عمرِ دوام بخشی ہے۔

مرزا کی طرز عبارت، شوخی اور ظرافت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کے مختلف پہلو بھی اجاگر کئے جا چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غالب کے جو خطوط منظرِ عام پر آئے ہوئے تھے صرف انھیں کو "موضوع سخن" بنایا جا سکتا تھا۔ یہ خطوط جن پر پہلی بار قلم اٹھایا جا رہا ہے اپنی برجستگی و بے تکلفی کے اعتبار سے اردوئے معلی، عود ہندی اور مکاتیب غالب سے سبقت لے گئے ہیں۔ کیونکہ مرزا کی یہ سب نگارشات اس دور کی ہیں جب ان کی اشاعت کا کسی کو خواب و خیال بھی نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس عہد کے کچھ خطوط مرزا تفتہ اور دوسرے حضرات کے نام بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان معدودے چند خطوط میں بھی اہم بہت کم ہیں۔

مرزا کے ان خطوط پر ہم طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ان کے ملکۂ انشا پردازی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ آپ خود ان کی بذلہ سنجی، شوخ نگاری اور بلند ظرافت کا اندازہ لگائیے جو ان کی شہرت و کامیابی کا اصلی راز ہے۔

دنیا میں کون ایسا شخص ہے جس کا دل حسرت و ارمان سے خالی ہو۔ یہ خاصۂ فطرت انسانی ہے۔ مرزا کے پہلو میں بھی ایک دل دھڑکتا تھا۔ ان کے دل میں بھی آرزوؤں کی ایک وسیع دنیا آباد تھی۔ لیکن اس حرماں نصیب کی سوگوارانہ زندگی ایک المیہ بن کر رہ گئی تھی جس کی زندہ مثالیں خود مرزا کی وہ نگارشات ہیں جن میں انھوں نے اپنے عالم مایوسی کا مرقع کھینچا ہے۔ عام طور پر

اس قسم کی سوختہ بختی کی داستانیں دردِ سر یا رنج و ملال کا باعث ہوا کرتی ہیں لیکن مرزا کی طبعی شوخی اور شگفتگی اپنی المیہ داستان پر کچھ ایسا مزاحیہ رنگ چڑھاتی ہے کہ اس کا ہر پہلو نشاط آمیز معلوم ہونے لگتا ہے اور سننے والے کے لئے یہی غم والم کا بیان سامان تفریح بن جاتا ہے۔ مرزا صاحب ایک جگہ اپنی مایوسی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

"جے پور کا حال کیا پوچھتے ہو۔ ایک گدائی کی طرح نکالی تھی۔ ایک دوست مددگار ہوا اور اس طرح کو اس نے کمال کو پہنچایا۔ راول مختار راج اور سعد اللہ خاں وکیل راج یہ دونوں ذریعہ حصولِ مدعا ٹھہرے۔ وہاں کا رنگ یہ ہو گیا کہ راول بھاگتا پھرتا ہے اور وکیل استعفا بغل میں دابے رہتا ہے۔ راجہ لڑکا ہے اور کوئی محرک نہیں۔ پس اب اس امر خاص کو بھی ہم نے فہرست حسرتہائے دیرینہ میں لکھ لیا۔ واللہ علیٰ کل شئی قدیر۔"

واقعات کو اس انداز اور اس خوبی سے پیش کرنا کہ جس سے مخاطب ہمہ تن گوش اور نقشِ حیرت بن کر رہ جائے۔ مرزا کی انشاپردازی کا ادنےٰ کرشمہ ہے۔ شگفتگی اور ظرافت ان کی طبیعت کے جوہر ہیں اور جب صاف اور سادہ جملے ان جواہر سے مزیّن ہو جاتے ہیں تو نثر خود بخود اس طرح بولنے لگتی ہے کہ بڑے بڑے داستان گویوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں اور سننے والے کی زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔ دیکھیے ایک دوست کی تباہی و بربادی کا افسانہ چھیڑ کر مرزا نے "نئے نواب" کی اصطلاح پر کس طرح قلم اٹھایا ہے:

"یہاں دلّی میں ایک اصطلاح ہے نئے نواب کی

اور یہ لفظ عام ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ اس پر صادق آجاتا
ہے۔ صورت یہ کہ جہاں کوئی شخص مرا بشرطِ آنکہ وہ دولتمند ہو
اس کا بیٹا مال پر متصرف ہوا۔ بدمعاش لوگ فراہم ہوئے اور
اس کو خداوند نعمت اور جناب عالی کہنا شروع کیا۔ فلانی رنڈی
آپ پر مرتی ہے۔ فلانا امیر مجلس میں آپ کی یوں تعریف
کر رہا تھا۔ آپ کو لازم ہے اس رنڈی کا بلانا اور اس امیر
کی دعوت کرنی۔ دنیا اسی واسطے ہے۔ روپیہ ساتھ ساتھ
نہیں جاتا۔ آپ کے باوا کیا لے گئے جو آپ لے جائیں گے۔
غرض کہ بندہ آج تک تین نئے نواب دیکھ چکا ہے۔ ایک تو
کھتری ٹوڈرمل۔ لاکھ روپے کا آدمی تھا۔ پانچ سات برس
میں سب کچھ کھو کر شہر سے نکل گیا اور مفقود الخبر ہو گیا۔ دوسرا
ایک پنجابی لڑکا سعادت نام۔ پچاس چالیس ہزار روپیہ
کھو کر تباہ ہو گیا۔ تیسرا خان محمد نام سعد اللہ خاں کا بیٹا کہ
وہ بھی بیس پچیس ہزار روپیہ لٹا کر اور بھنگیوں پر چڑھ کر
اب جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ غرضکہ مردوں کو نئے نواب
بنتے سنا تھا۔ عورتوں میں اس نیکبخت کو دیکھا۔ اصل اس کی
یہ ہے کہ ایک خانگی ہے مکارہ اور عیارہ۔ اب بڑھاپے میں
اس نے میرے حقیقی سالے یعنی زین العابدین خاں مرحوم
کے ماموں کو دام میں لا کر ان کے گھر بیٹھی ہے اور نیک بخت
بہو بیٹیوں کو لوٹتی پھرتی ہے۔ اسی نے رسالدار کی بی بی
سے مل کر اس کو نیا نواب بنایا اور سارا گھر لٹوایا۔ چنانچہ

رسالدار کی زبانی آپ کو مفصّل معلوم ہوگا۔ بیچارے نے ہرچند چاہا کہ یہ میرے ساتھ چلے۔ ہرگز نہ گئی ؎

در کنج دماغم مطلب جائے نصیحت
کایں حجرہ پر از زمزمۂ چنگ و رباب است

مرزا کو آخری ایک تہائی عمر میں احتراق اور فساد خون سے پیدا ہونے والے امراض کی شدید تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ اس کثرت آلام و شدت درد نے مرزا کی زندگی کو بالکل بے کیف بنا دیا تھا۔ وہ اپنے درد و الم اور ان آلام و عوارض کا ذکر کرتے ہیں تو دوران بیان میں اپنے امراض جسمانی کی ایسی عجیب و غریب تشبیہیں پیش کرتے ہیں کہ اس بیان پر درد سے بھی خط میں ایک نئی زندگی دوڑ جاتی ہے اور سننے والا ایسے مریض کی حاضر دماغی پر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے مرزا صاحب کے خطوط میں ان کی بیماری کا اس سے زیادہ پر لطف بیان اور کہیں نہیں ملتا۔ فرماتے ہیں :

"اصل حقیقت یہ ہے کہ میرا اور آپ کا لہو ملتا ہے۔ جب وہاں احتراق کی نسبتیں ہیں تو یہاں اس کا ظہور کیونکر نہ ہو۔ ایک مدت سے ... اپانوں پھل رہا تھا۔ چھوٹے دانے بطریق دائرہ کف پائے محیط تھے۔ ناگاہ جیسے ایک قوم میں سے ایک شخص امیر ہوجائے۔ ایک دانہ ان دانوں میں سے بڑھ گیا اور پک گیا اور پھوڑا ہوگیا اور وہ قریب ٹخنے کی ہڈی کے تھا۔ قیاس کیجئے کہ کیا حال ہوگا۔ عید کے دن بادشاہ کے ساتھ عیدگاہ نہ جاسکا۔ دوسرے دن لنگ لنگاں

قلعہ گیا اور عید کی نذر دی۔ آخر کار تپ چڑھی اور صداع شدید عارض ہوا۔ وہ پھوڑا پکا اور پھوٹا۔ کھولن عرض کروں، سوزش عرض کروں۔ دس بارہ دن برابر یہ حال رہا۔ مرہم لگائے آخر کار وہ پھوڑا پھوٹا۔ اس میں سے مادہ منجمد جسے کیل کہتے ہیں وہ نکلا۔ دو انگل کا زخم پڑ گیا۔ اب وہ زخم بھر گیا ہے۔ دو پھاہوں میں اچھا ہو جائے گا۔ تپ جو عارضی تھی جاتی رہی۔ مگر صداع شاید مادی اور بجائے خود ایک مرض حقیقی تھا۔ کہ ہنوز باقی ہے یا اللہ العظیم۔"

ایک اور جگہ ڈاڑھ کے درد اور اپنے دوست کا شکریہ اس طرح ادا کرتے ہیں:

"اب میرا حال سنو۔ منجن پہنچا۔ درد سے مر رہا تھا واللہ بے تکلف کہتا ہوں۔ میں نے اس پچپن برس کی عمر میں ایسی سریع التاثیر دوا نہیں دیکھی۔ ایک بار کے لگانے سے درد تو فوراً جاتا رہا۔ صبح کو ورم بالکل نہ تھا۔ ڈاڑھ کے درد کی تو اکسیر یہ ہے لیکن باوجود اس کے تکلیف نہ گئی۔ بھائی یہ درد از قسم اوجاع نزلہ و رطوبت نہیں۔ ڈاڑھ گرنے کو ہے۔ جگہ چھوڑ دی ہے۔ اوپر کو اٹھ آئی ہے۔ ہنوز کچھ علاقہ مسوڑھے سے باقی ہے۔ جب وہ علاقہ جا چکے اور ڈاڑھ گر چکے تب فرصت ہو۔ چار ڈاڑھیں گر چکی ہیں یہ پانچویں گرا چاہتی ہے۔ چونکہ بے انتہا ہیں۔ اس کو اکھڑوا نہیں سکتا۔ بہر حال آپ کی عنایت سے وہ درد

اور ورم جو منشائے آزار تھا، جاتا رہا۔ اب یہ قصہ تو
جب تک زندہ ہیں رہے گا۔ پاؤں بھی اچھا ہے۔ زخم
تھوڑا سا باقی ہے۔ زحمت و تکلیف و رنج و آشوب
نہیں۔"

جب کسی کی فرمائش پوری نہ کی جا سکتی ہو، یا کسی کام سے پہلو تہی کرنا منظور ہو تو کوئی نہ کوئی عذر پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے لیکن عذر کے پیش کرنے کے لئے بھی سلیقہ چاہیئے۔ عذر اسی وقت عذر ہو سکتا ہے جب وہ ہر قسم کے تصنع بناوٹ اور تکلف سے پاک ہو اور اس پر جھوٹ اور مبالغہ کا شائبہ بھی نہ ہو سکتا ہو۔ مرزا اس فن میں بھی طاق ہیں اور جہاں کہیں وہ حیلہ یا مبالغے سے کام لیتے ہیں وہاں ان کی ظرافت کی شیرینی فرمائش کرنے والے کے ذہن کو اس طرف رجوع ہونے نہیں دیتی۔ اور اس طرح مرزا اپنے انداز بیان اور عذر آمیز الفاظ سے جو بات پیدا کرنی چاہتے ہیں۔ کر جاتے ہیں۔ منشی نبی بخش حقیر نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے پلنگ کے پاؤں کی فرمائش کی ہے۔ مرزا انکا سا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ ہر تقاضے کے جواب میں لکھ چکے ہیں کہ پلنگ کے پائے ڈھونڈ رہا ہوں۔ لیکن چاہتے یہی ہیں کہ بات کسی طرح رفع دفع ہو جائے۔ فرماتے ہیں:

"بھائی صاحب! کئی خط اس عرصے میں تم کو لکھے
مگر جو لکھنا تھا وہ بھول گیا۔ پلنگ کے پائے مسلّم لیکن یہ
تم نے نہیں لکھا کہ پائے بڑے پلنگ کے ہوں یا چھوٹی
سی پلنگڑی کے ہوں۔ مقدار مالیت تو معلوم مگر اندازہ
پستی و بلندی کا نہیں معلوم۔ اس کا لکھنا ضرور ہے۔

ضرور لکھو اور جلد لکھو۔"

مرزا کی معذرت میں خلوص کی انتہا اور صاف گوئی بھی دیکھئے:

"دوسرے خط کا جواب کیا لکھوں۔ تم سے شرمندہ ہوں۔ پنڈت جوالا ناتھ صاحب سے شرمسار ہیں جو تواریخ تیموریہ لکھتا ہوں تو صرف حالات و واقعات لکھتا ہوں۔ ملک کی جمعبندی اور اضلاع و مضافات کی تحقیقات سے مجھے کام نہیں . . . میں فن تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کار پردازانِ دفتر شاہی خلاصۂ حالات از روئے کتب اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ میں اس کو فارسی میں کر کر حوالہ کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں۔ میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر لقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں۔ مورخ نہیں ہوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

بھائی تمہاری جان کی قسم میں اس فن سے اتنا بے خبر ہوں کہ یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھا کہ پنڈت صاحب نے کیا کچھ لکھ لیا ہے اور وہ کیا ہے جس کی ان کو خواہش ہے۔"

مرزا اپنی شگفتگیٔ طبیعت اور شیرینیٔ مزاج کے باوجود اپنی کبر سنی اور ہجوم آلام و افکار کے باعث بعض اوقات احباب کے طعنوں پر جھلا اٹھتے ہیں۔ لیکن ایسے موقع پر بھی ان کی خوش طبعی اور ظرافت ان کا دامن نہیں چھوڑتی

اس برہمی کا بھی ایسا نرالا اور عجیب شیوہ ہوتا ہے کہ سننے والے کی طبیعت پر بار گذرنے یا کسی قسم کا رنج وملال ہونے کے بجائے اسے ایک خاص قسم کا لطف آنے لگتا ہے۔ ان کی جھلاہٹ دل پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ ان کے لبوں کی یہی کپکپاہٹ اعجاز سخن بن جاتی ہے۔ منشی نبی بخش نے انھیں مہر نیمروز کا طعنہ دیا ہے۔ دیکھیے مرزا صاحب نے گرمی کے ساتھ ساتھ کتنی نرمی برتی ہے:

"مہر نیمروز آپ کو مبارک۔ مول لیجیے اور احباب کو بھیجیے۔ میں ایسی خرافات کا مشتاق نہیں جو آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر تو کہے تو تجھ کو بھی بھیجدوں۔ ستیا ناس جائے اس کتاب فروش کا کہ جو یہ رسالے کو لے گیا اور آپ نے مجھے یہ طعنہ دیا۔ بھائی یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم نے میرے چچیرے کو لکھا ہے ورنہ وہاں یہ نسخے نہ پہونچے ہوں گے۔ اگر کسی دوست کے واسطے تم کو درکار ہو تو ایک آدھ نسخہ میں بھیجدوں۔ خفا نہ ہو۔ مجھکو لکھو۔"

مرزا جب کسی جواب خط یا خبر کا شکوہ لکھتے ہیں تو اس میں محبت اور طنز کے ساتھ ساتھ نشتر کی ہلکی سی چبھن بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایسے لطائف وظرائف تراشتے ہیں کہ اس شکوہ میں ایک قسم کی شوخی پیدا ہو جاتی ہے۔ منشی نبی بخش ان کے دوست ہی نہیں ہم ذوق، ہم مرض، ہم وطن اور ہم فن بھی ہیں۔ ان سے برادرانہ تعلقات ہیں۔ مراسم اس حد کو پہنچ چکے ہیں کہ ان کی "دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر" اور "اس نعمت پر دنیا سے قانع" ہیں۔ ایسے دوست کی طرف سے بے توجہی، بے نیازی اور استغنا دیکھ کر مرزا بہت بے چین ہو جاتے ہیں۔ دیکھیے ان کی اس شکایت میں نشتر کی چبھن کتنی

تیز ہو گئی ہے:

"خدا کے واسطے ماجرا کیا ہے۔ نہ تو اپنی اور اپنے بچوں کی خیر و عافیت لکھتے ہو نہ میری زیست کی خبر پوچھتے ہو۔ نواب ضیاء الدین خاں کی نظم و نثر کے اوراق حسب الطلب تمہارے بھیجے۔ اس کی رسید بھی نہیں۔ یہ تو صورت انقطاع محبت کی سی ہے۔ گمان کرتا ہوں کہ دورے کا سفر ہوگا۔ اس صورت میں بھی تو تم مجھ کو خط بھیجا کرتے تھے۔ کثرتِ کاروبار نئی بات نہیں۔ کیا عدالت دیوانی اور پرمٹ اور کمشنری یہ تینوں محکمے بھی آپ ہی کے سپرد ہو گئے۔

منشی ہرگوپال بھی کول میں نہیں کہ جو ان کی تحریر سے تمہارا حال معلوم ہو مجھ کو علم غیب نہیں۔ اشراق ضمیر نہیں کہ یہاں بیٹھا ہوا تمہارا حال دریافت کر لوں۔ ایک ذرا ہوش میں آؤ اور اپنی معہ اپنے متوسلوں کے خیریت لکھ کر بھیجو۔ سب کا حال نام بنام لکھو۔"

ایک اور جگہ اس طرح شکوہ کرتے ہیں:

"پیر و مرشد۔ مجھ پر عتاب کیوں ہے۔ نہ میں تم تک آسکتا ہوں نہ تم تشریف لا سکتے ہو صرف نامہ و پیام، سو آپ ہی یاد کیجیے کہ کتنے دن سے آپ نے اپنی اور بچوں کی خیر و عافیت نہیں لکھی۔"

ضرب اور جمع تفریق علم ریاضی کی دنیا ہیں۔ اس جیسے خشک مضمون کو شاعروں اور ادیبوں سے بہت تھوڑا اسا واسطہ اور بہت کم سروکار رہا ہے۔ لیکن

مرزا غالب کی شگفتگی طبیعت اور حسن بیان نے اس مضمون کی خشکی پر کس طرح غلبہ پایا ہے اور اسے کس طرح رنگین بنایا ہے ملاحظہ کیجئے:

"ایک نئی بات سنو۔ شہر میں ایک وبا آئی ہے۔ یعنی وکیل کمپنی نے سنین ماضیہ کے کاغذ دیکھ کر رسوم سرکاری جن جن شخص پر پہنچتے تھے اسکا مطالبہ کیا ہے اور مطالبہ کیا مع اخذہ یعنی لشدت۔ ازاں جملہ مجھ پر بھی بابت رسوم سرکاری پانسو روپے آٹھ آنے نکلے اور اس کی طلب بقید حکم قید ہوئی۔ میں آٹھ آنے کو محتاج پانچ سو کہاں سے لاؤں۔ بارے حضرت انگریزی تنخواہ میں سے پانچ روپے مہینہ بطریق قسط مقرر کر دیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے پاتا تھا۔ ستاون روپے آٹھ آنے رہ گئے۔ پانچ روپے مہینہ کا ساٹھ روپے سالیانہ ہوا اب یہ توقع کہاں کہ پھر پوری تنخواہ پاؤں گا۔ یوں سمجھئے کہ ستاون روپے کا پنشن دار ہوں۔ بارے منگل کو فیصلہ ہوا تین دن تک سوار نہ ہوا اور قلعہ نہ گیا۔ کل گیا تھا۔ اور آج گیا تھا۔"

عذر خواہی و تعزیت ایک عام رسم ہے جس کا مقصد اظہار رنج و غم، تلقین صبر و ہمدردی ہوا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے سانحے اور ایسے مواقع پر جن جچے تلے کلمات کا استعمال ہوتا ہے وہ باعتبار مضمون فرسودہ، پامال اور قدیم ہو چکے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ ماتم زدہ کوئی حرف سننے سے پہلے ہی کہنے والے کا مافی الضمیر سمجھ جاتا ہے۔ مزید برآں اس سے کسی قسم کی تسلی نہیں ہوتی۔ لیکن مرزا ایسے نازک موقع پر بھی اپنے ظریفانہ انداز بیان اور شگفتگیٔ طبع کو کام میں لا کر

اس جانگداز فرض کو ایسی چابکدستی سے انجام دیتے ہیں کہ اس غریب سوگوار کا کم از کم تھوڑی دیر کے لئے تو غم غلط ضرور ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ عذر خواہ اس کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ دیکھئے منشی نبی بخش کی بہو کے انتقال پر مرزا رسم تعزیت کس طرح ادا کر رہے ہیں:

"ہائے ہائے وہ نیک بخت نہ بچی ——— واقعی یہ کہ تم پر اور اس کی ساس پر کیا گزری ہوگی۔ لڑکی تو جانتی ہی نہ ہوگی کہ مجھ پر کیا گزری۔ لڑکا شاید یاد کرے گا اور پوچھے گا کہ اماں کہاں ہیں۔ یہ اس کا پوچھنا اور تم کو رلائیگا۔ بہر حال چارہ جُز صبر نہیں۔ ماتم رکھو۔ رو ؤ بیٹو۔ آخر خون جگر کھا کر چپ رہنا پڑے گا۔ حق تعالیٰ عبداللطیف کو اور تم کو اور تیموں کی دادی اور پھپھیوں کو سلامت رکھے اور تمہارے دامنِ عطوفت و آغوشِ رافت میں ان کو پالے۔"

مرزا کا کسی کے انتقال کی خبر دینے کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ اپنی پھپھی کے انتقال کی خبر اس طرح دیتے ہیں:

"بھائی صاحب۔ میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاوّل کو شام کے وقت میری وہ پھپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی۔ مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں۔ اور اس کے مرنے

سے میں نے یہ جانا کہ یہ تو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

حکیم مومن خاں مومن کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے مرزا نے ایک لطیفہ شامل کر کے اسے کتنا جانفزا بنا دیا ہے اور ایک معمولی بات میں سے کیا بات نکالی ہے جس سے ان کے بلند کردار کا پتہ چلتا ہے:

"سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج اُن کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہمعصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تنتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اور اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔"

رشک کا مضمون مرزا کو بڑا مرغوب تھا۔ چنانچہ انھوں نے بہت سے اس مضمون کے اشعار لکھے لیکن اس شعر میں تو مرزا اس مضمون کو کہیں سے کہیں لے گئے ہیں

نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گزرا
کیسے کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

نثر میں بھی مرزا جب اس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں تو عجیب عجیب شگوفے

کھلاتے ہیں۔ لیکن یہاں رشک کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یا الٰہی کس کس پر رشک کروں۔ مال و دولت،
جاہ و شوکت پر تو میں کسی کا بھی حاسد نہیں ہوا۔ شیخ وزیر الدین
پر اور مرزا احسن علی بیگ رسالدار پر حسد کیوں نہ کروں کہ میرے
بھائی کو دیکھتے ہوئے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے آئے ہیں۔"

--- ◦ ---

خطوط نویسی مرزا کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ جب کبھی دوسری جانب سے جواب میں تاخیر ہوتی تو شکوہ لکھتے۔ اور خود بھی جواب نہ روکتے۔ اگر کبھی اپنی جانب سے کوتاہی ہو جاتی تو اس کی معذرت چاہتے۔ لیکن بے جا شکایت تسلیم نہ کرتے تھے۔ پھر بھی ان سب کا انداز نہایت شوخی آمیز ہوتا۔ دیکھئے ایک جگہ اپنے آپ کو بے قصور گردانتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب! یہ نئی طرز روش ہے کہ خط کی رسید
تو لکھتے نہیں اور الٹا شکوہ کرتے ہو۔ ظاہرا یہ لطیفہ خیال
میں آیا ہوگا ؎

کہ یاراں فراموش کردند عشق

اور یہ درج نہ ہو سکتا تھا بغیر شکایت کے۔ ناچار خط کے
بھیجنے سے قطع نظر کی۔ ڈاک کتاب معہ رسید میرے پاس
موجود ہے۔ روز یکشنبہ دوم اکتوبر کو خط روانہ ہوا ہے۔
مزا اس میں یہ ہے کہ آپ کا خط یکشنبہ دوم اکتوبر کا لکھا ہوا
ہے۔"

ایک جگہ اپنی حد درجہ مایوسی کی تصویر کھینچتے ہوئے جواب خط کی تاخیر پر اس طرح

معذرت چاہی ہے:

"شفیق میرے۔ مشفق میرے۔ کرم فرما میرے۔ عنایت گستر میرے۔ تمہارے ایک خط کا جواب مجھ پر فرض ہے۔ کیا کروں سخت غمزدہ وملول رہتا ہوں مجھ کو اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع اور عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا۔ خلاصہ میرے رنج والم کا یہ ہے کہ میں اب صرف مرنے کی توقع پر جیتا ہوں۔ ہیہات۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید

ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

مرزا صاحب کو خاطر خواہ داد نہ ملنے کی ہمیشہ شکایت رہی لیکن خود بھرپور داد دیتے ہیں۔ بظاہر ان کی داد مبالغہ اور غلو کی حدوں سے جا ملتی ہے۔ لیکن ان کے خلوص پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ اور سننے والا تھوڑی دیر کے لئے تو اپنا "مقام" "عرش سے پرے" سمجھنے لگتا ہے۔ منشی صاحب نے اپنے ایک دوست کا فارسی خط برائے اصلاح بھیجا ہے۔ مرزا صاحب منشی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اس کی داد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اور لطف یہ ہے کہ اس کی تعریف کرتے کرتے اپنی اور اپنے پیش رووں کی فارسی نثر کے تقابل کا پہلو بھی پیش کر جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اجی پیر و مرشد۔ یہ نثر جس کو آپ نے خط تعبیر کیا ہے اور واقعی کہ وہ خط ہے۔ مگر مینا بازار کے برابر یا سہ نثر ظہوری کے برابر یا نصف پنج آہنگ کے برابر۔ آپ اس کے کاتب کا نام عنایت اللہ لکھتے ہیں۔ کہیں سہو نہ ہوا ہو۔

عطاءاللہ خاں صاحب ایک بزرگ وہاں ہیں۔ شاید ان کی
تحریر ہو۔

بابد متاعِ نیکو از ہر دکاں کہ باشد

کیا کہنا ہے۔ بہت خوب ہے اور بہت پاکیزہ۔ پھیلاؤ کتنا اچھا
ہے۔ مضامین کیسے بلند ہیں۔ ترکیب الفاظ کیسی درست ہے
میں آپ کا احسان مند اور شکر گزار ہوں کہ آپ کی عنایت سے
یہ نظم و نثر میں نے دیکھی۔"

مرزا بہت با وضع شخص تھے۔ حفظِ وضع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور دید باز دید کا بھی خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ دوسروں کی کوتاہی ان کی طبع نازک پر بہت بار گزرتی تھی۔ جس کا وہ گلہ و شکوہ بھی کیا کرتے تھے۔ اس شکوہ میں جہاں تھوڑی سی خلش اور تلخی مضمر ہوتی ہے وہاں ان کی بذلہ سنجی اور شوخی ایک چٹکلے کی شیرینی بھی شامل کر دیتی ہے۔ جو سننے والے کے لئے شہد کی حلاوت سے کم نہیں ہوتی۔ مرزا کی اسی نوعیت کی شکوہ سنجی ملاحظہ کیجئے:

"ایک شیخ مومن علی صاحب صدر امین کول یہاں
آئے تھے۔ ایک دن وہ میرے ہاں تشریف لائے تھے۔
میں سوار ہو گیا تھا۔ نہ ملا۔ دو دن کے بعد ان کے ہاں گیا
ملا۔ تمہارا بھی ذکر آیا۔ تمہاری بہت تعریف کرتے تھے۔
میں منتظر تھا کہ وہ اب پھر آئیں گے تا بہ کہ دن چار ایک ہوئے
کہ میں نے قاعہ میں حکیم امام الدین صاحب سے پوچھا کہ صدر
امین کول جن کا آپ علاج کرتے تھے وہ اب کیسے ہیں۔ انھوں
نے فرمایا کہ وہ اب کول کو گئے۔ غرض یہ کہ اگر آپ سے ملاقات ہو

تو فرمائیے گا کہ اسد اللہ روسیاہ بعد سلام عرض کرتا ہے کہ
وہ رتبہ میرا تو کہاں کہ میں آپ سے شکوہ کروں کہ مجھ سے
مل کر آپ نہ گئے۔ مگر ہاں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو خبر
کیوں نہ ہوئی۔ ورنہ میں تو دیع کو پہنچتا۔"

جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہے خطوط غالب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مرزا تحریر کو مکالمہ کا رنگ دے دیتے ہیں جو ان کے ملکہ انشا پردازی پر دال ہے۔ شوخی، ظرافت، بذلہ سنجی بھی ہر چند ایسے عناصر ہیں جنہوں نے خطوط غالب میں کافی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ لیکن جس انداز سے انھوں نے تحریر کو مکالمہ کا رنگ دیا ہے وہ بھی بے حد دلچسپ بدیع اور سہل ممتنع ہے۔ اسی انداز تحریر اور اسی مکالمے کا تذکرہ مرزا صاحب ہی کی زبان سے سنئے۔ ظرافت اور شوخی یہاں بھی دامن سنبھالے ہوئے ہے:

"آج آپ نے دریافت کیا ہوگا کہ جی چاہا تم سے باتیں کرنے کو۔ یہ میں باتیں کر رہا ہوں۔ خط نہیں لکھتا۔ مگر افسوس کہ گفتگو میں وہ لطف نہیں جو مکالمۂ زبانی میں ہوتا ہے یعنی میں ہی بک رہا ہوں۔ تم کچھ نہیں کہتے۔ وہ بات کہاں کہ میری بات کا تم جواب دیتے جاؤ۔ اور تمہاری بات کا میں جواب دیتا جاؤں۔ کیا کروں عجب طرح سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میرے حالات سراسر میرے خلاف طبیعت ہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ چلتا پھرتا رہوں۔ مہینہ بھر وہاں اور دو مہینے وہاں اور صورت یہ کہ گویا مشکیں بندھا ہوا پڑا ہوں کہ ہرگز جنبش نہیں کر سکتا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

کاغذ تمام ہو گیا اور ہنوز باتیں باقی ہیں۔ اس خبط سے میں نے اپنے بچوں کو بھی دعا نہیں لکھی۔ بھائی تم کہہ دینا۔ اپنے خط میں ان کی خیر و عافیت لکھنا۔"

ان اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا نے روزمرہ کی بول چال کی زبان اپنے خطوط میں لکھی ہے۔ ان میں تازگی بھی ہے شگفتگی بھی جان بھی ہے اور اثر بھی۔ ان کی سادگی پر تکلف اور تصنّع قربان ہیں۔ طرز بیان بے حد موثر۔ یہی خوبیاں زندہ زبان اور پائدار در صالح ادب کی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نثر نگاری میں خطوط غالب کا تتبع کیا جائے تاکہ اردو میں خاطر خواہ وسعت پیدا ہو سکے۔

---

# دس سال

(۳۰ رمئی ۱۸۴۷ء سے ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء تک)

## نامرادیٔ غالب۔

۱۸۴۲ء میں جب جاگیر اور پنشن میں اضافے کے مطالبات رد کر دیئے گئے اور ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے نام میموریل بطور اپیل بھیجنے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا تو مرزا ۱۸۴۴ء میں بالکل مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ پچھلے اٹھارہ سال کی طویل مدت میں جن آرزوؤں کو دل میں پالا تھا وہ سب خاک میں مل گئیں۔ ادھر طویل علالت نے ادر نڈھال کر دیا۔ چوسر اور شطرنج کا مرزا کو ہمیشہ سے شوق تھا اس لئے اپنا غم غلط کرنے کے لئے زیادہ وقت ان ہی کھیلوں میں گزارتے اور اکثر بازی بد کر کھیلتے۔ کچھ جوہری بچے بھی آجاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا دیوانخانہ جوے بازی کا باقاعدہ اڈا بن گیا۔ اس طرح مرزا کو بغیر مشقت کے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ ایک عرصہ تک تو شہر کے حکام اور کوتوال ایسے لوگ رہے جن سے مرزا کے تعلقات تھے لیکن اتفاق سے ایک ایسا کوتوال دہلی بدل کر آیا جو ان کا دشمن تھا۔ ان دنوں قماربازی کی انسدادی تدابیر پر بڑی سختی کے ساتھ عمل کیا جا رہا تھا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور مرزا کو

۳۰ مئی ۱۸۴۷ء کی شب میں عین موقع پر گرفتار کر لیا۔ غالب جیسے رئیس زادے اور معزز شخص کے لئے یہ واقعہ بڑا شرمناک اور ذلت آمیز تھا۔ بہادر شاہ کی طرف سے ۲۵ جون ۱۸۴۷ء کو غالباً پیر کالے صاحب اور حکیم احسن اللہ خاں کے ایما پر ایک سفارشی چٹھی ریزیڈنٹ کے نام لکھی گئی کہ مرزا کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا ہے انھیں رہا کیا جائے۔ لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور ریزیڈنٹ نے جواب میں لکھا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔ آخر ۲ جولائی ۱۸۴۷ء کو اس مقدمہ کا فیصلہ ہوا۔ مرزا کو چھ ماہ کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید چھ ماہ کی قید بامشقت اور اگر مقررہ جرمانہ کے علاوہ پچاس روپے ادا کریں تو مشقت معاف۔ لیکن مرزا کو میعاد پوری ہونے تک قید میں نہیں رہنا پڑا۔ بلکہ تین ماہ بعد رہائی کا حکم آگیا۔ قید کے زمانے میں غالب نے چوراسی اشعار کا ایک فارسی ترکیب بند لکھا جو ان کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

## مرزا کی قید پر لوگوں کے خیالات اور برتاؤ۔

بہادر شاہ اور ان کے سب درباری یہی سمجھتے تھے کہ دشمنوں کی غلط مخبری کے باعث مرزا پر یہ مصیبت آئی ہے۔ عام خیال تھا کہ سزا سخت دی گئی ہے۔ احسن الاخبار کے ایڈیٹر نے اس سزا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ غالب بڑے معزز اور باکمال رئیس ہیں ان کی صحت عرصہ سے خراب ہے اور سزا اتنی سخت ہے کہ شاید وہ اس کی تاب نہ لا سکیں۔

قید ہونے کے بعد ہی اکثر دوستوں اور جاگیردار رشتہ داروں نے مرزا سے آنکھیں پھیر لیں اور ان کو اپنے اعزا و اقربا میں شمار کئے جانے سے گریز کرنے لگے خاص طور پر خاندان لوہارو کا طرز عمل بے حد افسوس ناک رہا۔ ان کے خاندان کا کوئی

فرد نہ مرزا سے اس دوران میں ملا اور نہ ان کی کوئی مدد کی بلکہ جب آگرے کے کسی اخبار نے مرزا کو خاندان لوہارو کا رشتہ دار بتایا تو یہ بات ان لوگوں کو بہت کھلی اور اس کی تردید میں لکھوایا کہ مرزا کا خاندانِ لوہارو سے محض سببی رشتہ ہے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ہی مرزا غالب کے ایسے دوست صادق الوداد تھے جنھوں نے ان کی رہائی کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ ایک ایک حاکم سے ملاقات کی اور مقدمہ اور اپیل کے تمام مصارف خود برداشت کئے۔ ہر دوسرے روز قید خانے میں ملنے جاتے اور مرزا کی جملہ ضروریات کا انتظام کرتے۔ اسی سچی دوستی اور محبت کی بنا پر ہی تو مرزا نے اپنے ترکیب بند موسوم بہ حبسیہ میں شیفتہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے سے

مصطفےٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بہ میرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

## قرب شاہ۔

غالب قید سے تو چھوٹ گئے لیکن قمار بازی کے جرم میں گرفتار ہونے کے ساتھ ہی ان کے لئے ایک اور راہ مسدود ہو گئی تھی۔ اب تک انھوں نے اپنی عزت آبرو بنائے رکھی تھی اس لئے امید تھی کہ کسی ریاست میں احباب کی وساطت سے کوئی معقول جگہ مل جائے گی۔ اس رسوائی کے بعد یہ توقع بھی جاتی رہی۔ اب انھیں ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار کی خاندانی پنشن پر گزارا کرتا تھا جو ان جیسے شاہی خرچ والوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ آخر احباب نے صلاح مشورے سے یہی تجویز کیا کہ انھیں کسی طرح ملازمت شاہی سے منسلک کر دینا چاہیے۔ شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر جولائی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ نے انھیں تاریخ تیموریہ لکھنے پر مامور کیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات سے سرفراز فرما کر

پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ مرزا نے تاریخ کا نام پرتوستان رکھا اور اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ پہلے کا نام مہر نیمروز اور دوسرے کا ماہِ نیم ماہ رکھا۔

مغلیہ سلطنت کے اس آخری دور میں ملازمتوں کے لئے ذاتی لیاقت کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ جو شخص زیادہ نذرانہ پیش کرتا اسے کسی عہدہ پر مقرر کر دیا جاتا۔ مرزا غالب نے بھی اسی دستور کے مطابق خلعت، خطاب اور پچاس روپے ماہانہ کی ملازمت کے لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ ضرور پیش کیا ہوگا۔

## قربِ شاہ سے پہلے:-

مرزا کے قلعہ سے مراسم کا سلسلہ اس فارسی قصیدے سے ملتا ہے جو اکبر شاہ ثانی کی مدح میں لکھا گیا تھا اس کا مطلع ہے ؎

دریں زمانہ کہ کلک زصد نگار حکیم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم

یہ قصیدہ مارچ ۱۸۳۵ء کی تصنیف ہے۔ اس لئے اُن کے بےضابطہ تعلقات ۱۸۳۵ء سے قبل بھی ہوں گے لیکن یہ تعلقات مختلف تقاریب میں شرکت تک محدود تھے۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ کے سالِ جلوس کے موقع پر مرزا نے جو فارسی قصیدہ لکھا تھا اس میں بھی "قربِ شاہ" کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لکھتے ہیں:

خواہیم قربِ شاہ ولیکن دریں مراد
عبرت زنامرادیٔ سنجر گرفتہ ایم

معلوم ہوتا ہے کہ ذوق اور ان کے حلقے کے لوگ مرزا کی دال نہ گلنے دیتے تھے۔ اور بادشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مرزا کے دوسرے قصائد کا انداز بھی معذرت آمیز ہے۔ اور اکثر میں دربار سے دوری کی شکایت پائی جاتی ہے۔ شاہی

ملازمت سے منسلک ہونے کے بعد بہادر شاہ کی مدح میں جو مرزا کا پہلا فارسی قصیدہ ہے اس میں مرزا اپنی وفاداری اور عقیدت مندی کا اسطرح یقین دلانا چاہتے ہیں ؎

گفتم حدیث دوست بقراں برابر است
نازم بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابر است

## مرزا کی پہلی تنخواہ۔

مرزا جب ملازمت شاہی سے منسلک ہوئے تو اس وقت قلعہ کے ملازمین کو ماہ بماہ کے بجائے چھ ماہ کی اکٹھی تنخواہ ملا کرتی تھی۔ مرزا بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ انھوں نے یہ پہلے چھ مہینے بڑی مشکل سے گزارے اور آخر فیصلہ کرلیا کہ اگر ماہ بماہ تنخواہ ہوگئی تو خیر ورنہ تاریخ نگاری کی اس خدمت کو سلام۔

۲؍ جنوری ۱۸۵۱ء کو لکھتے ہیں:

"اب چھ مہینے پورے ہو چکے۔ جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک، اب میں دیکھوں یہ ششماہہ مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر ماہ بماہ کر دیں گے تو تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا سلام۔ ابھی بابر کا حال حضور میں بھی نہیں بھیجا۔ کل مسودہ تمام ہوا۔ صاف ہو رہا ہے۔ اب صاف کر کر دے دوں گا اور ماہ بماہ کی استدعا کروں گا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی۔ اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا۔ اس سبب سے فرصت تم کو لکھنے کی نہ ہوئی۔"

آخر مرزا نے بادشاہ کی خدمت میں ایک منظوم گزارش پیش کی۔ فرماتے ہیں:

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ ؛ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

اس پر ماہ بماہ تنخواہ ملنے کا حکم جاری ہو گیا اور مرزا نے تاریخ نویسی جاری

رکمی۔ یہ درخواست مرزا کی جانب سے جنوری ۱۸۵۱ئہ میں کی گئی ہوگی۔ ........ اور انھیں پہلا اور آخری ششماہہ وسط جنوری ۱۸۵۱ئہ کی کسی تاریخ میں ملا ہوگا۔

بادشاہ کی کمزوری کی وجہ سے ملازمین شاہی خوب ہاتھ رنگا کرتے تھے۔ اور اسی کشش کے باعث بادشاہ کو بڑی بڑی رقمیں بطور نذرانہ موصول ہو جاتیں۔ شاہی خزانے کے کارکن تھوڑا سا روپیہ دے کر ملازمین سے پوری تنخواہ کی رسید کرا لیا کرتے تھے لیکن غالب کو کوئی تین سو روپے مل گئے ہوں گے۔

## قلعہ میں حاضری۔

شاہی ملازم کی حیثیت سے مرزا کے لئے ضروری تھا کہ اگر وہ روز نہیں تو ہفتہ میں کم از کم دو تین بار ضرور قلعہ میں آیا کریں۔ لیکن اس میں بھی کسی قسم کی سختی نہ تھی۔ بعض اوقات مرزا تین تین دن تک متواتر قلعہ نہ جاتے تھے پھر بھی جس روز جانا ہوتا تھا اس روز وقت کا خاص طور پر لحاظ رکھتے اور اگر اس وقت کوئی ملنے بھی آتا تو نہ ملتے اور سوار ہو کر چلے جاتے۔ جن دنوں بادشاہ دربار کرتے مرزا کو آٹھ نو بجے صبح جانا ہوتا تھا۔ دوپہر کو واپسی ہوتی اور اگر پتنگ بازی کی سیر کے لئے بھی فرمائش ہو جاتی تو سہ پہر کو جاتے اور رات کو واپس آتے۔ مرزا نے یہ سب کیفیت بڑے دلچسپ پیرائے میں اس طرح بیان کی ہے:

"بیس بائیس روز سے حضور والا روز دربار
کیا کرتے ہیں۔ آٹھ نو بجے جاتا ہوں۔ بارہ بجے آتا ہوں۔
یا روٹی کھانے میں ظہر کی اذان ہوتی ہے یا ہاتھ دھوتے ہیں۔
سب ملازمین کا حال یہی ہے اور کوئی روٹی کھا کر جاتا ہوگا۔
مجھ سے بعد کھانا کھانے کے چلا نہیں جاتا۔ یہ تو جو کچھ تھا

سو تھا۔ پرسوں سے ازراہ عنایت حکم دیا ہے کہ شام کو
رہنے میں لب دریا پتنگ بازی ہوتی ہے تو بھی سلیم گڈھ
آیا کر۔ خلاصہ یہ کہ صبح کو جاتا ہوں۔ دوپہر کو آتا ہوں۔
کھانا کھا کر پانچ چھ گھڑی دم لے کر جاتا ہوں۔ چراغ جلے
آتا ہوں۔ بھائی تمہارے سر کی قسم رات کو مزدوروں کی
طرح تھک کر پڑتا ہوں۔"

## بادشاہ کی ہمراہی۔

بہادر شاہ غالب پر ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کے باعث اس قدر مہرباں ہو گئے تھے کہ انھیں اپنے ساتھ صرف عیدگاہ ہی نہیں بلکہ خواجہ صاحب اور قطب صاحب کی درگاہ بھی لے جاتے تھے۔ مرزا خود بھی اپنا جانا ضروری سمجھتے تھے لیکن اگر پھوڑے پھنسیوں کی زیادہ تکلیف ہوتی تو نہ جاتے۔ فروری ۱۸۵۱ء کے آخر میں مرزا بادشاہ کے ساتھ خواجہ صاحب کی درگاہ گئے ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں:

"ان دنوں میں حضور والا حضرت خواجہ صاحب
کی درگاہ گئے ہوئے تھے اور احقر العباد بھی ساتھ گیا تھا چنانچہ
آپ کا نوازشنامہ جو میرے خط کے جواب میں تھا۔ وہ میرے
آدمیوں نے وہیں درگاہ میں میرے پاس پہنچایا تھا۔"

## ریختہ کی فرمائش۔

بہادر شاہ مرزا سے اکثر ریختہ کا تقاضا کرتے رہتے تھے اور مرزا کی بھی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ہر دفعہ ایک نئی غزل پڑھیں۔ اس کا اظہار ایک جگہ اسطرح فرمایا ہے:

"ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر

ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں۔ سو وہ کبھی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں۔ نئی غزل کہہ کرلے جاتا ہوں آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے۔ کل یا پرسوں جاکر پڑھوں گا۔"

## بادشاہ اور ولی عہد کی اُستادی۔

نومبر ۱۸۵۴ء میں ذوقؔ نے انتقال کیا۔ بہادر شاہ کو بہت رنج ہوا۔ اور سخن گوئی ترک کردی لیکن کچھ عرصے بعد غالب سے اصلاح لینی شروع کی۔ شہزادہ فتح الملک بھی مرزا کے شاگرد ہوئے اور چار سو روپے سالانہ مشاہرہ مقرر کیا لیکن مرزا ۲۷ جولائی ۱۸۵۶ء کو جب ولی عہد کی موت کا ذکر کرتے ہیں تو سر دست دس روپے ماہوار کا نقصان بتاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سلطنت سے ان کا تعلق بادشاہ کے دم تک ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ تم کو یاد رہے کہ ولی عہد کے مرنے سے مجھ پر بڑی مصیبت آئی۔ بس اب مجھ کو اس سلطنت سے تعلق بادشاہ کے دم تک ہے۔ خدا جانے کون ولی عہد ہوگا۔ میرا قدر شناس مر گیا۔ اب مجھ کو کون پہچانے گا۔ اپنے آفریدگار پر تکیہ کئے بیٹھا ہوں۔ سر دست یہ نقصان کہ وہ زین العابدین کے دونوں بیٹوں کو میوہ کھانے کو دس روپے مہینہ دیتے تھے اب وہ کون دے گا۔"

غالب کے استادِ شاہ مقرر ہونے کی تاریخ اور اس کی پوری تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔

## بادشاہ کی بیماری، تشیع کا اتہام اور مثنوی۔

بہادر شاہ عین عید کے روز ۸ر جولائی ۱۸۵۳ء کو بیمار ہوئے۔ ۲۱ر اگست ۱۸۵۳ء کو مرزا نے بادشاہ کی بیماری کا اسطرح ذکر کیا ہے :

"بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو۔ اور اگر تم نے پوچھا ہی تو میں کیا لکھوں۔ دست موقوف ہو گئے مگر کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ تپ جاتی رہی مگر گاہ گاہ حرارت ہو جاتی ہے۔ ہچکی اس شدت کی نہ رہی، گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکار سی آجاتی ہے ہوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں۔ اسی ہیئت سے برآمد بھی ہوتے ہیں قلعہ ہی قلعہ میں پھر کر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصور کیجئے، اور مشہور بھی یوں ہی ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے۔ بہرحال جب تک سلامت رہیں غنیمت ہے۔"

اس اقتباس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بہادر شاہ کو دست بھی آتے تھے۔ بخار بھی تھا۔ سینے میں جلن کے ساتھ ساتھ شدت کی ہچکی بھی لگی تھی۔ مرض کی یہ صورت کافی خطرناک تھی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جب کسی طرح آرام نہ ہوا تو مرزا حیدر شکوہ نے درگاہ حضرت عباس (لکھنؤ) میں علم چڑھانے کی منت مانی اور ان کی صلاح سے بادشاہ کو خاک شفا دی گئی جس سے صحت ہو گئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے بادشاہ سے روپیہ منگوا کر بڑی دھوم دھام سے مجتہد العصر کے ہاتھوں علم چڑھوا دیا۔

پروفیسر مسعود حسن مرزا حیدر شکوہ کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بہادر شاہ نے بیماری کی حالت میں ایک خواب میں خود کو حضرت عباس کی درگاہ میں علم چڑھاتے ہوئے دیکھا۔ صحت ہوئی تو ایک سونے کا علم بنوا کر مرزا حیدر شکوہ کے بھائی

مرزا نورالدین کے ہاتھ لکھنؤ بھیجا اور جب مرزا حیدر شکوہ دہلی آئے تو خود اس خواب کا حال سنایا اور مجتہد العصر سلطان العلما مولوی سید محمد صاحب کے نام ایک خط لکھ کر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت بھیجا اور تاکید کی کہ علم جلد چڑھا دیا جائے۔ آخر ۲ر ربیع الاول ۱۲۷۰ھ مطابق ۳ر دسمبر ۱۸۵۳ء کو مجتہد العصر نے وہ طلائی علم بڑے تزک و احتشام کے ساتھ حضرت عباس کی درگاہ میں چڑھا دیا۔

۱۲ر اگست ۱۸۵۳ء کے خط کا جو اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ اس سے افاقہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ کی طبیعت سنبھلتی رہی ہوگی اور وہ آخر اگست تک اچھے ہو گئے ہوں گے۔ اس طرح بادشاہ کم از کم سات ہفتے بیمار رہے۔ مرزا ۲ر ستمبر کو لکھتے ہیں:

"بادشاہ اچھے ہو گئے۔ غسل صحت کرنے کی دیر ہے۔
غسل صحت کا دربار ہوا اور میں نے مبارکباد کا قصیدہ یا قطعہ پڑھا اور رخصت لی اور ڈاک گاڑی میں بیٹھا اور کول پہنچا اور وہاں آٹھ پہر رہا اور آگے کو روانہ ہو گیا۔"

۵ر اکتوبر اور ۶ر اکتوبر ۱۸۵۳ء کو جو مرزا نے خط لکھے ہیں ان سے بھی یہی ترشح ہوتا ہے کہ بادشاہ کا محرم کے بعد غسل صحت کرنے اور جشن منانے کا ارادہ تھا۔ لیکن عشرہ محرم گزرنے کے بعد بھی جشن غسل صحت نہ ہوا۔ مرزا ۷ر نومبر کو لکھتے ہیں:

"جشن غسل صحت، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ سنتے ہیں کہ ہوگا۔ قصیدہ کہہ رکھا ہے۔ اگر ہوا تو پڑھ دوں گا اور وہ سراج الاخبار میں چھاپا جائیگا۔"

ممکن ہے بہادر شاہ چاہتے ہوں کہ منت پوری کرنے کے بعد غسل صحت کریں۔ ۲ر ربیع الاول ۱۲۷۰ھ مطابق ۳ر دسمبر ۱۸۵۳ء کو علم حضرت عباس کی

درگاہ میں چڑھایا گیا تھا۔ اس لئے بہادر شاہ نے اس کے بعد کسی روز غسل صحت کیا ہو گا۔

علم چڑھانے کے اس واقعہ سے بادشاہ کا شیعہ ہو جانا مشہور ہو گیا۔ دہلی کے علماء و مشائخ نے بادشاہ کو دھمکی دی کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو جمعہ اور عیدین کی نماز کے خطبوں سے ان کا نام نکال دیا جائے گا۔ بہادر شاہ اصل حقیقت سے مکر گئے اور کہا کہ مرزا حیدر شکوہ نے اپنے مذہب کے مطابق جو منت مانی تھی اسے پورا کیا ہے۔ مزید برآں اس کے جواب میں مرزا سے بجو سٹو اشعار کی ایک مثنوی لکھائی جس میں کافی سخت کلامی سے کام لیا گیا۔ اس کے جواب الجواب میں جو مثنویاں لکھی گئیں وہ اور بھی سخت ہوتی گئیں۔ مثنوی دمغ الباطل جسے مولانا حالی نے مرزا کی مثنوی کا عنوان بتایا ہے شیخ امام بخش صہبائی کی مثنوی کا عنوان تھا، جو مثنوی شیعان علی کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

پروفیسر مسعود حسن صاحب کا یہ خیال کہ غالب کی زیر بحث مثنوی کا کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا درست معلوم ہوتا ہے۔ علم ۳ دسمبر کو چڑھایا گیا تھا۔ مرزا ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء کو تحریر فرماتے ہیں:

> "وہ مثنوی اور اعلام نامہ میں نے تمہارے پاس بھجوا دیا ہے۔ وجہ یہ کہ جب حضور نے حکم دیا کہ عمائد اہل سنن جو اطراف و جوانب دہلی میں ہیں ایک ایک نقل ان کو بھیجی جائے۔ میں نے دفتر میں بقید علی گڑھ کول مفتی صدرالدین خاں صاحب کا اور تمہارا نام لکھوا دیا۔"

۳ دسمبر ۱۸۵۳ء سے لے کر ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء تک ان چالیس دن میں بہادر شاہ کا شیعہ ہو جانا بھی مشہور ہوا اور مرزا نے بہادر شاہ کی جانب سے اعلام نامہ

اور یہ مثنوی بھی لکھ کر اطراف وجوانب میں بھیجدی۔

اعلام نامہ سے غالباً وہ کتاب مراد ہے جو بہادر شاہ کی جانب سے "حقیقت مذہب اہل سنت والجماعت" کے نام سے شائع ہوئی۔

## اردو دیوان۔

مرزا غالب کا اردو دیوان سب سے پہلے ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱-۴۲ء میں فخر المطابع سے شائع ہوا۔ اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ بھی اور ۱۰۷۲ اشعار پر مشتمل تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۵ء میں اکتوبر سے پیشتر شائع ہوا اور اکتوبر تک ختم ہو چکا تھا۔ اشعار کی تعداد ۱۷۹۳ تھی۔ ترتیب میں سب سے پہلے قطعات، اس کے بعد قصائد پھر غزلیات اور آخر میں رباعیات شامل تھیں۔ مرزا غالب نے اس ایڈیشن کا ایک نسخہ منشی نبی بخش کو بھیجا تھا نبی بخش نے اسے اپنے اور کسی دوست کی نذر کر دیا اور مرزا سے ایک اور نسخہ کی فرمائش کی۔ مرزا نے غالباً انکار کر دیا جس سے نبی بخش بہت آزردہ ہوئے۔ ۳ راکتوبر ۱۸۵۵ء کو لکھتے ہیں:

> "تمہارا غصہ میرے سر آنکھوں پر۔ واللہ یہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ البتہ یہ خیال تو مجھ کو آیا کہ دیکھو بھائی کو میرے کلام سے انس نہیں ورنہ ایسی چیز کو ہاتھ سے نہ دیتے نہ یہ کہ اس کا دینا باعث اس کا ہوا کہ اور نسخہ تم کو نہ بھیجوں۔ چھاپے خانے والوں نے سوداگروں کے ہاتھ بطریق پیشگی سو سو دو دو سو مجلد بیچ ڈالے تھے۔ چھاپے خانے والوں سے جو میں نے منگایا تو مجھ کو نہ ملا۔ اب متفرق کتاب فروشوں سے کہہ دیا ہے۔ کوئی نسخہ ہاتھ آیا اور میں نے بھیجا۔ میرا تو یہ

حال ہے کہ جو کچھ میں نے کہا پھر جب تک تمہارے پاس نہ بھیج لوں۔ مجھ کو چین نہیں آتا۔"

اردو دیوان کا تیسرا ایڈیشن دہلی میں مطبع احمدی میں ۲۸ جولائی ۱۸۶۱ء کو چھپا اور چوتھا ایڈیشن جون ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ غالب کی زندگی میں غالباً اس کے بعد اردو دیوان کا کوئی اور ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

## قصائد۔

عیدین اور دوسری تقاریب پر متوسلین شاہی کا بادشاہ کو نذر دینا آداب شاہی میں داخل تھا۔ مرزا بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اکثر قصیدہ یا کوئی مدحیہ مثنوی پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن کبرسنی اور طویل علالت کے باعث طبیعت زیادہ کاوش پر مائل نہ ہوتی تھی۔ اس لئے بعد میں قطعات و رباعیات پر نوبت آ گئی۔ ایک بار حکیم احسن اللہ خاں کے اصرار پر مدحیہ مثنوی لکھی۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۵ء کو منشی نبی بخش سے اس حقیقت کا اسطرح اظہار کرتے ہیں:

"میں نے قصیدہ لکھنا موقوف کیا۔ موقوف کیا کیا۔ مجھ سے لکھا ہی نہیں جاتا۔ قطعہ یا رباعی عیدین کو لکھ کر نذر کر دیا کرتا تھا۔ اب کے حکیم صاحب نے بہت شدت کی اور کہا کہ صاحب یہ تو نذر عید نہ ہوئی جیسے معلّم لڑکوں کو عیدی کے دو شعر لکھ دیتے ہیں۔ یہ تو ویسی عیدی ہے۔ ناچار میں نے یہ مثنوی کی روش پر چالیس بیالیس بیت لکھ کر نذر کر دی۔ اگر اپنے دیوان کے حاشیے پر یہ شعر چڑھا ہے ہوں تو قسم لے لو۔ یہ ہے کیا جو میں تم کو بھیجتا۔ افسوس ہے کہ تم کو میرے حال کی خبر نہیں اگر دیکھو تو جانو ۔

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

کوئی دم ایسا نہیں کہ مجھ کو دم واپسیں کا خیال نہ ہو۔ ساٹھ برس کا ہو چکا۔ اب کہاں تک جیوں گا۔ غزل، قصیدہ، قطعہ رباعی، فارسی اردو دس بارہ ہزار بیت کہہ چکا۔ اب کہاں تک کہوں گا۔ زندگی بری بھلی جس طرح بنی کاٹی۔ فکر یہ ہے کہ دیکھیں موت کیسے ہوتی ہے۔ اور بعد موت کے کیا درپیش آتا ہے ؎

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا "

## چار روپے۔

ان خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے کم از کم ایک بار نقدی کی شکل میں بادشاہ کو نذر دی۔ لکھتے ہیں:

"عید کے دن بادشاہ کے ساتھ عید گاہ نہ جا سکا دوسرے دن لنگ لنگاں قلعہ گیا اور عید کی نذر دی۔"

ایک اور خط سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو جب کبھی نقدی کی شکل میں نذر دینے کا اتفاق ہوتا تھا تو وہ چار روپے نذر دیتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"عید کی مثنوی صرف روپے بچانے کے لئے تھی۔ یعنی اگر وہ نہ ہوتی تو مجھ کو چار روپے نذر دینے پڑتے۔ جب مسودوں میں نہ رکھوں اور دیوان میں نہ لکھوں تو حضرت کو کیوں بھیجوں۔"

مرزا غالب بادشاہ کے پچاس روپے ماہوار کے ملازم تھے۔ تقریباً چھ سات روپے

ماہوار بلیماران سے قلعہ تک سواری میں خرچ ہو جاتا تھا اس لئے انھیں ایک مہینے میں مزید آٹھ روپے بادشاہ اور ولی عہد کی نذروں میں خرچ کرنا بہت گراں گزرتا ہوگا۔

## قلعہ معلیٰ اور مشاعرے۔

مرزا کے فارسی مکاتیب میں چھ مشاعروں کا حوالہ پایا جاتا ہے۔ اردو مکتوبات میں بھی ایک جگہ قلعہ کے مشاعرے کا ذکر آیا ہے لیکن بالکل سرسری۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی نے اس مشاعرہ کا مصرعہ طرح مانگا تھا لیکن مرزا نے ٹال دیا اور مصرعہ نہ بھیجا۔ ان خطوط کی مدد سے کچھ اور مشاعروں کا پتہ چل سکا ہے۔ فارسی مکاتیب میں جن چھ مشاعروں کا ذکر آیا ہے۔ ان کی مختصر کیفیت مولانا غلام رسول مہر نے "غالب" میں لکھی ہے۔ ان میں سے پہلے چار مشاعروں کا قلعہ میں منعقد ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ پانچواں اور چھٹا یہ دونوں مشاعرے قلعہ میں ہوئے۔ پانچواں ۲۵ر فروری ۱۸۵۳ء کو اور چھٹا ۲ر فروری ۱۸۴۸ء کو ہوا۔

بہادر شاہ ہر مہینے میں دو بار مشاعرے کرتے تھے اور اردو اور فارسی کی دو طرحیں دی جاتی تھیں۔ مرزا لکھتے ہیں:

"یہاں بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ ہر مہینہ میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے۔ پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور فارسی کا ایک مصرعہ اور ریختہ کا ایک مصرعہ طرح کرتے ہیں۔"

## پہلا مشاعرہ۔

یہ مشاعرہ بیس فروری ۱۸۴۸ء کو منعقد ہوا۔ مرزا ۲۱ر فروری ۱۸۴۸ء کو لکھتے ہیں:

"کل رات شہزادگان تیموریہ میں سے ایک نے

مشاعرہ منعقد کیا تھا اور شعرا کو غزلخوانی کی دعوت دی تھی۔ اگرچہ میں نے اس میں بہت دل لگایا لیکن طبیعت ریختہ کہنے پر مائل نہ ہوئی۔ لیکن جس روز کی شب میں مجھے اس انجمن میں شرکت کرنی تھی تو خاص اس وقت جب کہ میں سوار ہو کر جا رہا تھا چند اشعار خود بخود دلِ غمزدہ سے نکل آئے چنانچہ ان اشعار کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ اسی زمین میں غزل کہہ کر مجھے بھیجدیں۔"

## دوسرا مشاعرہ۔

یہ مشاعرہ مئی یا جون ۱۸۵۲ء کو منعقد ہوا۔ مرزا منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

"بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و میرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزادگانِ تیموریہ میں سے لکھنؤ سے زمین لائے حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھ کو بھی حکم دیا۔ سو میں حکم بجالایا اور غزل کہی۔"

غزل کا مطلع ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

غالباً اسی کے متعلق غالب نے قاضی عبدالجمیل کو لکھا تھا:

"قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجئے گا اور اس پر

غزل کہہ کر کہاں پڑھے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں
اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو
دوام کہاں۔ کیا معلوم اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ
نہ ہو۔"

تیسرا مشاعرہ۔

یہ مشاعرہ ۲۵ ر فروری ۱۸۵۳ء کو ہوا۔ مرزا میر مہدی مجروح کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں کہ جمعہ کی شب کو بادشاہ کا حکم پہنچا کہ سب شاعر قلعہ میں جمع ہوں۔ شہزادے اور دوسرے لوگ اتنے جمع ہوئے کہ نشست گاہ میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ پہلے ذوق نے بادشاہ کی غزل سنائی۔ پھر شہزادہ خضر سلطان نے اپنی غزل پڑھی۔ پھر دوسرے شہزادوں نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے بھی اپنی غزل پڑھی اور ایک بہانے سے اٹھ کر گھر آگیا۔ دکانیں کھلی تھیں۔ چراغ جل رہے تھے۔ شراب پی کر سو گیا۔ صبح قلعہ گیا۔ شہزادہ خضر سلطان۔ میرزا حیدر شکوہ، مرزا نور الدین، اور مرزا عالی بخت عالی کی رات والی غزلیں سنیں۔ اپنی غزل سنائی۔ وہیں معلوم ہوا کہ مشاعرہ رات بھر جاری رہا اور آخر میں ذوق نے غزل پڑھی۔

چوتھا مشاعرہ۔

یہ مشاعرہ ۱۰ ر اپریل ۱۸۵۳ء کو ہوا۔ بادشاہ نے ایک فارسی اور ایک ریختہ کا مصرعہ طرح دیا۔ فارسی کا مصرعہ تھا ؎

زیں تماشا گاہ گریاں مے رود

ریختہ کا مصرعہ تھا ؎

خار عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے

مرزا لکھتے ہیں:

"میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا ریختہ اس طرح میں سے ایک طرح نکال کر لکھا۔ وہ تینوں غزلیں تم کو لکھتا ہوں۔"

## پانچواں مشاعرہ۔

یہ مشاعرہ جولائی ۱۸۵۳ء میں ہوا ہوگا۔ مرزا جولائی ۱۸۵۴ء کو لکھتے ہیں:

"تم کس ریختہ کو نیا سمجھتے ہو۔ کہا کئے اور ہوا کئے۔ یہ غزل پرانی ہے۔ دریا مرے آگے، صحرا مرے آگے۔ اس پر بھی سال گزر چکا۔ قلعہ مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

## شاہان اودھ کی مدح۔

مرزا غالب اور شاہان اودھ کے روابط کا سلسلہ اس فارسی قطعہ سے ملتا ہے جو نصیر الدین حیدر کی شادی کے موقع پر لکھا گیا تھا۔ کلیات نظم فارسی میں اس قطعہ کے علاوہ پانچ قصائد بھی شامل ہیں۔ ان میں پہلا نصیر الدین حیدر کی مدح میں ہے جو نومبر ۱۸۳۲ء سے قبل پیش ہوا۔ اس کے صلہ میں غالب کو پانچ ہزار روپے

---

ح ا نصیر الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں تخت نشین ہوئے ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا تو محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے ۱۸۴۲ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا تو امجد علی شاہ نے حکومت سنبھالی ۱۸۴۷ء میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ تو واجد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اور ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو معزول ہوئے۔

دینے منظور ہوئے جو متوسط کھا گئے اور مرزا کو ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔ دوسرا قصیدہ امجد علی شاہ کی مدح میں ہے۔ تیسرا قصیدہ بھی امجد علیشاہ کی مدح میں لکھا گیا تھا لیکن بعد ازاں اس میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کا نام داخل کر دیا گیا اور واجد علی شاہ ہی کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ چوتھا اور پانچواں قصیدہ بھی واجد علی شاہ کی مدح میں ہے۔

مرزا غالب نے واجد علی شاہ کے دربار میں سب سے پہلا قصیدہ مئی ۱۸۵۵ء میں قطب الدولہ کی وساطت سے پیش کیا۔ مولانا ضمیر نے بادشاہ کو پڑھ کر سنایا حکم ہوا کہ پھر کسی وقت صلہ کا مسئلہ درپیش ہو لیکن فیصلہ سے پہلے ہی قطب الدولہ نکالے گئے اور وہ قصیدہ معہ عرضداشت غالب کے پاس واپس آ گیا۔ اس کے بعد دو قصائد مرزا نے مجتہد العصر کی وساطت سے پیش کئے جن کے صلے میں ایک بار چودہ پارچہ کا خلعت اور دوسری بار ملبوس خاص و رومال و دو شالہ ملا۔ اگر مرزا نے واجد علی شاہ کی مدح میں سوائے ان تین قصائد کے جو کلیات نظم فارسی میں شامل ہیں کوئی اور قصیدہ نہیں لکھا تو ان میں ایک قصیدہ مئی ۱۸۵۵ء میں پیش ہوا ہوگا۔ دوسرا جولائی یا اگست ۱۸۵۵ء میں اور تیسرا ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کے بعد۔

مرزا ۱۵ اگست ۱۸۵۵ء کو منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

"مرزا یوسف علی خاں کہتے تھے کہ آپ اس قصیدے کے طالب ہیں جو بطریق مرثیہ لکھا گیا ہے اور اس میں شاہ اودھ کی مدح مندرج ہے۔ اگر ہاتھ آ گیا تو چھاپے کا ورنہ قلمی بھیج دوں گا۔ بادشاہ اودھ تک پہنچ گیا ہے۔ اگر کچھ ظہور میں آیا تو وہ بھی تم کو لکھوں گا۔"

پھر ۱۵ ستمبر ۱۸۵۵ء کو لکھتے ہیں:

"ہاں صاحب! یوسف علی خاں نے لکھنو والے

قصیدہ کا چھاپا جہاں خاں کی معرفت تم کو بھیجا ہے۔ نہیں جانتا جہاں خاں کون ہے۔ یوسف علی خاں کی زبانی لکھتا ہوں۔ پس اگر پہنچ گیا تو خیر۔ ورنہ تم جہاں خاں سے مانگ لو۔"

مرزا کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ جولائی یا اوائل اگست میں نہ صرف پیش ہوا بلکہ چھپ بھی گیا تھا اور مرزا اس کے فیصلہ کے منتظر تھے۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

"بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی
که در روے آدم آل عیار ساربان بینی
بہ بینی سر خوش خواب عدم عباس غازی را
نہ مشکش درخم بازو نہ تیرش در کماں بینی
نہ مے بینی کہ چوں جاں را دادِ زبیدادِ بدخواہاں
علی اکبر کہ ہمچو بخت بدخواہش جواں بینی
چہ دنداں در جگر افشردہ باشی کاندراں وادی
حسین ابن علی را در شمارِ کشتگاں بینی"

غالب خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ کی سرکار سے ان کے لئے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپے سالانہ مقرر ہوئے لیکن وظیفہ مقرر ہونے کے بعد سلطنت اودھ دو برس سے زیادہ قائم نہ رہی۔

ممکن ہے مذکورہ بالا قصیدہ کے صلہ میں مرزا کا پانسو روپے سالانہ وظیفہ مقرر ہو گیا ہو۔ ۱۵ اگست ۱۸۵۴ء کے مکتوب کا انداز بتا رہا ہے کہ اس وقت تک کوئی وظیفہ مقرر نہ ہوا تھا اور مرزا آس لگائے بیٹھے تھے۔

## جے پور سے صلہ یابی۔

دسمبر ۱۸۵۲ء میں مرزا نے جانی جی کے ایما پر اپنا اردو دیوان بہت تکلف سے لکھوایا اور انھیں کی وساطت سے اواخر دسمبر ۱۸۵۲ء یا اوائل جنوری ۱۸۵۳ء میں کسی تاریخ کو مہاراجہ جے پور کی خدمت میں پیش ہوا۔ راجہ صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے اور اکثر اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو تقریباً دو ہزار روپے دلانے کی امید دلائی گئی تھی۔ لیکن مارچ ۱۸۵۳ء میں ان کے لئے پانسو روپے نقد اور خلعت تجویز ہوا اور اسی مہینے کے آخری ہفتہ میں راجہ نے انتقال کیا۔ مرزا تک پانسو روپے کی یہ رقم ہر دیو سنگھ کے ہاتھوں ایک ہنڈوی کے ذریعے پہنچنی تھی۔ جب سے مرزا کو اس رقم کی منظوری کا علم ہوا تھا اس وقت سے اس کی وصولیابی کے لئے مضطرب تھے۔ اور منشی ہر دیو سنگھ کو بخوشی پچیس روپے دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جانی جی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ ہر دیو سنگھ کے انتیس [۲۹] روپے خرچ ہو گئے ہیں تو مرزا نے لکھا کہ چوّن [۵۴] روپے اس میں سے مجرا کر کے باقی کی ہنڈوی کر دی جائے۔ لیکن جانی جی نے یہ روپیہ ہر دیو سنگھ کو اپنے پاس سے ادا کر دیا اور پورے پانچ سو روپے کی ہنڈوی بھجوائی۔ یہ ہنڈوی اور پچیس روپے کی رسید مرزا کو ۱۲ جون ۱۸۵۳ء کو موصول ہوئی۔

## رامپور سے تعلق۔

نواب سید غلام محمد خاں جب ریاست کی داخلی کشمکش کے باعث رامپور چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو پہلے کچھ عرصے لکھنؤ میں اور پھر دہلی میں فروکش ہوئے۔ ان کے تین فرزند تھے۔ نواب سید محمد سعید خاں، نواب سید عبداللہ خاں اور نواب سید عبدالرحمٰن خاں۔ نواب سید سعید خاں کے بیٹے یوسف علیخاں

نے قیام دہلی کے دوران میں غالب سے فارسی پڑھی تھی۔ ۱۸۵۵ء میں جب انھوں نے عنان حکومت سنبھالی تو غالب نے پرانے روابط کے پیش نظر قطعہ جلوس نواب یوسف علی خاں کی خدمت میں بھیجا۔ اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کو مولانا فضل حق خیرآبادی کی تحریک پر ایک قصیدہ معہ عرضداشت بھیجا۔ مولانا فضل حق پہلے ہی نواب کو راضی کر چکے تھے۔ فوراً غالب کے شاگرد ہو گئے اور ڈھائی سو روپے بطور شیرینی ارسال کئے۔ اس طرح پرانے تعلقات کی تجدید ہو گئی۔ نواب صاحب اشعار کے ساتھ وقتاً فوقتاً روپے بھی بھیجتے رہتے تھے۔ غدر کے ہنگامہ کی وجہ سے جب قلعہ کی تنخواہ بند ہو گئی اور خاندانی پنشن التوا میں پڑ گئی تو نواب یوسف علی خاں نے جو غالب کو وظیفہ خوار کے بجائے ایک گرانمایہ دوست سمجھتے تھے سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ اسکے علاوہ بھی نواب صاحب موصوف روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد جب نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے تو انھوں نے بھی یہ وظیفہ جاری رکھا۔ مرزا دوبار رامپور گئے۔ قیام رامپور کے زمانہ میں غالب کو سو روپے اور الگ ملتے تھے۔ یعنی بقول غالب اگر رامپور میں رہیں تو دو سو روپے ماہوار اور دہلی میں رہیں تو سو روپے ماہوار۔

## علیگڈھ جانے کا ارادہ۔

مرزا غالب ہمیشہ سے سیر و سیاحت کو دوست رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں کل چار سفروں کا ذکر آیا ہے۔ پہلا سفر کلکتہ، دو سفر رامپور کے اور چوتھا سفر میرٹھ کا۔ ان کے علاوہ مارہرہ، کالپی، فرخ آباد، گوالیار اور انبالے جانے کے ارادوں کا پتہ چلتا تھا۔ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کے دور میں تین چار بار سفر کا ارادہ کیا

اگست ۱۸۵۰ء میں سوچا کہ جاڑے میں علیگڈھ ہو آئیں۔ پھر مارچ ۱۸۵۱ء میں نیت کی کہ آموں کے موسم میں کول ہوتے ہوئے مارہرہ چلے جائیں۔ اس کے بعد جون ۱۸۵۳ء میں مصمم ارادہ کر لیا کہ عید کے بعد یعنی جولائی ۱۸۵۳ء میں کول ہوتے ہوئے باندہ ہو آئیں۔ مرزا نے اپنے پہلے دو ارادے خود فسخ کرئے یا کچھ مجبوریاں لاحق ہوگئیں اس کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ تیسرا ارادہ جو آموں کی فصل میں کر لیا گیا تھا بڑا مصمم ارادہ تھا۔ لیکن عین عید کے روز یعنی ۸ رجولائی ۱۸۵۳ء کو بادشاہ بیمار ہو گئے شاہی ملازم ہونے کی حیثیت سے مرزا بغیر اجازت نہ جا سکتے تھے۔ اور ان حالات میں رخصت طلب کرنا مناسب نہ تھا۔ جے پور سے پانسو روپے وصول ہو چکے تھے اور قرضہ ادا کرنے کے بعد بھی ان کے پاس کچھ روپیہ بچ رہا تھا اس لئے مصارف سفر کا انتظام بھی مشکل نہ تھا۔ مرزا کی مستعدی کے عالم کا اندازہ لگائیے:

"لیکن میرا ارادہ مدعا کہ غسل صحت کریں اور نذریں لیں اور میں رخصت لوں اور بہ سبیل ڈاک باندہ جاؤں دیکھیے کب تک حاصل ہو۔ ڈاک کا لطف آدھا رہ گیا یعنی وہ آم کہاں اور برسات کہاں۔ مگر خیر کول میں بھائی کا ملنا اور بچوں کا دیکھنا اور باندہ میں بھائیوں کا ملنا اور بچوں کا دیکھنا، یہ دیکھا چاہیے کب میسر ہو۔ اس بوڑھی ڈاڑھی پر اپنے فرزند کو کیا دم دوں گا۔ بھائی خدا کی قسم۔ یہ سفر میرے حسب دلخواہ اور موافق مزاج تھا اور ہے۔ مگر غور کرو کہ کیا اتفاق ہوا۔ اگر اور صورت بھی ہو جاتی تو بھی میں اب تک تمہارے پاس ہو کر باندہ کو روانہ ہوتا۔ کیا کروں اس صورت میں رخصت نہیں مانگی جاتی اور رخصت لئے بغیر جانا نہیں ہو سکتا۔"

مرزا نے جشن غسل صحت کا منعقد ہونا بعد محرم سنا تھا۔ اگرچہ محرم بھی یوں ہی گذر گیا لیکن انھوں نے اپنا ارادہ بدستور قائم رکھا۔ یہ جشن آخر نومبر یا دسمبر ۱۸۵۳ء میں ہوا ہوگا۔ اور مرزا رخصت لینے کی سوچ ہی رہے ہوں گے کہ بادشاہ کا شیعہ ہوجانا مشہور ہوگیا اور اس قضیہ میں مرزا کو بادشاہ کی طرف سے مثنوی اور اعلام نامہ لکھنا پڑا۔ آخر ان کے سفر کا یہ ارادہ بھی پورا نہ ہوسکا۔

## عارف کی بیماری اور داغ مفارقت۔

مرزا غالب کا جب کوئی اپنا بچہ نہ جیا تو زین العابدین خاں عارف کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ انھوں نے بھی جوانی میں داغ دیا۔ عارف کی موت کا غالب کے دل پر جو گہرا اثر ہوا اس کا وہ مرثیہ شاہد ہے جس کا مطلع ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس مرثیہ کا ایک ایک مصرعہ درد محبت سے بھرا ہوا ہے اور ایک ایک لفظ فلک پیر سے فریاد کرتا نظر آرہا ہے ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عارف کی وفات حرکت قلب کے بند ہوجانے یا کسی حادثے کے باعث واقع نہ ہوئی تھی بلکہ وہ ایک مدت تک بیمار رہے تھے۔ غالب سے بڑا قریبی تعلق تھا اس لئے یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ انھوں نے عارف کی بیماری کے متعلق کچھ نہ لکھا ہو۔ اب کسی حد تک یہ کمی پوری ہوگئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عارف اور ان کی اہلیہ دونوں اپریل ۱۸۵۱ء سے پہلے سے بیمار تھے۔ مرزا نشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

"کیا پوچھتے ہو زین العابدین خاں کا حال اور کیا کہوں
اس کی بی بی کا حال۔ پہلے اس کی حقیقت سنو۔ بھائی اس کو
ناگاہ رعاف ہوا۔ رعاف میں ناک سے لہو آتا ہے مگر اس کو
منہ سے لہو آیا۔ ناک سے تھوڑا اور منہ کا کیا حال تھا گویا مشک
کا دہانہ کھول دیا ہے۔ ایک ہفتہ میں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے آٹھ
دس سیر خون نکلا۔ سیاہ، بدبودار۔ توقع جینے کی باقی نہ رہی۔
اور سب نا امید ہو گئے۔ بارے خدا نے بچا لیا۔ اس کو تصور کیجئے
کہ تھا کیا۔ صرف استخوان و پوست رکھتا تھا۔ اب سوکھ کر کانٹا
ہو گیا۔ اگرچہ ہنوز صاحب فراش ہے۔ اور چلنا پھرنا تو کہاں
پلنگ پر سے اٹھ بھی نہیں سکتا مگر بیم ہلاک نہیں ہے۔

اس کی بی بی کا حال سنئے۔ تین مہینے سے کھانسی اور
تپ میں گرفتار ہے۔ خدا اس پر اور اس کے بچوں پر رحم
کرے اور اس کو بچا لے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر یوں سمجھو
کہ اگر یہ بچ جائے تو گویا مردہ جیا۔"

اس کے بعد پھر ایک خط میں ان دونوں کی افاقت کی اس طرح اطلاع
دیتے ہیں:

"زین العابدین خاں اچھا ہے۔ بی بی بھی اس کی
فرصت پاتی چلی ہے۔ مرض کی صورت خطرناک نہیں رہی۔
خدا چاہے تو صحت ہو جائے۔"

اس سے زیادہ عارف اور ان کی اہلیہ کی بیماری کا حال نہیں ملتا۔
مرزا کی ان تحریروں سے بھی صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جولائی ۱۸۵۱ء میں عارف

اور ان کی اہلیہ دونوں مہلک امراض میں مبتلا تھے اور دونوں بچ گئے۔ عارف کو وقتی طور پر افاقہ ہو گیا ہو گا کیونکہ ان کی موت کا فوری سبب خون کا استفراغ ہوا۔

## باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔

عارف کی وفات پر غالب ان کے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو بیٹا بنا کر اپنے گھر لے آئے تھے لیکن جب عارف کی والدہ بنیادی بیگم کا بھی انتقال ہو گیا تو باقر علی خاں بھی مرزا کے پاس چلا آیا۔ اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ باقر علی خاں کا بوجھ مرزا پر کب پڑا۔ اب یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ مرزا ۲۳ رجون ۱۸۵۵ء کو لکھتے ہیں:

"تم کو خبر دیتا ہوں کہ زین العابدین کی ماں یعنی دادی حسین علی خاں کی پنجشنبہ کے دن ۲۸ رمضان کو مر گئی زین العابدین کا بڑا لڑکا باقر علی خاں وہ بھی میرے پاس آ گیا۔ دیکھتے ہو بھائی چرخ ستمگر کیا شعبدہ بازی کر رہا ہے بوجھ پر بوجھ ڈال رہا ہے۔ زخم پر زخم مجھ پر لگا رہا ہے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ آمد وہی مصارف بڑھ گئے۔ اگر مثلاً بے مروتی اور خدا ترسی نہ کروں تو کہیے ان لڑکوں کو کس سے کہوں کہ تو اپنے لڑکوں کو سنبھال۔ مجھ میں مقدور نہیں۔ بہر حال چپ ہوں اور متحیر ہوں۔ خدا میری شرم رکھے۔"

ظاہر ہے باقر علی خاں مرزا کے پاس جون ۱۸۵۵ء میں آیا ہو گا۔ ممکن ہے یہ ان کی بیگم کا جبر ہو۔ ویسے بھی مرزا بعض اوقات مالی مشکلات کی وجہ سے تنگدل ہو جایا کرتے تھے۔

مرزا کو محبت تو باقر علی خاں سے بھی تھی لیکن حسین علی خاں کو بہت چاہتے تھے۔ ستمبر ۱۸۵۴ء میں جب یہ بخار میں مبتلا ہوا اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ کھانا

تک بند کر دیا گیا تو مرزا بے حد پریشان ہوئے جس کا اندازہ ۳ر اکتوبر، ۶ر اکتوبر، ۱۵ر اکتوبر اور نومبر ۱۸۵۴ء کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے حسین علی خاں تقریباً دو ماہ تک بیمار رہا۔

مرزا کو حسین علی خاں کی تعلیم کا بھی بہت خیال رہتا تھا جون ۱۸۵۴ء کو لکھتے ہیں:

"حسین علی آپ کو بندگی اور اپنے بہن بھائیوں کو علیٰ قدر مراتب سلام بندگی کہتا ہے۔ ا ب ج ح خ پڑھتا ہے۔ خدا میری شرم رکھ لے اور اس میں کوئی اس طرح کا قصور نہ رہ جائے جو لوگ مجھ کو نام رکھیں کہ کیا بری طرح پرورش کی۔"

حسین علی نے جون ۱۸۵۴ء میں پانچ برس کی عمر میں قاعدہ شروع کیا تھا۔ ستمبر ۱۸۵۴ء میں اسے بخار آگیا جس میں وہ تقریباً دو ماہ مبتلا رہا۔ مئی ۱۸۵۵ء تک لم یکن کے سورہ تک پڑھ چکا تھا۔ مرزا ۲۵ر مئی ۱۸۵۵ء کو لکھتے ہیں:

"حسین علی اچھا ہے۔ لم یکن کے سورہ تک پہنچ گیا ہے۔"

جون ۱۸۵۵ء میں باقر علی خاں بھی غالب کے پاس آگیا۔ جولائی ۱۸۵۵ء کو یہ دونوں بخار میں مبتلا ہوئے لیکن جلد ہی اچھے ہو گئے۔ اور مرزا کے ہاں پرورش پاتے رہے۔

رامپور کے سفر میں مرزا کے ساتھ رہے۔ کلام اور بعض دیگر اہم تفصیلات کے لئے حواشی ملاحظہ کیجئے۔

## غالب کے نوکر۔

مرزا ہمیشہ سے امیرانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اس لئے اُن کے ہاں نوکروں کی فراوانی رہتی تھی۔ خود مرزا کے لئے چار ملازم تھے۔ کلو داروغہ، مداری کلیان کہار اور غلام حسین۔ اندر گھر میں ایک مغلانی ملازم تھی جب وہ اگست ۱۸۵۶ء میں مر گئی تو دوسری مغلانی فوراً رکھ لی گئی۔ مرزا نے اپنے چاروں نوکروں میں کیا کیا کام بانٹ رکھے تھے اس کا تو شاید کبھی علم نہ ہو سکے۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ کلو اور کہار کا کام سودے سلف کا لانا اور خط پارسل لے جانا تھا۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء کے دور میں مرزا کے یہی ملازم تھے۔

## موسم اور غلّہ کا بھاؤ۔

مرزا کو جزئیات اور معمولی معمولی باتوں کو اپنے پرلطف انداز میں پیش کرنے کی جو عادت تھی آج اس کی بدولت ہم اس دور کی دلّی کی موسمی حالات اور غلہ کے بھاؤ کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگست ۱۸۵۰ء میں تپ و درد سر و اقسام امراض کی شدت تھی۔ ستمبر ۱۸۵۱ء میں گرمی شدت کی پڑ رہی تھی پھر کچھ ہوا بدلی اور بارش کی توقع کی جانے لگی۔ موسم کی تبدیلی کے باعث تپ و نزلہ و زکام پھیل رہا تھا۔ مئی ۱۸۵۱ء میں عجیب اتفاق ہوا کہ جیٹھ کے مہینے میں خوب بارش ہوئی اور اتنی ٹھنڈ ہو گئی کہ لحاف رضائیوں کی ضرورت پڑی۔ پھر جون ۱۸۵۳ء میں اتنی سخت گرمی پڑی کہ مرزا بول اٹھے کہ اس ساٹھ برس کی عمر میں یہ لو اور یہ دھوپ اور یہ تپش نہیں دیکھی۔ اس کے بعد مینھ برسا۔ یہ رمضان کا زمانہ تھا۔ مرزا روزہ رکھ کر روزہ بہلاتے رہے۔ اکتوبر ۱۸۵۳ء میں پھر ایسا اتفاق ہوا کہ جیٹھ اساڑھ جیسی گرمی پڑی۔ رات کو ابر چھایا رہا۔ ٹھنڈ ہو گئی اور صبح کو موسلا دھار بارش ہوئی۔ جون ۱۸۵۴ء میں پھر شدت کی گرمی پڑی۔ اگست میں تپ کا مرض عام ہوا۔

پھر بارشیں شروع ہو گئیں لیکن بخار بدستور پھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں آدھے آدمی تپ میں مبتلا نہ ہوں۔ پھر ان آدھے آدمیوں میں سے دو چار اچھے ہوتے تو باقی بیمار پڑ جاتے۔ خود مرزا کے ہاں کے نوکر، ان کی اہلیہ اور حسین علی خاں تپ میں مبتلا ہوئے۔ حسین علی خاں کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ مرزا کو اس کی طرف سے مایوسی ہو گئی اور سخت پریشان تھے۔ تپ کی یہ وبا اکتوبر ۱۸۵۴ء تک جاری رہی۔ مئی ۱۸۵۵ء میں گرمی پڑی لیکن شب میں پانی ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ شب قدر کو سخت لو چلی اور رات بھی بڑی تاریک تھی پروا ہوا کے چلنے سے سکون ہوا۔ جولائی میں خوب بارشیں ہوئیں۔ جھڑی لگ گئی۔ سورج کئی کئی دن تک نہ دکھائی دیا۔ بہت سے مکان گر گئے۔ جون ۱۸۵۶ء میں گرمی اس سے پچھلے سال کی نسبت کم پڑی۔ جولائی میں خوب بارشیں ہوئیں۔ بہت دن تک سورج دکھائی نہیں دیا۔ بخار نے پھر وبا کی صورت اختیار کی لیکن اس میں اتنی شدت نہ تھی۔ حسین علی خاں اور باقر علی خاں بخار میں مبتلا رہے۔ مرزا کی ملازمہ مغلانی کچھ دن بیمار رہ کر مر گئی۔ دوسری مغلانی جو اس کی جگہ رکھی گئی وہ بھی بخار میں مبتلا ہو گئی اور سراسیمہ وار اپنے گھر بھاگ گئی۔

مرزا نے ایک جگہ غلّہ کے بھاؤ کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہاں چنا گیہوں بیس بائیس سیر اور گھی دو سیر
سوا دو سیر ہے۔ ادھر کا حال آپ لکھئے کہ کیا ہے۔"

## ڈاک کا انتظام اور مرزا کی پریشانی۔

مرزا نے بیرنگ خط اسی لئے بھیجنے شروع کئے تھے کہ ڈاک کا اعتماد جاتا رہا تھا۔ اور یہ خیال تھا کہ بیرنگ خط ڈاک والے جلد پہنچا دیتے ہیں۔ اہم خطوط پر خاص کر ازراہِ احتیاط ٹکٹ نہ لگاتے تھے۔ اس عدم اعتمادی کی ایک وجہ تھی

جس کی تفصیلات ان خطوط کی مدد سے فراہم ہوسکی ہیں۔ یہ وجہ نئے قانون کا نفاذ تھا۔

ڈاک کا قاعدہ یہ تھا کہ ہر خط کی رسید ملتی تھی۔ ایک ڈاک کتاب ملتی تھی جس میں خط کی روانگی کی تاریخ درج ہوتی اور پوسٹ پیڈ کی لال مہر اور بیرنگ کی سیاہ مہر لگائی جاتی تھی۔ نئے قانون کے نفاذ کے ساتھ پہلے پوسٹ پیڈ کی رسید ملنی موقوف ہوئی۔ اس پر مرزا نے بیرنگ خط بھیجنے شروع کر دئے۔ لیکن کچھ ماہ بعد جب بیرنگ خط کی بھی رسید ملنی بند ہوگئی اور لیٹر بکس میں خط ڈالنے کا قانون ہوا تو ڈاک کا رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا۔ اب رسید کے لئے رجسٹری کرانی ضروری ہوگئی جس کی فیس چار آنے تھی۔ تین ماشہ تک کا خط دو پیسے میں جاتا تھا لیکن آج کل کی طرح اگر اس کا وزن بڑھ جاتا تو مکتوب الیہ سے دگنا محصول وصول کیا جاتا۔ ٹکٹ اس زمانے میں سٹامپ کے ٹکڑے کہلاتے تھے۔ اس بندوبست جدید سے عوام خوش نہ تھے۔ پھر بھی بیرنگ خط کے پہنچ جانے کا زیادہ امکان سمجھا جاتا تھا۔ مرزا نے اس بندوبست جدید کا ذکر ایک خط مرقومہ ۱۴ جون ۱۸۵۴ء میں کیا ہے۔ اس لئے یہ قانون مئی ۱۸۵۴ء میں نافذ ہوا ہوگا اور مرزا نے بیرنگ خط لکھنے کا سلسلہ جون ۱۸۵۴ء سے شروع کیا ہوگا۔ مرزا لکھتے ہیں:

"نہیں معلوم کیا بندوبست جدید ہوا ہے کہ بالکل ڈاک کا انتظام و اعتماد جاتا رہا۔ ایک دو خط انگریزی ایک فرنگی کے تلف ہو لئے۔ اس نے یہاں کی ڈاک میں گفتگو کی۔ کوئی اس کا مجیب نہ ہوا۔ اس نے بڑے پوسٹ ماسٹر سے شکایت کی۔ جواب پایا کہ کچھ جواب

نہ پاؤ گے۔ تم نے دیا ہم نے بھیج دیا۔ اب پہنچے یا نہ پہنچے۔ میرٹھ سے بھی فریاد آتی ہے۔ آگرے کے خطوں سے بھی سنا جاتا ہے۔ اگرچہ میرا کوئی خط اب تک تلف نہیں ہوا ہے مگر وبائے عام میں بچاؤ کہاں۔"

پھر ۱۳ ر اکتوبر ۱۸۵۴ء کو نئے بندوبست کی وجہ سے جو دقتیں پیدا ہوئیں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ڈاک کا رشتہ کیسا بگڑا۔ میں نے اپنے نزدیک از روئے احتیاط بیرنگ خط بھیجنا اختیار کیا تھا۔ گو بمقتضائے وہم ہو۔ خط جب ڈاک گھر میں جاتا تھا رسید ملتی تھی۔ پوسٹ پیڈ کی لال مہر۔ بیرنگ کی سیاہ مہر۔ خاطر جمع ہو جاتی تھی۔ ڈاک کتاب کو دیکھ کر یاد آ جاتا تھا کہ فلاں خط کس دن بھیجا ہے اور کس طرح بھیجا ہے۔ اب ڈاک گھر میں ایک صندوق منہ کھلا ہوا دھر دیا ہے۔ جو جائے۔ خط اس میں پھینکے اور چلا آئے۔ نہ رسید، نہ مہر، نہ مشاہدہ۔ خدا جانے وہ خط روانہ ہوگا یا نہ ہوگا۔ اگر روانہ بھی ہوا تو وہاں پہنچنے پر ڈاک کے ہرکارے کو نہ انعام کا لالچ نہ سرکار کو محصول کی طمع۔ نہ دیا ہرکارے کو۔ یا دیا۔ ہرکارے نے نہ پہنچایا۔ اگر خط نہ پہنچا تو بھیجنے والا کس دستاویز سے دعویٰ کرے گا۔ مگر ہاں چار آنے دے کر رجسٹری کروائے۔ ہم دوسرے تیسرے دن جا بجا خط بھیجنے والے روپیہ آٹھ آنے رجسٹری کو کہاں سے لائیں۔ احیاناً ہم نے تین ماشہ سمجھ کر آدھ آنہ کا سٹامپ لگا دیا۔ وہ خط تی دوٹی

بڑھتی نکلا۔ مکتوب الیہ سے دونا محصول لیا گیا۔ خواہی نخواہی کا ٹنٹا
بانٹ رکھئے۔ کلنٹے کا خار خار الگ، تولنے کا قصّہ الگ۔
خط بھیجنا نہ ہوا ایک جھگڑا ہوا۔ ایک مصیبت ہوئی۔ آج دسویں
محرم کو یہ لکھا ہے۔ کل اسٹامپ کے ٹکٹ منگاؤں گا۔ سرنامہ
پہ لگا کر روانہ کروں گا۔ اندھیری کوٹھری کا تیر ہے۔ لگا، لگا۔
نہ لگا نہ لگا۔"

## مرزا کی بیماری۔

مرزا دور جوانی تک تو بہت تندرست رہے لیکن شراب نوشی کی عادت نے صحت کو بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ جوانی کے ڈھلنے کے ساتھ ساتھ شراب کے برے اثرات اپنا رنگ لانے لگے اور بیماریاں زور پکڑتی گئیں۔ غدر کے بعد کے خطوط میں تو بیماری کا ذکر عام ہے لیکن ان کی اس سے پیشتر کی بیماری کا حال معلوم نہ ہو سکا تھا۔ ایک خط بنام تفتہ مرقومہ مارچ ۱۸۵۴ء سے پتہ چلتا تھا کہ مرزا ان دنوں تپ و لرزہ میں مبتلا ہوئے تھے۔ ان خطوط کی مدد سے ہمیں مرزا کی ۱۸۵۰ء تک کی بیماری کا حال، ڈاڑھوں کے گرنے کا بیان، گراں گوشی اور سامعہ و شامہ کی شکایت کی تفصیلات معلوم ہو گئی ہیں۔ مرزا ۱۸۵۰ء سے کئی سال قبل سے احتراق اور فساد خون سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں مبتلا رہتے تھے اور موسم بہار میں اس کی زیادہ شدت ہو جاتی تھی ؂

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ نا سازیِ دوا کہیے

## ۱۸۵۰ء

اگست ۱۸۵۰ء میں مرزا احتراق میں مبتلا تھے۔ پاؤں پھول رہا تھا اور تلوے کے گرد دانے نکلے ہوئے تھے۔ پھر بخار چڑھا اور اس کے ساتھ ساتھ سر میں سخت

درد ہو گیا۔ مرزا نے سر کے درد کو مرض حقیقی و مادی لکھا ہے۔

## ۱۸۵۱ء

جنوری ۱۸۵۱ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی اس سے قبل چار ڈاڑھیں گر چکی تھیں۔ پانچویں ڈاڑھ جب زیادہ ہلنے لگی تو مسوڑھوں میں ورم اور سخت درد شروع ہو گیا۔ یہ ڈاڑھ انتہا میں تھی اس لئے اس کا نکلوانا بھی آسان نہ تھا۔ منشی نبی بخش حقیر کے بھیجے ہوئے منجن سے درد اور ورم تو جاتا رہا لیکن تکلیف نہ گئی۔ پاؤں کا زخم کافی مندمل ہو چکا تھا۔

مارچ ۱۸۵۱ء میں فصلِ بہار کے باعث ہیجان خون اور احتراق کی شدّت زیادہ ہو گئی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ

"لازم یوں تھا کہ شاہترہ پیتا اور مسہل لیتا مگر کچھ نہ ہو سکا۔ صرف فصدِ باسلیق پر قناعت کی اور آدھ سیر خون لے لیا۔ اب آئندہ جو ہو سو ہو۔"

اگست ۱۸۵۱ء میں بھی مرزا احتراق میں بدستور مبتلا تھے لیکن اس کی طرف توجہ نہ کی۔

## ۱۸۵۲ء

مارچ ۱۸۵۲ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کو دورے پڑنے لگے تھے۔ اس سے قبل قولنج کا دورہ پڑ چکا تھا اور ان دنوں سینے کے درد کا دورہ پڑ رہا تھا جو کبھی دوپہر کبھی چار پہر اور کبھی چھ پہر تک رہتا تھا۔ حکیم احسن اللہ خاں کے زیرِ علاج تھے اور آمدِ فصلِ نو کی بنا پر انھوں نے مرزا کے لئے مسہل تجویز کئے تھے۔ مرزا تین مسہل لے چکے تھے اور چوتھے کی فکر میں تھے۔

---

## سنہ ۱۸۵۳ء

مارچ سنہ ۱۸۵۳ء میں ان کے اعضا میں درد رہنے لگا تھا اس لئے انھوں نے مسہل لئے جس سے درد جاتا رہا۔ اور وہ تندرست ہو گئے۔

## سنہ ۱۸۵۴ء

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا تقریباً ایک سال یعنی فروری سنہ ۱۸۵۳ء سے فروری سنہ ۱۸۵۴ء تک بالکل تندرست رہے۔ اور شاید اسی لئے انھوں نے سفر کا ارادہ کر لیا تھا جو بہادر شاہ کی بیماری کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ مارچ سنہ ۱۸۵۴ء میں احتراق کا ظہور تپ دلرزہ سے ہوا۔ آٹھ دن تک کھانا کھایا۔ تپ تو اتر گئی لیکن دوسرے عوارض پیدا ہو گئے۔ ۲۷ر مارچ تک مرزا پانچ مسہل لے چکے تھے اور چھٹا مسہل دوسرے روز لینا تھا۔ جون سنہ ۱۸۵۴ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ایک وقت کھانا کھایا کرتے تھے اور چونکہ ان دنوں احتراق کی شدت تھی اس لئے کھانا موقوف تھا اور غذا صرف دہی پر منحصر تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی مرزا نے آم نہ چھوڑے۔ نومبر سنہ ۱۸۵۴ء کے خط سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا کی قوتِ سامعہ و شامہ میں کئی سال پہلے سے فرق آ چکا تھا۔ اور چونکہ اس کے علاج معالجہ میں مسہل لینے ضروری تھے اس لئے مرزا نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور کوئی علاج نہ کیا۔

## سنہ ۱۸۵۵ء

مئی سنہ ۱۸۵۵ء سے قبل ہی مرزا کو گراں گوشی کی شکایت شروع ہو گئی تھی۔ منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

> "شیخ وزیر الدین کچھ "مہر نیمروز" کے مقدمے میں
> کہتے تھے مگر میں جو بہرا ہوں تو کچھ سمجھا نہیں کہ وہ کیا کہتے تھے
> شاید یہی کہتے ہوں کہ جواب پھر چھاپی جائے تو ایک نسخہ

جناب منشی صاحب کو اور بھیجنا۔"

۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء دو سال ایسے گزرے جن میں مرزا غالباً احتراق کی شدّتوں سے بچے رہے۔

## تعلیم نسواں کے متعلق مرزا کا بیان۔

اس زمانے کے مطابق مرزا کا بھی یہی خیال تھا کہ عورتوں کے لئے تعلیم میں قرآن شریف کا درست پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ منشی نبی بخش کی چھوٹی لڑکی ذکیہ بیگم کو مرزا بہت چاہتے تھے۔ جن دنوں وہ سیپارہ پڑھ رہی تھی۔ منشی نبی بخش نے لکھا کہ بیگم پڑھنے میں دھیان نہیں دیتی اور اس کے ساتھ سختی برتنی پڑتی ہے۔ مرزا جواباً لکھتے ہیں:

"پڑھنے میں اس پر شدت نہ کیا کرو۔ اس محنت کو اس پر سہل کردو۔ عورتوں کو علم اتنا ہی کافی ہے کہ حرف شناس ہوں اور کلام مجید ناظرہ درست پڑھ لیں۔ خدا اسے جیتا رکھے۔ سواد حرف شناسی ہو گیا ہے۔ قرآن پڑھ لیگی. شدّت نہ کرو۔"

## میر و میرزا کیا کہتے تھے۔ اردو کلام پر ناز۔

غالب کے ذہنی ارتقا کی منازل میں سب سے اہم مقام وہی ہے جہاں وہ اپنے آپ کو میر و میرزا سے افضل سمجھنے لگے۔ غالب اس منزل پر ۱۸۵۲ء میں پہنچ گئے تھے۔ مئی یا جون ۱۸۵۲ء میں منشی نبی بخش کو

"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں" والی غزل ارسال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ

یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔
صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزادگان تیموریہ
میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل
کہی اور مجھ کو حکم دیا۔ سو میں حسب حکم بجا لایا اور غزل لکھی۔"

ایک اور جگہ اپنی غزل کے داد خواہ اور اپنے اردو کلام پر اس طرح نازاں نظر آتے ہیں:

"رات کو ایک غزل کئی برس کے بعد لکھی ہے۔ اب صبحدم تم کو لکھتا ہوں۔ خدا کے واسطے غور کرنا کہ غزل اس کو کہتے ہیں۔"

غالب نے اسی زمانے میں ایک فارسی قطعہ لکھا تھا جس میں اردو کو اپنی زبان کہا ہے۔ لکھتے ہیں:

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ زخش شمع دودمانِ منست

جائے دارد کہ خویش را نازم
کہ فلانی ز پیروانِ منست

---

جاوداں باش اے کہ در گیتی
سخنت عمر جاودانِ منست

اے کہ میراث خوار من باشی
اندر اردو کہ آں زبانِ منست

حقیقت بھی یہی ہے کہ غالب کو اسی دور کی شاعری نے اردو کا سب سے بڑا

شاعر منوایا ہے۔

## شاعری کے دس سال۔

۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کے دس سال کا زمانہ غالب کی شاعری کا اہم ترین دور ہے اور غور کیا جائے تو غالب اسی زمانے میں غالب بنے۔ ان کے اس دور کی بہترین یادگار فارسی کلام میں "جبیرہ" اور باقی اردو کلام ہے ۱۸۵۰ء میں ملازمت شاہی سے منسلک ہونے اور درباری تعلقات کے استوار ہونے کے باعث مرزا ریختہ کو اہمیت دینے اور اسے اپنی زبان بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بادشاہ آئے دن نئے ریختہ کی فرمائش بھی کرتے رہتے تھے۔ ادھر قلعہ میں اکثر طرحی مشاعرے بھی ہونے لگے تھے۔ مرزا یہ بھی جانتے تھے کہ بادشاہ سادگی پسند ہیں اور ویسے وہ خود بیدل کی روش کو چھوڑ کر میر اور سودا کا تتبع کرنے لگے تھے۔ اب انھیں ریختہ میں زیادہ لکھنے کا موقع ملا۔ آخر وہ اپنے ایک خاص انفرادی رنگ میں پختہ ہو گئے۔ قلعہ کے مشاعروں کی غزلیں اور اس دور کی دوسری غزلیں حسن معنوی، خیالات کی شگفتگی، زبان و بیان کی پاکیزگی اور سادگی کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔ اور ان میں ایک امتیازی رنگ پایا جاتا ہے۔

غالب کی طبیعت کی شوخی و ظرافت واقعہ اسیری کے بعد کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مرزا میں قید ہونے کے ساتھ ہی یہ خوبیاں پیدا ہو گئیں۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ مرزا پر اب تک متانت و سنجیدگی غالب تھی۔ اس واقعہ سے ان کے آبائی وقار کو بڑا صدمہ پہنچا تھا اور اس کا ان کے دل پر جتنا گہرا اثر پڑا اس کا اندازہ "جبیرہ" سے لگایا جا سکتا ہے۔ خطوط میں بھی مرزا نے اس ذلت آمیز واقعہ کا بار بار ذکر کیا ہے۔ ان کی زندگی میں یہ سب سے بڑا المیہ تھا۔ لیکن جدت طرازی اور بات میں سے نئی بات کا پہلو نکالنے کی عادت نے اسے

طربیہ کا ہم پایہ بنا دیا۔ اور وہ خود پر بھی ہنسنے لگے۔ یہیں سے مرزا کی طبیعت کی شوخی اور ظرافت نمایاں ہوئی۔ یہی شوخی و ظرافت اردو کلام پر اثر انداز ہوتی رہی۔ اسی شوخی و ظرافت نے عارف کے مرثیہ کو ایک بے مثل شاہکار بنا دیا۔ یہی شوخی و ظرافت زبان کی سلاست، خیالات کی ندرت اور تخیل کی رفعت سے ہم آہنگ ہو گئی تو غالب غالب بن گئے۔ چنانچہ مرزا کے اس خاص رنگ کے اشعار کی تخلیق و فراوانی اسی درباری دور میں ہوئی اور اسی امتیازی شان کی بدولت غالب ابھی تک بزم سخن طرازی میں اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر بنے بیٹھے ہیں۔

# تشریحات و توقیت کلام

غالب کو ناقدر شناسی اور ستمہائے عزیزاں کا ہمیشہ شکوہ رہا۔ لیکن کسی شاعر سے اس کے کلام کے معنی پوچھنا بھی کچھ کم ظلم نہیں۔ غالب اس ظلم کے یا تو عادی ہو گئے تھے یا انھوں نے اسے ظلم نہ سمجھا۔ چنانچہ متعدد خطوط میں مرزا نے اپنے اشعار کی تشریح کی ہے۔ ان خطوط میں مرزا غالب نے اپنے جن اشعار کی شرح کی ہے انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

معذوری ارز حادثہ رنجی ازاں کہ نیست
از ناز کی بہ طبع گوارا گریستن
مسکیں ندیدۂ ز مغاں شیوہ یا نواں
در خوابگاہِ بہمن و دارا گریستن

...............................

جاذوبِ لابیار کہ ایں شرکِ فی الوجود
با گردِ فرش و سینہ بایواں برابر است

بالائے طفلِ یک شبہ درخم زرا ستی
با قامتِ خمیدۂ پیراں برابر است
بردستِ شاہ تیغ وکماں راست جائیگاہ
با تیغ وباکماں بہ چہ ہرباں برابراست
دانم نہ تیغ مصقلۂ تیغ بادشاہ ست
نشگفت گو بہ تیغ بدیں ساں مرا براست
تیغ مرا اگرچہ بود خفتہ در نیام
پولاد با بدخشِ بدخشاں برابراست

.............

تو گوئی نگو مہر زیر زمیں
فروزاں فوہ بود لپشت نگیں

.............

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ بلا لوں تو بلائے نہ بنے

.............

اوّل ماہ است واز شرمِ تو ماہ
آخرِ شب از شبستاں مے رود

.............

زہے بتانِ مغاں شیوہ دادخواہانش
ز دستہائے حنا بستہ گل بہ دامانش

.............

ان اشعار کے علاوہ مرزا نے "مغاں شیوہ بانواں" کی ترکیب کی وضاحت کی ہے اور اس کے معنی بتائے ہیں۔ نیز گریاں اور افشاں ہیں ایطا کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

## توقیت کلام غالب۔

مرزا غالب چونکہ اپنا کلام منشی نبی بخش کو بھیجتے رہتے تھے اس لئے ان خطوط کی مدد سے ان کے کچھ کلام کی تاریخ تصنیف معین کی جا سکی ہے۔ ذیل میں ان تمام قصیدوں، مثنویوں، غزلوں، قطعوں اور رباعیوں کے مطلعے یا پہلے اشعار مع معینہ تاریخ نقل کئے جاتے ہیں:

| تاریخ تصنیف | مطلع یا پہلا شعر |
| --- | --- |
| | قصیدہ در منقبت امام حسین علیہ السلام۔ |
| | ابر اشکبار و ما خجل از نا گریستن |
| | دار ز تفاوت آب شدن نا گریستن |
| جون ۱۸۴۶ء سے قبل | |

---

| تاریخ تصنیف | مطلع یا پہلا شعر |
| --- | --- |
| | قطعہ۔ گزارش مصنف بحضور شاہ۔ |
| | اے شہنشاہ آسماں اورنگ |
| | اے جہاندار آفتاب آثار |
| جنوری ۱۸۵۱ء | |

---

| تاریخ تصنیف | مطلع یا پہلا شعر |
| --- | --- |
| | غزلیں کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے |
| | اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے |
| اپریل ۱۸۵۱ء | |

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اپریل ۱۸۵۱ء

قصیدہ در مدح بہادر شاہ۔

گفتم حدیثِ دوست بقراں برابر است

نازم بہ کفر خود کہ بایماں برابر است

۳۰ر جولائی ۱۸۵۱ء

غزل مشاعرہ۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مئی ۱۸۵۲ء

مثنوی دربیان معراج۔

ہمانا در اندیشۂ روزگار

شبے بود سر جوشِ لیل و نہار

نومبر ۱۸۵۲ء سے قبل

مشاعرے کی غزلیں۔

چاک از جیبم بداماں مے رود

تاچہ برچاک از گریباں مے رود

۱۰ر اپریل ۱۸۵۳ء

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے

ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے

۱۰ر اپریل ۱۸۵۳ء

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے

تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

٭

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے

بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

سنہ ۱۸۵۳ء

٭

مشاعرہ کی غزل۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

رباعیات — جولائی سنہ ۱۸۵۳ء

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں

۳؍جون سنہ ۱۸۵۴ء

٭

افطار صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو

اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

غزلیات — ۳؍جون سنہ ۱۸۵۴ء

٭

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا

پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

جون سنہ ۱۸۵۴ء

٭

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو۔ جون سنہ ۱۸۵۴ء

قصیدہ در مدح ولی عہد۔

زہے بتانِ مغاں شیوہ داد خواہانش

زدستہائے حنا بستہ گل بدامانش

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔×۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۷ جون سنہ ۱۸۵۴ء

قصیدہ در مدح واجد علی شاہ۔

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی

کہ دروے آدم آلِ عبا را ساربان بینی

قطعات

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔×۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جولائی یا اگست سنہ ۱۸۵۴ء

کہتے ہیں کہ وہ مردم آزار نہیں

عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔×۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مارچ سنہ ۱۸۵۵ء

ہم گرچہ ہوئے سلام کرنے والے

کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔×۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مارچ سنہ ۱۸۵۵ء

قصیدہ در مدح بہادر شاہ۔

باز برانم کہ بہ دیباے راز

از اثر ناطقہ بتدم طراز

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔×۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴ اگست سنہ ۱۸۵۵ء

غزل۔ اے ذوقِ نواسنجی بازم بخروش آور

غوغائے شبیخونے بر بنگہ ہوش آور

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔×۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳ اکتوبر سنہ ۱۸۵۵ء

اپنے کلام پر اصلاح ۔

ہر شاعر دیوان ترتیب دیتے وقت اپنے کلام پر ایک نظر ضرور ڈال لیتا ہے۔ اور جہاں کہیں تغیرّ الفاظ و ترمیم کی گنجائش دیکھتا ہے وہاں مناسب اصلاح کر لیتا ہے مرزا غالب کا دیوان ان کی زندگی میں چار بار شائع ہوا۔ انھوں نے بھی ہنگام ترتیب و اشاعت اپنے کلام پر ضرور نظر ثانی کی ہوگی۔

مرزا غالب اپنے اردو کلام اور فارسی کلام منشی نبی بخش حقیر کو بھی بھیجا کرتے تھے۔ اس لئے ان خطوط کی مدد سے چند اصلاحوں کا پتہ چل سکا ہے "تو" کی جگہ "کہ" یا "کہ" کی جگہ "تو" کے تغیرّ سے بعض بعض مقامات پر تو یقیناً بہت فرق پڑ سکتا ہے۔ لیکن ان خطوط کے منقولہ کلام میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ دو اشعار ایسے فراہم ہو گئے ہیں جن میں ایک ایک لفظ کے تغیرّ سے نمایاں فرق ہو گیا ہے۔

غالب کی مشہور غزل ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اس غزل کا ایک شعر مروجہ دیوان میں اس طرح ہے ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

یہ غزل ۱۸۵۲ء میں جب منشی نبی بخش کو بھیجی گئی تھی تو یہ شعر اس طرح تھا ؎

نیند اس کی ہے نصیب اس کے ہیں راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اسی طرح مرزا کی ایک غزل ہے ؎

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے

اسی غزل کا ایک شعر ہے ؂

انھیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہئے

یہ غزل اپریل ۱۸۵۳ء میں نبی بخش حقیر کو بھیجی گئی تو یہ شعر اس طرح تھا ؂

انھیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں کڑھیئے
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہئے

# تاہل کی زندگی

مرزا غالب طبعاً آزاد واقع ہوئے تھے۔ ان کے لئے ہر قسم کی تنگی اور پابندی ایک مصیبت تھی۔ شادی ہونے کے باعث جو فرائض اور پابندیاں اُن پر عائد ہو گئی تھیں انھیں وہ ایک شریف آدمی کی طرح پورا کرتے رہے لیکن اس سے کبھی خوش نظر نہیں آتے انھوں نے بارہا شادی کو حبس دوام سے، بیوی کو پھانسی کے پھندے، طوق اور بیڑی سے، اور حسین علی خاں اور باقر علی خاں کو اسی لوہے کی دو ہتھکڑیوں سے تعبیر کیا ہے۔ امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال کی خبر پائی تو اس کے جواب میں ۱۹ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھا:

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔"

تاہل کی زندگی سے نفرت کا ایک اور جگہ اس طرح اظہار کیا ہے:

"بھائی میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے۔ ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیلے جانتے ہیں میری سُبکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسر آ جاتی لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجریدِ مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لاولد رکھا تھا۔ شکر بجا لاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں۔"

مرزا کے فارسی کلام میں بھی کچھ رُباعیات و قطعات ایسے پائے جاتے ہیں جن سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ انھیں تاہل کی قید بڑی کھلتی تھی۔ ان کی دو رباعیاں ہیں ؎

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری
دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تند مے خرامی، دانم
درخانہ زنے ستیزہ خوئے داری

..........

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود
از غصۂ فراغتش ہمانا نبود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درد
نازم بخدا چرا توانا نبود

ایک قطعہ کے ان اشعار سے ناچاقی کا احساس ہوتا ہے ؎

گیرکہ در روز حشر چوں تو بخفتی
برسرِ دوزخ نہند تیرہ نہنبن
داں کہ نہ باشد درآں مضیق مصیبت
در طلبِ نان و جامہ کشمکش از زن
داں کہ نباشد درآں مقامِ صعوبت
شورِ تقاضائے ناروائے مہاجن

ایک جگہ فرماتے ہیں:

بہ آدم زن، بہ شیطاں طوقِ لعنت
سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم
گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

مرزا کی ان تمام نگارشات کو طبعی شوخی، فطری مزاح اور بذلہ سنجی کا نتیجہ جان کر ان کی شوخ گفتاری پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا اپنی بیوی کا بہت خیال رکھتے تھے جس کا ثبوت وہ خطوط ہیں جو انھوں نے دورانِ قیامِ رامپور میں مختلف دوستوں کو لکھے اور یہ شریف آدمیوں کا شیوہ ہے۔ لیکن انھیں ضروریاتِ امورِ خانہ داری کی فرائشوں پر الجھن ضرور ہوتی ہوگی۔ مزید برآں مرزا کی بیوی نہایت متقی و پرہیزگار تھیں ادھر مرزا ماشاءاللہ رندِ منش انسان۔ اس اجتماعِ ضدین کی وجہ سے کبھی کبھی کھٹ پٹ ضرور ہو جاتی ہوگی۔ مرزا آخری عمر تک محل سرا میں کم از کم کھانے کے وقت ضرور جاتے رہے۔ یہ انھیں عادت پڑ گئی تھی۔ ویسے بھی اسے تاہل کی زندگی کی پختگی

یا ناپسندیدگی سے کیا تعلق۔

رسالہ آجکل نے ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کے شمارے میں "غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں صاحب مضمون پروفیسر حمید احمد خاں نے کچھ ایسے واقعات رقمبند کئے تھے جو انھوں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی بیٹی اور نواب زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم سے سنے تھے۔ ان بگا بیگم نے غالب کی زندگی کا آخری دور دیکھا تھا۔ اور غالب ہی کے گھر میں بیاہ کر گئی تھیں۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں:

"اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد رو تھے اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش کی طرح پرہیز گار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ اس وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی تھی۔ چنانچہ غالب اپنی بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ "میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے۔" مگر یہ جھگڑا محض رندی و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلاف مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا۔ چنانچہ خود بگا بیگم کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتیں ان سے کہتی تھیں: "بیٹی تو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔"

ہمارے اس مجموعہ میں مرزا کی ایسی تحریریں موجود ہیں جن سے اس امر خاص پر روشنی پڑتی ہے۔ منشی نبی بخش کی بہو یعنی عبداللطیف کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ دوسری شادی کا ارادہ ہے۔ مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"بھائی اس غریب کو بند تاہل میں پھنساتے ہو۔ بقائے نام کے واسطے خدا جینار کھے۔ عبدالسلام و کلثوم کافی ہیں۔ میں تو بھائی ابن یمین کا معتقد ہوں ؎

مرد آں بہ کہ بہ دنیا نکند میل دو کار

بجہاں ہر کہ طلبگار سلامت باشد

زن نخواہد اگرش دختر قیصر بدہند

وام نستاند اگر وعدہ قیامت باشد

کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا جی نہ چاہتا ہو اور تم زبردستی اس بلا میں پھنساتے ہو۔ اس کے ہمرازوں سے اس کا مافی الضمیر معلوم کر لو۔ اگر وہ بھی راضی ہے تو خیر ورنہ میرے نزدیک تو جبر ہے۔"

شادی ہونے کے بعد پھر لکھتے ہیں:

"منشی عبداللطیف کی شادی پہلے اس پر، پھر اس کے والدین پر اور اس کی بہنوں پر اور بھائیوں پر مبارک ہو۔ پھر کہتا ہوں کہ خدا کرے یہ امر اس کی خوشی اور رضامندی سے ہوا ہو۔"

ان اقتباسات میں کوئی شوخ گفتاری نہیں۔ عبداللطیف کی شادی کسی طرح

مرزا پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی تھی ۔ بلکہ ان کا یہ خیال عام طرز زندگی سے متعلق ہے
مرزا حقیقتاً تاہل کی زندگی سے بیزار رہتے تھے ۔ جو کوئی غیر متوقع بات
نہیں ؛

# مرزا غالبؔ کے شاگرد

(۱) آرامؔ :-

منشی شیو نرائن اکبر آبادی ولد منشی نندن لعل ولد ناظر بنسی دھر داروغہ و معتمد سرکار غلام حسین خاں۔ زبان انگریزی مشہور لغت نویس ڈاکٹر فیلین سے پڑھی۔ مطبع مفید خلائق آگرہ کے مہتمم تھے جس سے رسالہ بغاوت ہند ماہانہ اور معیار الشعراء ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ میونسپل کمیٹی کے سکریٹری تھے ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔ بہت خوش فکر تھے اور تصوف کی طرف رجحان تھا۔ اردوئے معلّیٰ میں کئی خط ان کے نام ہیں۔ نمونۂ کلام :-

یہ دنیا اک سرا ہے اس کو آخر چھوڑ جانا ہے
اگر دو چار دن آکر یہاں ٹھیرے تو کیا ٹھیرے
قیام اپنا ہو اس محنت سرائے دہر میں کیونکر
جہاں آفت ہی آفت ہو وہاں آرام کیا ٹھیرے

.....٭.....

(۲) آذر:۔

نواب ذوالفقار علی خاں دہلوی نبیرۂ معتمد الدولہ نواب احمد علی خاں
برادرزادہ شاہ ولی خاں وزیر احمد شاہ ابدالی، شاہجہاں آباد دہلی کے قلعہ دار تھے
کلام میں جدّت اور طبیعت میں جودت تھی۔ نمونہ کلام:۔

شکر پرواں زبان کٹتی ہے
شکوہ کرنے کی کیا مجال ہمیں
میرے ستانے نے کام اس سے اک جہاں کیلئے
جو میں نہ ہوں تو نہ گردش ہو آسماں کے لئے

(۳) آشوب:۔

رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب ٹنڈن دہلوی۔ ان کے
جدامجد رائے بالمکند درائے سیتارام مرہٹوں کے عہد میں بڑے بڑے
عہدوں پر ممتاز تھے۔ نسبی سلسلہ راجہ ٹوڈرمل وزیر شاہ اکبر تک پہنچتا ہے۔
لالہ سری رام ایم اے مصنف تذکرۂ خمخانۂ جاوید کے عم نامدار تھے۔ اردوئے معلیٰ
میں ان کے نام چند خط ہیں۔ غالب صہبائی اور ماسٹر رام چندر ریاضی داں
انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ دہلی کالج اور آگرہ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ دہلی اور
گوڑگانوہ میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ بارہ سال ۹۵-۱۸۸۴ء تک انسپکٹر مدارس رہے۔
دہلی لٹریری سوسائٹی کے بانی اور ایک سال تک اس کے سکریٹری رہے۔ آزاد و
حالی کو ابتداً لاہور میں آپ ہی کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا۔ رسوم ہند حصص ہند
حصہ اول وسوم، اردو کی تیسری کتاب۔ ترجمہ تاریخ انگلستان۔ ترجمہ دربار قیصری
(۱۸۷۷) باب اول ودوم وسوم آپ کی تصانیف وتراجم ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی
کے فیلو تھے۔ ۱۸۹۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بڑے خلیق شیریں زباں

غمگسار وفیض رساں تھے۔ ہندو کالج دہلی کے ٹرسٹی تھے۔ ابتدا میں عبدالکریم سوز دہلوی سے کلام میں اصلاح لیتے تھے۔ کلام سادہ، بامحاورہ اور شیریں ہوتا ہے۔ نمونہ کلام:

گر شیخ پاکدامن طالب نہ ہو ریا کا
رندوں کی محفلوں میں اسکا اڑے نہ خاکہ
آشوب خستہ جاں کو پھر ہی ہوس وہیں کی
کل ہی تو اڑ چکا ہے اسکی گلی کا خاکہ
زاہد چھوئے جو دامنِ رندانِ بادہ کش
تو چاہئے کہ مے سے اسے شست وشو کریں

(۴) آگاہ:۔

نواب سید محمد رضا دہلوی معروف بہ احمد مرزا خلف الصدق سید امیر مرزا ابن نواب معظم الدولہ محمد علی خاں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد نواب روشن الدولہ سید مظفر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے بخشی تھے۔ دو موضع صدر پور و رئیس پور ضلع میرٹھ میں آپ کی دادی کی جاگیر میں سے غدر میں ضبط ہوئے۔ غدر کے بعد جے پور میں سکونت پذیر ہوئے اور سرکار جے پور میں بصیغہ روزینہ داری منسلک ہوئے۔ سادہ مزاج اور وضع دار تھے۔ خیال میں بلند پروازی اور نشست الفاظ کا خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ غدر سے پہلے شہزادہ مرزا خضر سلطان خلف بہادر شاہ ظفر کے مصاحب تھے۔ ظہیر، انور و خستہ دہلوی کے ہم صحبت وہم مشق تھے۔ نمونہ کلام:

یہ بھی اک رنگ ہے محبت کا
روئیں ہم اور ہنسا کرے کوئی

غیر تو انجمن ناز سے ٹلتا ہی نہیں
یہ بھی کیا دم ہے ہمارا کہ نکلتا ہی نہیں
اب کہاں آگاہ غالب سا شفیق
روئیے دل کھول کر استاد کو

(۵) احسن :-

حکیم مظہر حسن خاں رامپوری ولد حکیم محمد مجتبیٰ خاں صاحب دیوان تھے۔ مترجم عروض سیفی، مولف قرابادین مختصر، خط نستعلیق کے استاد کامل اور ہفت قلم تھے۔ آسیر لکھنوی سے بھی استفادہ کیا تھا۔ نمونہ کلام :ے

خدا کے واسطے گیسو ہٹادے اپنے چہرے سے
ارے ظالم نہ کر رتبہ برابر کفر و ایماں کا
نامہربانیوں پہ تو مرتا ہے اک جہاں
کہئے کہ کیا غضب ہو اگر مہرباں ہوں آپ
ایک ہیں غیر کہ رہتے ہیں وفا پر ناخوش
ایک ہم ہیں کہ جفا پر بھی تری شاد رہے

(۶) اخگر :-

فتحیاب خاں خلف مظفر خاں گرم مقیم رامپور۔ نمونہ کلام :ے

قابو نہ تھا جو دل پہ تو اخگر بتایئے
جانا ہی اس کے پاس انھیں کیا ضرور تھا
دلِ ناکام کو پھر ان نگاہوں کی تمنا ہے
جگر میں ڈوب جانا پھر وہ یاد آتا ہی نشتر کا
جاؤ کوئے غیر میں اے نالہ ہائے نارسا ٭ اپنے ہی سر پر تھے تم محشر اٹھانے کیلئے

(۷) ادیب:-

مولوی سیف الحق دہلوی ابن مولوی احسان الحق خلف الصدق مفتی محمد اکرام الدین خاں بہادر صدر امین دہلی شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ شکیل، وضعدار اور حسن پرست تھے۔ شروع میں مرزا یوسف علی خاں عزیز کے شاگرد ہوئے۔ کچھ دنوں عدالت منصفی میں ناظر رہے۔ مگر انشا پردازی کی خداداد قابلیت نے یہ قید گوارا نہ کی اور اخباری دنیا میں قدم رکھا اور میو گزٹ نکالا۔ انجمن قصور کے سکریٹری اور اس کے رسالہ کے مدیر رہے۔ کچھ عرصہ کوہ نور، لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ اخبارات میں علمی بحثوں میں خوب حصہ لیا طبیعت میں غضب کا استحضا رکھتے تھے۔ نثر کا ایک ایک فقرہ شوخی سے بھرا اور مذاق میں ڈوبا ہوتا تھا کلام میں فصاحت بلاغت نازک خیالی اور جدت پسندی کی شان جلوہ گر تھی۔ تاریخ گوئی میں بے نظیر تھے۔ بات بات میں مادہ تاریخ نکالتے تھے۔ اپنی بھتیجی کی شادی کے موقع پر سامان جہیز کی فہرست معہ عنوان بقید نام جنس تمام و کمال تاریخ مرتب کی۔ صحت لفظی کا بڑا خیال اور تحقیقات سے خاص شغف تھا۔ جلسوں اور قومی کانفرنسوں میں لکچر بھی دیا کرتے تھے جس سے ہندوستان میں اچھا نام پیدا کر لیا تھا۔ سرکار آصفیہ میں بمشاہرہ چارسو پچاس روپے گورنمنٹ رپورٹر کے معزز عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ بڑے خوبرو، خوش وضع، رنگین طبع، نازک خیال، خوش تقریر، خوش تحریر آدمی تھے۔ خوشنویسی میں بھی اچھا ملکہ تھا فن عروض میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ آپ کے صاحبزادے ظفر الحق بھی شاعر تھے اور ظفر تخلص کرتے تھے۔ نمونۂ کلام:-

ایک تو ذکرِ عدو اس پہ بگڑنا کہ سنو
ٹوٹتی ہے یہ قیامت پہ قیامت کیسی

لے جاؤ میرے سینے سے ناوک نکال کے
پر دل نکل نہ آئے کہیں دیکھ بھال کے

راہ وفا پہ گر نہیں آتے ہیں وہ نہ آئیں
دل ہی کہیں ہو کاش مرے اختیار کا

(۸) اسمٰعیل :-

خان صاحب مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی خلف شیخ پیر بخش ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے ۱۹۱۷ء میں وفات پائی۔ آپ کی اردو کی درسی کتابیں یو۔پی۔ میں بہت مقبول ہوئیں اور کئی برس تک رائج رہیں۔ مولانا محمد اسلم سیفی آپ کے صاحبزادے یو۔پی میں ایم۔ ایل۔ اے۔ رہے۔ آپ کے بھائی مولانا عبدالحکیم جوش اور آپ کے بیٹے مولوی عبدالعلیم علیم بھی شاعر ہیں۔ نمونہ کلام :-

لبکہ ذکر العیش نصف العیش ہے
یادِ ایام فراغت ہی سہی

نہ اے شمع رُو رو کہ سر شام سے
ابھی تجھ کو آنسو بہانے بہت ہیں

(۹) انور :-

سلطان الشعراء سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا دہلوی برادر خورد راقم الدولہ سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا خلف الصدق صلاح الدولہ مرصع رقم خان سید جلال الدین رضوی استاد بہادر شاہ ثانی ابن میر امام علی شاہ۔ آپ بڑے ذکی و طباع تھے۔ اوائل مشق میں ذوق سے بھی استفادہ کیا تھا۔ طبیعت نہایت مضمون خیز اور دقت پسند تھی۔ کلام کی شوخی خیال کی قدرت فکر کی رسائی قابل دید اور لائق داد تھی۔ بڑے نازک خیال۔ مشاق اور پر گو تھے۔

غدر کے بعد جے پور جا رہے تھے۔ وہیں ۷۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ دو دیوان ضائع ہو گئے۔ ایک دیوان لالہ سری رام ایم اے نے بڑی تلاش و محنت سے مرتب کر کے طبع کرایا۔ خوشنویسی میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ آپ کے بھتیجے سید سجاد مرزا اسیر تھانہ دار جے پور بھی بڑے خوش فکر شاعر تھے۔ اور براقی ذہن تیزی فکر اور فی البدیہہ شعر گوئی میں اپنے عم نامدار (انور) کے قدم بہ قدم تھے انور کا نمونۂ کلام یہ ہے: ؎

کیسی حیا، کہاں کی وفا، پاس خلق کیا
ہاں یہ صحیح کہ آپ کو آنا یہاں نہ تھا
کچھ اپنے دل کے ولولے کچھ زاہدوں کی ضد
سر پھوڑنے کو ورنہ وہی آستاں نہ تھا
نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے
کیا اس کی ہے خوشی کہ وہ رخ بے نقاب ہے
اک میرے ساتھ چشم جہاں کامیاب ہے

(۱۰) **بسمل**:-

منشی غلام اللہ خلف منشی سرفراز علی کنبوہ۔ بانس بریلی کے رہنے والے تھے۔ سرکار انگریزی میں ملازم تھے۔ حج بھی کر آئے تھے۔ اپنے استاد کی طرز کے کامیاب مقلد تھے۔

نمونۂ کلام: ؎

شب وفور اشک سے گردوں کفِ سیلاب تھا
دورۂ چشم کواکب حلقۂ گرداب تھا

واں حنا بندی عناں گیرِ خرامِ ناز تھی
یاں تنِ کاہیدہ غرقِ اشکِ خوں ناب تھا
حسن تمکیں آزما کو پاس خودداری اُدھر
خانہ زادِ عشق کو ملحوظ یاں آداب تھا
ان کو پاس ننگ دامنگیر مجھ کو پاس وضع
وہ اُدھر بیتاب تھے اور میں اِدھر بیتاب تھا
میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر
بستر سنجاب تھا نے بستر کمخواب تھا

(۱۱) **بیتابؔ :-**

صاحبزادہ عباس علی خاں خلف الرشید نواب عبد العلی خاں بن نواب غلام محمد خاں۔ پہلے مومنؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ مومنؔ کے انتقال کے بعد غالبؔ سے اصلاح لینے لگے۔ فن سخن سے عشق تھا کئی برس دہلی میں رہے۔ عاشقانہ اور معاملہ کے شعر خوب کہتے تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ نواب کلب علی خاں کے ماموں تھے۔ نمونہ کلام :-

بیتاب پی خدا نے دئے ہیں تجھے بھی ہاتھ
یہ خم ہے یہ سبو ہے یہ مینا یہ جام ہے
دیر دیکھا میکدہ دیکھا۔ حرم بھی دیکھ لیں
آج آنکلے ہیں یہاں ہم گردش ایام سے
معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ
ساقی اگر نہیں ہے نہ ہووے سے کام ہے

(۱۲) **بیدل:۔**

مولوی حبیب الرحمٰن خلف حاجی مولوی احمد علی محدّث سہارن پوری۔
مرزا حسین علی خاں شاداںؔ اور حضرت غالبؔ سے مستفید ہوئے۔ حیدر آباد میں
عرصہ تک مہاراجہ سرکشن پرشاد کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔ پھر مدرسہ
عالیہ نظام میں معلّم فارسی ہو گئے۔ مضمون آفرینی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ باوجود
جیّد عالم ہونے کے نہایت شوخ طبع اور زندہ دل واقع ہوئے تھے۔ نمونہ کلام:۔

رہتا ہے سیہ پوش سدا خانہ کعبہ
اس غم میں کہ تھا پہلے جلو خانہ کسی کا

گر یہی جوشش گریہ ہے تو اے وحشت دل
بحر ہو جائیگا جو گھر ہے بیاباں اب تک

دل فسردہ کو ڈھونڈو تم اپنے بالوں میں
شکستہ حال ملے گا شکستہ جالوں میں

عشق آساں نہیں ہے دلِ خود رفتہ حسن
چشم مشتاق سے کہئے ابھی ترسے پہلے

(۱۳) **بصیر:۔**

لالہ بالمکند سکندر آبادی خلف لالہ کانجی مل کھٹناگر۔ فارسی اور اردو
دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے۔ ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ سرکار انگریزی میں
مناصب داروغگی و منشی گری اور سررشتہ داری بندوبست پر مامور رہے ۱۲۲۳ھ
سال پیدائش ہے۔ مشاق شاعر تھے۔ تفتہؔ سے بھی مستفید ہوئے۔ منشی شنکر لال
ساقی خلف منشی خوب چند تحصیلدار سکندر آبادی آپ کے شاگرد رشید تھے۔
نمونہ کلام:۔

تنگ ہوں یہ اپنی وحشت سے کہ صحبت سے مری
تنگ یاں تک آ گیا صحرا کہ خود زنداں ہوا
شعر سن کر جس کو دیوانہ کہا کرتے تھے آپ
اب وہی بتصبر دیکھو صاحبِ دیواں ہوا
بوٹا سا قد چھریرا بدن چمپئی سا رنگ
بھولی سی صورت آنکھ لجائی ہوئی سی ہے

(۱۴) پیر جی :-

پیر جی قمرالدین دہلوی پہلے سالک دہلوی کے شاگرد تھے۔ معلمی اور کتب فروشی سے بسر اوقات کرتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام :-

وہ کیا غیر سے رشتہ مہر توڑیں
کہ یہ بھی نزاکت کے شایاں نہیں ہے
مرے دل کو کس طرح سے ہو مسرت
کہ اس بزم میں ہائے رضواں نہیں ہے
ہر اک شعر اسکا ہے گنج معانی
مقرر یہ غالب کے شاداں نہیں ہے
پیر جی عشق میں گھلے اتنے
اڑ گیا گوشت رہ گیا چھلکا

(۱۵) تپش :-

مولوی سید مدد علی خلف مولوی میر نجف علی جعفری سبزواری ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں پہلے گلزار علی اسیر اور بعد میں غالب کے شاگرد ہوئے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر کرتے تھے۔ شعر گوئی کا ملکہ اچھا تھا۔ صاحب

استعداد تھے۔ خزینۃ القواعد، جغرافیہ منظوم اور محاربات ہند ان کی تصنیفات ہیں۔ سنہ ۱۸۶۹ء
تک آگرے میں حیات تھے۔ نمونۂ کلام :۔

کبھی ناداں بنے ہم گاہ فخر الاذکیا ٹھیرے
کبھی رند شرابی اور کبھی ہم پارسا ٹھیرے
لسانِ دانۂ تسبیح جس کو ہو سدا گردش
قضا کے ہاتھ پھر کیونکر نہ اسکا فیصلہ ٹھیرے
غم و درد و الم رنج و مصیبت ساتھ ہیں میرے
خدا جانے یہ کس منزل پہ جا کر قافلہ ٹھیرے
صفا اگر طلبی زاہدا بمشرب ماست
بجز ریا دگر از فرش بوریا مطلب

## (۱۶) تفتہ :۔

منشی ہرگوپال الملقب بہ میرزا تفتہ حضرت غالب کے عزیز ترین اور ارشد شاگرد تھے۔ فارسی زبان پر اہل زبان عش عش کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ چار مجلد کلام فارسی میں ہیں۔ اردوئے معلےٰ میں اکثر خطوط ان کے نام کے موجود ہیں۔ سنہ ۱۲۹۵ھ مطابق سنہ ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔ بنواری لال شعلہ وکیل علی گڑھ آپ کے نامور ممتاز شاگرد تھے۔ اردو کی طرف بہت کم توجہ کی۔ ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر ان کے نواسے ہیں اور ان کا مجموعۂ کلام "لاجونتی" شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام :۔

فیض از تو نہ ایم کم دے صبر بخشی است ترا کم است مارا
غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزاروں ہیچمداں نامور ہوئے

فیض وکمال وصدق وصفا اور حسن وعشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا وسر ہوئے

(۱۷) **توفیق**:-

شاہزادہ سلطان محمد بشیر الدین خلف الصدق سلطان شکر اللہ فرزند خاص حضرت ٹیپو سلطان والی میسور وسرنگاپٹن۔ کلکتہ میں ٹالی گنج میں سکونت پذیر تھے۔ نکتہ سنج۔ موزوں طبعی علم وفضل اور اخلاق حمیدہ میں فخر خاندان تھے۔ تاریخ خوب کہتے تھے۔ نظم فارسی، اردو دونوں زبانوں میں دستگاہ تھی۔ دیوان ہنر ہر کی تقریظ وتاریخ خوب کہی ہے۔ ۱۸۷۸ء میں کلکتہ میں انتقال فرمایا۔ اردوئے معلیٰ میں کئی خطوط ان کے نام کے ہیں۔

(۱۸) **ثاقب**:-

نواب شہاب الدین احمد خاں خلف اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس اعظم دہلی وجاگیردار لوہارو۔ مرزا غالب کے سسرالی رشتہ سے بھتیجے تھے۔ علم وفضل اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اچھا نام پیدا کیا۔ دہلی میں آنریری مجسٹریٹ تھے عاشقانہ رنگ جس میں تصوف اور اخلاق کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ اچھا کہتے تھے۔ کلام میں درد ہے۔ سال پیدائش ۱۸۴۰ء ہے ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔ درگاہ قدم شریف میں دفن ہوئے۔ سالک نے تاریخ وفات کہی۔ روز ششم بہ محرم صدر۔

نمونۂ کلام:-

نہیں عقل سے عشق خالی کہ اس میں
بڑے تجربے ہم کو حاصل ہوئے ہیں

رنجش سے گر کہا ہو تو ایماں نہ ہو نصیب
کافر بتوں کو کہتے ہیں عشاق پیار سے

اے کہن سال فلک دشمنِ جانِ دہلی
کیا ترے ہاتھ لگا کھو کے نشانِ دہلی

(۱۹) جنونؔ :۔

خان بہادر قاضی عبدالجمیل رئیس اعظم بریلی۔ آپ کے بزرگ شاہان مغلیہ کے زمانے میں مصر سے دہلی آئے تھے۔ بریلی کے قاضی تھے۔ شاہان دہلی اور صوبہ اودھ میں جو نزاعات ہوئے تھے وہ سب ان کے توسط سے طے ہوئے۔ قاضی صاحب ۱۲۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کے منتہی تھے۔ تاریخ گوئی میں ملکہ تھا۔ مرزا غالب کو ان سے خاص عقیدت تھی۔ قاضی محمد خلیل حیرانؔ آپ کے فرزند کو ابتدائی عمر سے شوق سخن سنجی تھا اور نثر لکھنے میں خاص کمال حاصل تھا۔ نمونہ کلام :۔

دیکھ کر اس بت کو کیا کہئے کہ کیا یاد آگیا
ہم کو اس کی بے نیازی سے خدا یاد آگیا

سامنے سے یوں نکل جاتے ہیں وہ
ان سے گویا کچھ شناسائی نہیں

ہے سرِ شام ہی سے بھاری رات
ہائے کیسے کٹے گی ساری رات

(۲۰) جوہرؔ شاہجہانپوری :۔

حکیم معشوق علی خاں شاہجہاں پوری وکیل بھوپال۔ عالمانہ استعداد رکھتے تھے۔ فن سخن سے عشق تھا۔ عنفوان شباب میں غالبؔ کے فیض صحبت سے بہرہ ور ہوئے اور فخر تلمذ حاصل کیا۔ نظم و نثر دونوں میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ طبیعت جدّت پسند و معنی خیز پائی تھی۔ بعد میں بھوپال سے حیدرآباد چلے گئے۔ نمونہ کلام :۔

کیا اور جفا کا کوئی ارمان ہے باقی
کیوں آئے ہیں وہ بزم عزائے شہدا میں
بربادی گلشن پہ ہیں گل چاک گریباں
پیدا اثر درد ہے غنچوں کی صدا میں
آئی جو جوانی تو سکھاتی ہوئی آئی
یہ ناز یہ انداز یہ شوخی یہ حیا ہے
بوئے دفا نہ رنگ محبت گلوں میں ہے
بگڑا ہے نیل کیا چمن روزگار کا

(۲۱) جوہر دہلوی :-
جواہر سنگھ دہلوی تحصیلدار لبب گڑھ برادر ہیرا سنگھ ظلف چھجمل - اردوئے معلی میں ان کے اور ان کے بھائی کے نام دو دو خط ہیں - نظم فارسی سے ان دونوں بھائیوں کو شغف تھا - نمونہ کلام :-

نہ گبرم و نہ مسلماں بحیرتم کہ مرا
سوائے دوزخ و مینو کجا گزار افتد
خطِ رخ تو بدل دادہ خط آزادی
خوشم کہ در شکن زلف تابدار افتد
چکد زخامۂ جوہر سخن چنانکہ مگو
بزور موج دُر از بحر بر کنار افتد

(۲۲) حالی :-
شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی ولد خواجہ ایزد بخش پانی پتی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے - نو عمری کے زمانہ میں زیادہ تر دہلی رہے - اسی زمانہ میں نواب

شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کی تعلیم آپ کے سپرد ہوئی اور شیفتہ سے اصلاح لینے لگے۔ بعد میں حضرت غالب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ مرزا غالب کو دیوان علم قلعہ دہلی کے شاہی مشاعروں میں غزل پڑھتے سنا تھا۔ سخن فہمی اور سخن سنجی میں بے عدیل بے نظیر تھے۔ عربی استعداد عالمانہ تھی۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں آپ نے فکر سخن کی۔ اپنے استاد کا مرثیہ بے مثل کہا ہے۔ ان کے مدارج علمی اور سخن سنجی اور سخن فہمی کی وجہ سے مرزا غالب ان کا بہت لحاظ و ادب کرتے تھے۔ دہلی سے لاہور گئے اور وہاں نیچرل شاعری پر کاربند ہوئے۔ لاہور سے دہلی آئے اور ایک عرصہ تک عربک اسکول میں مدرس علوم مشرقی رہے۔ مسدس حالی۔ مناجات بیوہ۔ محاسن النساء۔ حیات سعدی۔ مقدمۂ دیوان۔ یادگار غالب۔ حیات جاوید۔ آپ کی غیر فانی تصانیف ہیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں سر سید کے ہمراہ حیدر آباد فراہمی چندہ علیگڈھ کالج کی غرض سے گئے۔ اور اس کے بعد حیدر آباد سے ان کا سو روپئے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا تو عربک اسکول کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ آپ کی ذات بابرکات میں خلوص اور نوازش بدرجہ اتم تھا۔ نہایت فرشتہ سیرت بزرگ تھے۔ ۳۱ ر دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا۔ نمونہ کلام :-

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جانتا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق ⁂ رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

حالیؔ نشاط نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

(۲۳) حبابؔ :۔

پنڈت امراؤ سنگھ۔ رڑکی کالج میں بیس پچیس سال تک مدرس ہیاق رہے۔ شاعری اور انشا پردازی کے شوق کو ملازمت کے ساتھ نبھاتے رہے تصوف۔ اخلاق اور وحدانیت کے مضامین کلام میں اکثر پائے جاتے ہیں طبیعت میں شوخی و جدّت بھی تھی ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۹ء میں بمقام لاہور انتقال کیا۔ نمونہ کلام :۔

گلشن میں گدگدی ہی نسیم سحر کی آج
گل ہنس دیا تو غنچہ بھی کچھ مسکرا دیا

جنون تعلیم تھی کیا بزم شب جو صبح ہوتے ہی
گریباں پھاڑتے گھر سے تمہاری ہمنشیں نکلے

نگاہ دیدۂ بے ہوش ہیں ہم
صدائے نالۂ خاموش ہیں ہم

(۲۴) حزیںؔ :۔

میر بہادر علی دہلوی متوسل ولیعہد بہادر۔ شاگرد عارفؔ و غالبؔ۔
نمونہ کلام :۔

ہے یہی رونا تو خط کاہے کو لکھا جائیگا
جو کہ لکھتے جائینگے اُسکو سے مٹتا جائیگا

میرا احوالِ زبوں ان پہ کھلے گا کیونکر
سامنے آئیں گے جب وہ تو سنبھل جاؤنگا

(۲۵) حقیر:-
منشی نبی بخش ولد منشی حسین بخش اکبر آبادی۔ محمد عنایت اللہ فلس متوطن بھیکم پور باشندہ کول آپ کے خوش گو و ممتاز شاگرد تھے۔ حالات و نمونہ کلام علیحدہ باب میں دیکھئے "درود غالب" آپ کی مثنوی ستارۂ ہند پریس سنہ ۱۸۶۲ء میں طبع ہو چکی ہے۔

(۲۶) خضر:-
خضر دہلوی۔ صاحب عالم مرزا خضر سلطان خلف بہادر شاہ ظفر سنہ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ غدر میں ان کو ان کے بھائی مرزا مغل اور ان کے بھتیجے مرزا ابوبکر کو میجر ہڈسن نے جیل خانہ دہلی کے قریب گولی سے مار دیا تھا۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ تلاش مضامین اچھی اور الفاظ کی نشست درست ہوتی تھی۔
نمونہ کلام:ـ

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

گالی سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق
جو تیری خو تھی وہ ہی مرا مدعا ہوا

جام جمشید کو آئینہ سکندر کو ملا
خضر ہیں وہ ہوں کہ حصے میں مرے دل آیا

(۲۷) خورشید:-
خورشید احمد حضرت شیخ احمد سرہندی کی اولاد میں سے تھے۔ شاہ

رؤف احمد رأفت اور شاہ سعد اللہ حیدر آبادی سے بیعت کی۔ ممالک دور دراز کا سفر کیا۔ فن شعر میں پہلے اپنے پیر رأفت سے آخر میں مومن اور غالب سے مستفید ہوئے۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر خوب کہتے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ نمونۂ کلام:-

جاتا نہیں آنکھوں سے تصوّر کبھی خورشید
موجود ہے ہر وقت وہ گویا مرے آگے

نوید وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید
کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے

(۲۸) ذکا:-

مولوی حبیب اللہ خاں میر منشی مقیم حیدر آباد مختار الملک کی سرکار میں متوسل تھے۔ اردوئے معلیٰ میں کئی خط ان کے نام ہیں۔

(۲۹) رابط:-

دہلی کے رہنے والے مولوی نادر علی برتر غازی پوری کے استاد تھے۔ دربھنگہ میں مقیم تھے۔

(۳۰) راضی:-

دیوان جانی بہاری لال جی اکبر آبادی۔ جانی بجنیاتھ کے بھائی تھے۔ آگرہ کالج میں تعلیم پائی۔ فارسی عربی اور انگریزی کے ماہر تھے۔ اعظم گڈھ اور بنارس میں ماسٹر رہے ۱۸۴۶ء میں پلٹن ۶۲ میں میر منشی ہو کر سات برس بنگالہ و کلکتہ، ڈھاکہ، الہ آباد اور اٹاوہ میں رہے۔ بعد میں ریاست بھرتپور میں وکیل ریزیڈنسی راجپوتانہ مقرر ہوئے۔ والئے میواڑ کے کئی برس اتالیق رہے۔ آخر عمر میں ریاست کچھ کے دیوان ہو گئے تھے۔ ان کا دیوان ۱۲۷۷ھ میں

مطبع دربار کچھ واقع بھاؤ نگر میں چھپا تھا گلستاں، بوستاں، اور انوار سہیلی کا اردو نظم میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ بڑے ذکی، فہیم، زود گو اور پُر گو تھے۔ تلاش مضمون اور نشست الفاظ اچھی تھی اور قصائد بھی اچھے کہتے تھے۔ نمونۂ کلام:۔

حسن سے جیتے جی نہ پایا تھا مرے گھر نے شرف
شکر ہے اس سے جنازہ کا تحمل ہو گیا
اس پری چہرہ نے سایہ ڈال کر
کر لیا ہے اپنا دیوانہ مجھے
کتاب سے مجھے الفت ہے اس لئے راضی
نہیں کتاب سا کوئی رفیقِ تنہائی

(۳۱) رسوا:۔
شیخ عبدالحمید ابن شیخ امداد علی غازی پوری مقیم آگرہ نظم فارسی میں غالب سے مستفید ہوئے۔ اردو میں مرزا تہر سے اصلاح لی تھی۔ ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ نمونۂ کلام:۔

کہا میں نے ذرا ٹھہرو تو دل اے دلربا ٹھہرے
کہا اس گیسوؤں والے نے اب کس کی بلا ٹھہرے
لب جاں بخش کے تیرے ہوئے کشتے جدا اے قاتل
عجب کیا ہے جو ان کی خاک بھی خاک شفا ٹھہرے

(۳۲) رضواں:۔
مرزا شمشاد علی بیگ برادر مرزا قربان علی بیگ سالک۔ خلف نواب مرزا عالم بیگ دہلوی ۱۲۵۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں وفات پائی۔ مرزا غالب سے فارسی پڑھی۔ شطرنج بے مثل کھیلتے تھے۔ بساط فرنگ ان کی تالیف ہے۔

چندے الور میں وکیل اور ڈپٹی مجسٹریٹ رہے۔ بڑے خلیق خوش طبع اور خوش فکر تھے کلام میں متانت اور پختگی پائی جاتی ہے۔ طبیعت کا میلان وقت پسندی اور نازک خیالی کی طرف تھا۔ فکر میں رسائی اور بلند پروازی تھی۔ نمونہ کلام :

گر نہ ہوں ہم تو ہو بازار میں گرمی کیونکر
ہم بھی تھے جنس گراں ارزِ دکانِ دہلی

کیا لطفِ زندگی دلِ غم مبتلا کے ساتھ
سیر جہاں کو آئے بھی تو کس بلا کیساتھ

آسودگانِ خاک نہ چونک اٹھیں پھر کہیں
آہستہ ذکر چاہیے اس بت کی چال کا

(۳۲) رضواں مرادآبادی :۔

نواب رضوان علی خاں مرادآبادی عضد الدولہ نواب محمد عظمت اللہ خاں دلیر جنگ ناظم صوبہ روہیلکھنڈ زمان شاہی کے خاندان میں سے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۳ھ میں وفات پائی۔ عربی فارسی میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ نغتیہ کلام کہنے کا عرصہ سے زیادہ شوق تھا۔ بڑے مشاق، پرگو اور خوش فکر شاعر تھے۔ حسان الہند کا خطاب خالدیا شاہا لم ملکہ معظمہ کی طرف سے ملا تھا۔ آپ کی کلیات موسوم بہ "تصویر خوبی" چھپ چکی ہے۔ نمونہ کلام :

ہو کوئی بات تو کچھ اسکا تدارک کیجے
خود بخود وہ تو عبث چیں بجبیں رہتے ہیں

ایک دن بھی تجھکو رحم آیا نہ اے صیاد حیف
گو اسیران قفس نے مدتوں فریاد کی

دل ہے یا کوئی مرقع ہے پریزادوں کا

سیکڑوں تم سے مرے دل میں حسیں رہتے ہیں۔

(۳۴) رعنا:۔

نواب مراد علی خاں۔ نمونۂ کلام :۔

نے شام اودھ ہے نہ بنارس کی بھور
ہے آب و ہوا سارے جہاں کی آخور
امداد سے آگرے کے ہے گور عیاں
رعنا بھی آگرے میں ہی زندہ در گور
گزرا ہی مرا نالۂ دل چرخ کہن سے
تھا روح کا ہمدم نہ پھرا جا کے وطن سے

(۳۵) رنج:۔

رنج میرٹھی۔ حکیم محمد فصیح الدین قصائد بہت آب و تاب کے کہتے تھے۔ آپ کی شاعری کا میرٹھ میں اچھا چرچا تھا۔ "تذکرہ بہارستان ناز" ان کی تالیف ہے۔ نمونۂ کلام :۔

اک بار اور میری عیادت کو آئیے
اچھی طرح سے میں ابھی اچھا نہیں ہوا

(۳۶) رنجور:۔

رنجور دہلوی۔ نواب علی بخش خاں خلف نواب الٰہی بخش خاں معروف۔ مرزا غالب کے برادر نسبتی تھے۔ ۱۸۶۳ء میں انتقال کیا۔ آپ کے صاحبزادے مرزا غلام فخر الدین سے مرزا غالب کی بھتیجی عزیز النسا بیگم کی شادی ہوئی تھی۔ فارسی استعداد اچھی تھی۔ حواشی ملاحظہ فرمایئے۔

(۳۷) روشن و حالب دہلوی

دیوان روشن لال ابن دیوان منا لال کالستھ۔ ابن دیوان گردھاری لال ابن دیوان چھٹن لال مورخ بعض احباب انھیں مرزا دولھا اور بعض صرف استاد کہتے تھے۔ انھیں دعویٰ کمال تھا۔ ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے بازار سیتا رام دہلی میں رہتے تھے۔ پھر دریا گنج فیض بازار میں رہنے لگے۔ غالب سے تلمذ کا دعویٰ تھا۔ بظاہر کوئی اصلیت معلوم نہیں ہوتی۔ آپ کے لڑکے ماسٹر بھگوتی پرشاد عرف بشمبر سروپ جالب تخلص کرتے تھے۔ دیوان جالب ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا تھا۔
نمونۂ کلام:-

ابھی سے کیا فسوں دل پر کیا ہے چشم میگوں نے
کہ ہم کعبہ سے پھر کر ہو گئے رہگیر میخانہ
یہی گر دور دورہ میکشی کا ہے زمانے میں
تو کعبہ سے کہیں بڑھ جائیگی توقیر میخانہ

(۳۸) زکی:-

زکی دہلوی۔ حافظ سید محمد ذکریا خاں ڈپٹی انسپکٹر مدارس یو۔ پی ولد حافظ سید محمود خاں محمود ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا۔ زینت باڑی میں بزرگوں کے مکان تھے۔ بڑے نازک طبع اور نازک خیال شاعر تھے۔ مرزا غالب کے رنگ کی تقلید ان کے شاگردوں میں آپ سے زیادہ کوئی نہ کر سکا۔ مرزا غالب نے ایک سارٹیفکٹ بھی دیا تھا جو آپ کے مطبوعہ دیوان میں درج ہے۔ پنڈت رام کشن بسمل و شیخ امام بخش صہبائی کے فیض تعلیم سے فارسی عربی منطق و ریاضی میں بہرہ ور ہوئے تھے۔ فن طب میں بھی دخل تھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں فکر کرتے تھے۔ بسلسلہ روزگار میرٹھ۔ گورکھپور، بریلی الہ آباد اور بدایوں میں مقیم رہے۔ بدایوں سے پنشن لی اور وہیں سب رجسٹرار

ہو گئے تھے۔ شعر معنی خیز اور لطیف کہتے تھے۔ درویشوں سے عقیدت تھی۔ قدیم تہذیب کے ایک دل پسند نمونہ تھے۔ پابندی وضع، انکسار، خلق، کم سخنی سے متصف ہونے کے علاوہ نکتہ سنج و زود فہم تھے۔ مولوی حشمت کلکٹر شاہجہانپوری پنڈت ساقی دہلوی۔ اسیر دہلوی۔ اختر صدیقی ان کے نامور شاگرد تھے۔

نمونہ کلام:۔

دم یہاں لب پر کہ اعجازِ مسیحا دیکھئے
ان کو خاموشی کہ انجام تمنا دیکھئے

کیا برباد سعیٔ ناخدا کو میری قسمت نے
کہاں جا کر ڈبویا جب کنارے پر سفینہ تھا

ہاں اہل بزم دعوئے ذوق نظر درست
سرگرم جلوہ وہ بت طناز ہی نہیں

نہ پوچھ اے کہ روح پرور ہوئی ہی کیا کچھ بہار دہلی
دم مسیحا نسیم جنت بنا ہے اڑ کر غبار دہلی

(۳۹) سالک:۔

مرزا قربان علی بیگ خلف نواب مرزا عالم بیگ خاں دہلوی۔ الور میں وکیل تھے۔ رضواں ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ پہلے مومن کو کلام دکھایا۔ پھر غالب کے شاگرد ہوئے۔ نازک خیالی مضمون آفرینی فصاحت و بلاغت آپ کے کلام کے جوہر ہیں۔ صاف اور نفیس بندش ہوتی ہے۔ اشعار میں سوز و گداز ہے۔ طرز ادا دلکش و نادر ہے۔ عامیانہ روش سے بچتے ہیں۔ آپ کے چچا ارن بہادر خاں دہلی سے حیدرآباد چلے گئے تھے۔ آپ انھیں کے ہاں رہتے تھے ۱۸۸۰ء میں حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔ سفدر بلگرامی نے قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا۔ ان کے

دو بیٹے محمد مرزا خاں عابد اور حیدر مرزا قلندر تھے۔ ہنجار سالک، دیوان اوّل اور میخانۂ سالک دیوان دوم شائع ہو چکے ہیں۔ حکیم اسد علی مضطر دہلوی ان کے مشہور شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام:ـــ

میرا ہوا آشیانہ اور آدھا جلا ہوا
بجھ بھی گئی تھی آگ تو بجلی کو کیا ہوا
ناچار ہوا وادیٔ محشر کو روانہ
جس فتنہ نے پایا نہیں رستہ مرے گھر کا
انسان ہوس پیشہ ہے کیا ہو نہیں سکتا
مجبور ہے اس سے کہ خدا ہو نہیں سکتا
تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

(۴۰) سجادؔ:ـ

نواب سید سجاد مرزا دہلوی خلف معین الدولہ صفدر الملک نواب ذوالفقار جنگ بہادر المعروف بہ نواب ناظر حسین مرزا ابن نواب حسام الدین حیدر خاں نامیؔ نہایت پاکیزہ خیال اور جادو مقال شاعر تھے۔ پیرایۂ بیان دلگداز اور تخیل کرشمہ ساز تھی۔ مرزا سالکؔ سے بھی مستفید ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔ میر شاہجہاں کاملؔ دہلوی نے تاریخ وفات کہی۔

ہے ہے از پشتِ اسپ افتادہ

(۴۱) سخنؔ:ـ

خواجہ محمد فخر الدین حسین دہلوی ولد خواجہ جلال الدین حسین المعروف بہ حضرت صاحب ابن خواجہ فقیر چشتی مودودی ضلع آرا صوبہ بہار شاہ آباد کی عدالت

دیوانی میں وکالت کرتے تھے۔ بہت خوش فکر اور معنی آفرین شاعر اور عمدہ نثر نگار تھے۔ کلکتہ کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوئے۔ بہار اور بنگال کے شعرا سے معرکہ آرا رہے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ دلی کے ساتھ دلی محبت تھی فسانہ عجائب کے جواب میں سروش سخن ۱۸۶۰ء میں لکھی۔ اردو اور فارسی کے دیوان ۔ اور تہذیب النفوس چھپ گئی ہیں۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ کلام میں سادگی، رنگینی، بے ساختہ پن، مضمون آفرینی سب کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ساطع برہان کے جواب میں غالب کا جو مشہور قطعہ فارسی ہے جس کا پہلا مصرعہ مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ ہے۔ اس کے جواب میں فدا سلہٹی نے قطعہ فارسی لکھا۔ فدا کے قطعہ کے جواب میں سخن دہلوی نے فارسی میں اسی ردیف و قافیہ و بحر میں ایک قطعہ لکھا۔ فدا نے جواب الجواب میں ایک فارسی قطعہ لکھا۔ جواہر سنگھ جوہر لکھنوی کی شمشیر تیز کے جواب میں بھی سخن دہلوی نے ایک اور قطعہ فارسی لکھا تھا۔ آغا شمس لکھنوی نے ایک رسالہ ایرادات بر کلام غالب فارسی میں لکھا جس میں غالب کے کلام پر اعتراض تھا۔ سخن دہلوی نے اردو میں اس کا جواب بھی تحریر کیا۔ ہنگامہ دل آشوب میں یہ قطعات نثر درج ہے۔ نمونہ کلام :-

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

کوئی بلا سے جگر کے پہلو نکال لے
یار وجود دل بھی ہے تو اک ذرہ ہم نہیں

عدو کے نام پہ کیوں اس قدر جلال آیا
تمہارے دل میں خدا جانے کیا خیال آیا

(۲۸) شرور :-

چودھری عبدالغفور سرور مارہروی۔ مرزا غالب کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اُن کے نام متعدد خطوط بنیز رائے موصوف اردوئے معلی اور عود ہندی میں موجود ہیں۔

(۴۳) سروش:۔

صاحبزادہ عبدالوہاب خاں نبیرہ نواب غلام محمد خاں والیٔ رامپور۔ طبیعت نرالی اور فکر عالی تھی۔ معاملہ اور زبان خوب لکھتے تھے۔ فن سخن میں مومنؔ سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ نمونۂ کلام :۔

سرکار سر اپنا مرے زانو پہ نہ رکھو
سو بھی رہو جا کر وہیں جاگے ہو جہاں آج
قتل عالم کو کیا ایک نظر میں تو نے
کون باقی ہے ستمگار جو پرساں ہوگا
شکل آئینہ جو خالق مجھے پیدا کرتا
وہ تجھے دیکھتے اور میں انھیں دیکھا کرتا

(۴۴) سوزاں:۔

حبیب الدین احمد ولد خواجہ معین الدین انصاری۔ سہارنپوری فارسی کی معقول استعداد تھی حسن پرستی نے گرمیٔ طبع کو اور چمکا دیا۔ دہلی میں مدت مدید تک رہے۔ بعد انتقالِ غالب سہارنپور واپس چلے گئے۔ اخبار الاخیار کے ایڈیٹر رہے۔ تاریخ عجیب در حالات حکمائے یونان، تریاق سموم، تاثیر الفلوب گنج شائگاں (علم قافیہ میں) ان کی تصنیف و تالیف ہیں۔ زندہ دل قانع اور صابر آدمی تھے ۱۸۲۳ء میں پیدا ہوئے ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔ کلام میں شوخی بہت تھی۔ بڑے ذہین۔ طباع، بلند پرواز اور نازک خیال شاعر تھے۔

نمونہ کلام :۔

غالب سے کام تھا سو وہ سوزاں گذر گئے
دہلی میں اب حباب کا کیا کام رہ گیا

دھو سکے تو اپنے دل کے داغ دھو
شیخ منہ کو ہر گھڑی دھوتا ہے کیا

سوزاں کو آپ کہئے فرشتہ خصال ہے
ہم تو یہی کہیں گے کہ کچھ آدمی نہیں

(۴۵) سیّاح :۔

میاں داد خاں اورنگ آبادی ولد منشی عبداللہ خاں اورنگ آبادی آپ کے والد نامی رئیس تھے۔ بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی۔ زندہ دلی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ شوخی، ظرافت، بذلہ سنجی میں فرد تھے۔ ذہین و طباع تھے۔ نواب میر غلام بابا خاں رئیس اعظم سورت کے مصاحب و رفیق ہو گئے تھے پہلے عشاق تخلص کرتے تھے مرزا غالب نے ۱۸۶۴ء میں سیاح تخلص تجویز کیا اور سیف الحق کا لقب عنایت کیا۔ مرزا غالب انھیں بھی بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ہندوستان، عرب و عجم کی سیر کی تھی۔ فارسی خوب بولتے تھے۔ ۔ ۱۸۸۰ء میں مقدمہ قلب سازی میں سزایاب ہوئے۔ منشی نولکشور سے بڑی دوستی تھی۔ لکھنو۔ کانپور۔ اور دہلی جب کبھی جاتے تو خود مصرع طرح دے کر مشاعرے کرتے تھے۔ عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں ان کے نام متعدد خطوط ہیں طبیعت نکتہ سنج اور معنی یاب تھی۔ پڑھنے کا انداز نہایت دلفریب تھا۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے ۱۹۰۷ء میں بمبئی میں انتقال کیا۔ دیوان سیاح اور سیر سیاح انکی تصنیفات ہیں۔ لطائف غیبی ان کے نام سے شائع ہوئی لیکن اصل میں غالب کی تصنیف ہے

نمونہ کلام:

آئے ہیں عیادت کے لئے غیر کے ہمراہ
ساتھ اپنے مری موت کو بھی لائے ہوئے ہیں

جس شخص کے پہلو میں نہ دل ہو نہ جگر ہو
پھر کیا اسے تیر نگہ ناز سے ڈر ہو

کہہ دو سنبھل کے میکدہ میں آئے محتسب
ٹوٹیں گے خم ضرور مگر اس کے سر کیساتھ

(۶۴) شاداںؔ دہلوی:۔

مرزا حسن علی خاں خلف اصغر نواب زین العابدین خاں عارفؔ، ریاست رامپور میں بزمرۂ شعرائے دربار ملازم تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار ملتے تھے۔ آخر زمانہ میں مالیخولیا ہو گیا تھا مرض یہاں تک بڑھا کہ پانی بھی پینا بہت کم کر دیا۔ ایک چھوٹی سی سیپ کی ڈبیا میں احتیاط کی وجہ سے پانی پیا کرتے تھے غالبؔ کی وفات کے بعد حالیؔ اور سالکؔ سے بھی مشورہ سخن کیا۔ سجادؔ۔ ارشدؔ۔ طالبؔ مشتاقؔ کے ہم صحبت و ہم مشق تھے۔ جودت فکر۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی طرف طبیعت مائل تھی۔ طرز شاعری میں عارفؔ کے مقلد تھے۔ حواشی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ نمونہ کلام:

غیروں پہ ہیں وہ لطف کہ بڑھتے ہیں ہمیشہ
ہم پر یہ ستم ہے کہ سوا ہو نہیں سکتا

اس موت پہ قربان کروں زندگیٔ خضر
اس کوچہ میں پہنچی مرے مرنے کی خبر آج

وہ دیکھنے آتے ہیں مرے درد جگر کو ٭ اچھا ہے جو بڑھ جائے مرا زور جگر آج

میں اپنی داستانِ محبت جو کہہ چکا
وہ پوچھتے ہیں مجھ سے وہ نازک کہاں کے ہیں

(۴۷) شائق :-

خواجہ فیض الدین عرف خواجہ حیدر جان، باشندۂ ڈھاکہ ولد خواجہ خلیل اللہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر پر گو رہتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔

نمونۂ کلام :-

اسی نے کیا مجھ کو رسوائے عالم
کہ جس نے تجھے عالم آرا بنایا
شیشہ گر کیا ہی بنا تجھ سے جو پیکر شیشہ
سنگ کا اس سے بنا تا ہوں میں بہتر شیشہ
کوئی رفتۂ ملک عدم نہ پھرا کہ جو کہے دل وہاں کا میں حال ذرا
ہے مقام عجب کہ ہے کیسی وہ جا جو گیا تو وہاں سے پھرا ہی نہیں

(۴۸) شوخی :-

نادر شاہ خاں رامپوری کلکتہ میں لسلسلۂ تجارت قیام تھا۔ اخلاق حسین اخلاق دہلوی قرابت دار حضرت ظہیر دہلوی ان کے خوش فکر اور نامور شاگرد تھے۔

(۴۹) شاکر :-

مولوی عبد الرزاق۔ فارسی اور عربی میں استعداد عالمانہ تھی۔ اکبر آباد میں سکونت پذیر تھے۔ اردوئے معلّیٰ میں آپ کے نام چند خطوط ہیں۔

(۵۰) شاہ عالم :-

صاحبزادہ شاہ عالم خلف صاحب عالم مارہروی المتخلص بہ صاحب خلف پیارے صاحب۔

(۵۱) شفق :-

انوارالدولہ نواب سعدالدین احمد خان بہادر عرف منجھلے صاحب۔ ریاست کرورہ باڈلی میں سکونت تھی۔ میر امجد علی قلق لکھنوی ثم کدوروی کے شاگرد تھے۔ آخر عمر میں غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ آپکے والد نواب احمد بخش خان بیتاب تخلص کرتے تھے۔ دیوان اور مثنوی شفق آپکی تصنیف ہیں۔ مولد منظوم موسوم بہ مخزن السعادت ۱۲۶۹ھ میں طبع ہو چکا ہے۔ خواجہ نورالدین خان شفیق عرف سالونے صاحب آپ کے بھائی تھے۔ حواشی بھی دیکھئے۔ ۱۲۹۸ھ میں انتقال کیا۔ آپ کے صاحبزادہ خواجہ محی الدین عرف بتو صاحب حافظ اور آپ کے برادر زادہ خواجہ حمیدالدین نجم بھی شاعر تھے۔ **نمونہ کلام :-**

ہاتھ دکھلا کر مجھے دیوانہ دمفتوں کیا
ہیں لکیریں یا کہ ہیں نقش محبت ہاتھ میں
بگولے لیتے ہیں تعلیم مجھ سے ہرزہ گردی کی
کہ آندھی ہوں میں صحرائے جنوں کی خاک اڑانے میں
یہ ضعف ہے کہ سانس کا لینا محال ہے
بار گراں ہے روح تنِ زار کے لئے

(۵۲) شیفتہ :-

نواب حاجی محمد مصطفےٰ خان بہادر دہلوی خلف اعظم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضےٰ خان بہادر مظفر جنگ رئیس پلول وجہانگیر آباد۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص تھا۔ مومن کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی دیوان شائع ہو چکے ہیں سفرنامہ حج بیت اللہ بھی طبع ہو چکا ہے۔ غالب کے بڑے مداح اور رفیق تھے۔ مرزا غالب کے ایام اسیری میں خاص طور پر مدد کی۔ فارسی اور عربی کے عالم متبحر

تھے۔ تذکرۂ گلشنِ بیخار آپ کی سخن فہمی اور نقادی کی شاہد ہے۔ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۱ء میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام:۔

اک قدم جانا جنہیں دشوار تھا
شوق لے کر سینکڑوں منزل گیا

شوق کو آج بے قراری ہے
اور وعدہ ہے روز محشر کا

کس تجاہل سے یہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو
تیرے کوچے میں ستمگار ترے کوچے میں

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

(۵۳) صوفی منیری:۔

شاہ جلیل الرحمٰن حسین عرف شاہ فرزند علی۔ باشندہ منیر شریف ضلع پٹنہ صوبہ بہار۔ نمونہ کلام:۔

مجھ کو کہ مدتوں میں قفس سے رہا ہوا
صبح وطن ہے شامِ غریباں کہیں جسے

سعئی طلب میں سرمہ کروں چشمِ شوق کا
وہ اک کفِ غبار بیاباں کہیں جسے

حال سوز و گداز کا میرے
مجھ پہ اے رشکِ شمع روشن ہے

خوش ہوں جنوں سے میں کہ وہ کرتے ہیں التفات
ہے صبح عید چاک گریباں کہیں جسے

(۵۴) صوفی:-

حکیم محمد علی نجیب آبادی متوسل ریاست جے پور۔ نمونہ کلام:-

بیٹھے یوں غیر تری مسند کمخواب کو داب
بارِ غم کیونکہ نہ ہوئے سرِ احباب کو داب

(۵۵) صفیر:-

سید فرزند احمد صفیرؔ خلف سید احمد خلف سید غلام یحییٰ یحییٰ داروغہ آبکاری ضلع مونگر باشندہ بلگرام مقیم شاہ آباد وآرہ صوبہ بہار۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے۔ قصہ بوستان خیال، مثنوی اعجاز کلیم، معراج الخیال وتذکرہ جلوۂ خضر، وخمخانہ صفیر وصلوات صفیر، صفیر بلبل، تاریخ بلگرام رشحات صفیر و فیض صفیران کی مشہور تصانیف ہیں۔ نظم ونثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۳۰۷ھ میں انتقال کیا۔

نمونہ کلام:-

پھر کیا کریں نہ روؤں جو کچھ کہہ کے ملئے دل
اک درد رہ گیا ہے فقط اب بجائے دل
باتیں سُن سُن کے اس کی جیتے ہیں
چشمہ خضر ہے دہن ہم کو

(۵۶) صادق:-

محمد عزیز الدین برادر محمد سعید الدین سعید خلف مولوی اساس الدین متوطن بدایوں باشندہ دہلی پہلے عزیز تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام:-

ہے تا بعد مردن بھی علامت جذب کی باقی
بنا ناسنگِ مقناطیس سے صادق کفن کو

لے گئی دل اک نگہ میں اس کی چشم نیم خواب

ہم سمجھے تھے اس کو پر بہت ہشیار ہے

(۵۷) طرار :-

میرزا سرفراز حسین استاد پنڈت جگ موہن ناتھ ہگو فدا دہلوی خلف پنڈت جوالا ناتھ ہگو۔ فدا سید ابرار مکی مدنی کے مرید تھے اور گوالیار اور انبالہ میں قیام تھا۔

(۵۸) ظفر :-

ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی خلف اکبر شاہ ثانی، شاگرد شاہ نصیر و ذوق۔ آخر ایام سلطنت میں غالب سے بھی مستفید ہوئے۔ نمونہ کلام :-

نہ پائے گا کوئی ہم کو بر نگ نقش قدم

ہم ایسا خاک میں اپنا نشاں ملا دینگے

ظفر اس کو نہ آدمی جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

(۵۹) ظہیر :-

لالہ پیارے لال نے ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔

(۶۰) طالب دہلوی :-

مرزا سعید الدین احمد خاں خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر شاگرد مرزا غالب۔ نیر کا مجموعہ کلام "صحیفہ زریں" آپ ہی نے ترتیب دیا۔ نمونہ کلام :-

طالب کی لو خبر کہ وہ بیمار ناتواں

دنیا میں کوئی دم کیلئے مہماں ہے اب

قفس صیاد نے گلشن میں رکھا ہی زہے قسمت

اگرچہ ہم ہیں زنداں میں پہ رہتے ہیں گلستاں میں

در سے اس کے اٹھے اٹھائے ہوئے
ناتوانی ذرا سنبھال ہمیں

## (۶۱) عارف دہلوی :-

نواب زین العابدین خاں خلف نواب غلام حسین خاں مسرور ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۲ء میں وفات پائی۔ آپ کے بھائی نواب مرزا غلام حسن خاں محو بھی شاعر تھے۔ عارف اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حواشی بھی ملاحظہ کیجیے۔ نمونہ کلام

نزاکت است ترا باعث درستی عہد
دگر نہ شیوۂ خوباں شکست سوگند است

دیوانگی میں غیر کو دوں خاک گالیاں
اب مانتا ہے کون برا میری بات کا

ہم تو دیوانے ہیں مجنوں کی کہے جائیں گے
ہیں حسیں آپ طرفداری لیلیٰ کیجے

## (۶۲) عاشق :-

محمد عاشق حسین خاں بن محمد حسین خاں اکبرآبادی۔ نمونہ کلام :-

شور سن کر وہ دریچہ سے نظر کرتے ہیں
آج نالے مرے ممنونِ اثر کرتے ہیں

## (۶۳) عاشق دہلوی :-

منشی محمد اقبال حسین خلف منشی نورالدین احمد وکیل و معتمد راج بیکانیر متعینہ ریزیڈنسی راجپوتانہ مقیم کوہ آبو۔ صاحب دیوان ہیں۔ زبان صاف اور شستہ لکھتے ہیں۔ نمونہ کلام :-

کبھی ختم آپ کے جور و تظلم ہو نہیں سکتے
کبھی پورا ہمارے غم کا دفتر ہو نہیں سکتا

مر کے پردہ رہ گیا عاشق کا یہ اچھا ہوا
دربدر کوچہ بکوچہ مدتوں سے خوار تھا

گر ہماری بندگی ہے ناقبول
تو بتوں کی بھی خدائی ہو چکی

(۶۴) عاقل رامپوری :-

صاحبزادہ محمد رضا علی خاں خلف صاحبزادہ اصغر علی خاں اصغر ابن نواب عبداللہ خاں ظریف صدر الصدور میرٹھ وعم نامدار نواب یوسف علی خاں ناظم آپ کے بھائی صاحبزادہ زین العابدین خاں عابد مقیم جے پور بھی شاعر تھے ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔ مرزا سالک دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ عرصے تک دلی میں رہے۔ نمونۂ کلام :-

قتل کرتا ہے اک نگاہ میں وہ
اور ابھی دیکھنا نہیں آتا

مجھے قتل کا رنج ہرگز نہیں
یہ غم ہے عدو کا کہا ہو گیا

(۶۵) عاشق اکبر آبادی :-

ماسٹر شنکر دیال ایم اے بی ایل آگرہ کے سربرآوردہ وکیل و آنریری مجسٹریٹ تھے۔ آگرہ کالج کے ٹرسٹی بھی رہے۔ اکثر و بیشتر فارسی کہتے تھے۔ پربھو دیال شام اکبر آبادی آپ کے خلف الصدق تھے۔ نمونۂ کلام :-

پھر تمنا کو ہوا ہوش کہ اصرار کرے
پھر تغافل نے نکالا نیا طرزِ انکار

(۶۶) **عزیز**:۔

مرزا یوسف علی خاں خلف مرزا نجف علی خاں جنوں خلف مرزا محمد علیخاں دیوانہ بنارسی۔ بڑے عالی خاندان اور صاحب استعداد تھے اور اچھے شاعر بھی تھے عہد شاہی میں تیس روپے تنخواہ قلعہ معلیٰ سے پاتے تھے۔ بعد غدر دہلی کے اسکول میں مدرس ہو گئے تھے۔ آپ کے والد اطراف دہلی میں سررشتہ دار و تحصیلدار رہے۔ مرثیہ گو بھی تھے۔ دبیر کے کئی مرثیوں کا جواب لکھا۔ انیس و دبیر کے مرثیوں میں بہت سی غلطیاں بھی نکالی تھیں۔ نمونۂ کلام:۔

بدطالعی سے نیک نہ ہوگا مآل کار
بگڑی میں کوئی کام بنایا نہ جائے گا
ناصح کی ناتوانی میں ہم سن کے کیا کریں
سر ان کے آستاں سے اٹھایا نہ جائیگا
ہم یہ کہ اپنی مرگ کو تم بن طلب کریں
تم وہ کہ ہم کو تم سے بلایا نہ جائے گا

(۶۷) **علائی**:۔

نواب علاء الدین خاں خلف نواب امین الدین خاں صاحب بہادر والئے لوہارو۔

نمونۂ کلام:۔

ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے جن کو راز و نیاز
اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آوارگانِ گلکدہ آزو آرزو

حاشا اگر تمہیں سرِ سیر و فراغ ہے

رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشم دل

کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے

(۶۸) میر عالم علی خاں:۔

میر عالم علی خاں برادر نواب میر ابراہیم علی خاں وفا ساکن بڑودہ۔

(۶۹) عالم:۔

شاہ عالم خلف شاہزادہ غلام محمد ابن ٹیپو سلطان باشندۂ ٹالی گنج، کلکتہ۔ مولوی نجم الدین حسین نادر سے بھی مستفید ہوئے۔ نمونۂ کلام:۔

کیا عجب گلریز آتش بار شاخِ گل کی طرح

ہاتھ میں تیرے جو لے رشک بہاراں سبزہو

(۷۰) فنا:۔

حکیم میر احمد حسن۔ ان کا اصلی وطن سہسوان تھا۔ عرصہ سے بڑودہ میں سکونت پذیر تھے۔ ان کے لڑکے حکیم حافظ میر محمود حسین افسر۔ شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔

(۷۱) قدر بلگرامی:۔

سید غلام حسین پروفیسر فارسی و عربی کیننگ کالج لکھنؤ۔ آپ کے والد کا نام سید خلف علی بلگرامی تھا۔ مثنوی قضا و قدر ان کی تصنیف ہے۔ تجر لکھنوی کو بھی اپنا کلام دکھایا تھا۔ عروض پر بھی ایک کتاب موسوم بہ قواعد العروض لکھی ہے نمونۂ کلام:۔

یہ ضبط عشق ہے کہ نہ نکلے گی منہ سے آہ

ایسے جلیں گے ہم کہ نہ ہوگا دھواں بلند

(۷۲) کاشف:۔

سید بدرالدین احمد معروف بہ فقیر۔ سالک بھی تخلص کرتے تھے اور بیخود دہلوی کے جدِّ امجد تھے۔ ان کے نام بھی مرزا کے بہت سے خطوط اردوئے معلےٰ میں شامل ہیں۔

(۷۳) کامل:۔

مرزا باقر علی خاں دہلوی خلف مرزا زین العابدین خاں عارف ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۶ء میں وفات پائی۔ نمونہ کلام:ـــ

اٹھانے پڑیں گے یہ ساقی کے ناز

کہ پیرِ مغاں آشنا ہوگیا

یاد آنا کسی کے کاکل کا

تیرہ ساز شب جدائی ہے

(۷۴) کرامت:۔

سید شاہ کرامت حسین ہمدانی گیاوی۔ ان کے بیٹے سید شاہ علی حسین عالی تخلص کرتے تھے۔ ان کے پوتے سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی ایم اے بی ایل ہیں۔ جنہوں نے چند سال ہوئے نادر خطوط غالب شائع کئے تھے

(۷۵) محو:۔

نواب غلام حسین خاں خلف نواب سید غلام حسین خاں مسرور دہلوی۔ ذوق سے بھی شرف تلمذ رکھتے تھے۔ ان کے والد ماجد کو ستار نوازی میں کمال حاصل تھا۔

نمونہ کلام:ـــ

قیدِ ہستی سے رہائی غیر ممکن تھی ہمیں
آج دم دے کر اجل کو ہو گئے آزاد ہم

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں اب بام پہ وہ بھی
اتنا تو ہوا ہے مرے نالوں کے اثر سے

انداز جنوں کونسا ہم میں نہیں مجنوں
پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

(۷۶) مجروحؔ دہلوی :-

میر مہدی حسین خلف میر حسین فگار دہلوی۔ مرزا غالبؔ کے اردو مکاتبت میں سب سے پہلے مقلد تھے۔ آپ کے والد میر فقیر اللہ فقیر کے نبیرہ اور میر نظام الدین ممنوں کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۳۱۶ھ میں اپنا دیوان "مظہر معانی" کے نام سے چھپوایا۔ کلام کے دو اور مجموعے انوار الاعجاز اور ہدیۃ الائمہ کے نام سے شائع ہوئے۔ تاریخ گنج غرائب بھی آپ کی تالیف ہے جو ابھی تک شائع نہ ہو سکی۔ میرے پاس محفوظ ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ھ میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام :-

ہم تم کو برا کہتے ہیں یا خو کو تمہاری
لو خو کے بھی اچھے سہی، جھگڑا نہ کرو تم

چلے آؤ جلدی سے دیکھے گا کون
مرا دن ہے بدتر شبِ تار سے

کچھ ان بن ہو چلی ہے باغباں سے
بس اب نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

کوئی پیش آنا ہے روزِ سیاہ
شبِ ہجر کی جو سحر ہو گئی

(۷۷) مداح:۔
شیخ محمد صادق علی مقیم سکندرہ ضلع علیگڈھ۔سوزاں بھی تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام:۔

اسکو بلوایا تو ہے لطف تبھی دل آئے
ساتھ تلوار بھی لائے جو وہ قاتل آئے

ایسا نہ ہو کہ ظلم سے بھی ہاتھ اٹھائے یار
کیوں کہیئے ناز اٹھانے کی طاقت نہیں رہی

(۷۸) مقتول:۔
پنڈت لچھمی نرائن ابن پنڈت گوبردھن داس متوطن فرخ آباد
نمونہ کلام:۔

سامری آخر اسیرِ دام الفت ہو گیا
چشم فتاں میں تری جادو کا سرمہ دیکھکر

(۷۹) مقصود:۔
سید مقصود عالم رضوی۔ باشندۂ پھانی، صاحب مثنوی و دیوان اردو فارسی ہیں۔نواب عاشور علی خاں سے بھی شرف تلمذ رکھتے تھے۔سید وزیر علی منظور آپ کے ہمشیرزادہ اور شاگرد تھے۔شاعری میں پایۂ استادی رکھتے تھے۔نمونہ کلام:۔

سرو و شمشاد سے ہے وہ قدِ آزاد الگ
جیسے مضموں کسی شاعر کا خداداد الگ

دوست وہ ہے کہ رہے دوست کا مشکل میں شریک
مجھ سے فرقت میں نہ ہوا اے دلِ ناشاد الگ

(۸۰) مشتاق دہلوی :-

منشی بہاری لال دہلوی خلف منشی من بھاون لال ۱۹۰۶ء میں انتقال کیا - ان کے بیٹے چندو لال شفق تخلص کرتے تھے - مشتاق مطبع اکمل المطابع دہلی کے منتظم تھے - ان کے بھائی گوری شنکر قیصر بھی شاعر تھے - اردوئے معلیٰ میں ان کے نام کئی خط ہیں - نمونہ کلام :-

یوں ترے ساتھ بزم میں دشمن کا بیٹھنا
وہ اعتراض ہے کہ اٹھایا نہ جائے گا

ہوگا اثر جو دل میں تو خود جان لینگے وہ
مشتاق ہم سے عشق جتایا نہ جائے گا

جہاں جاگے وہیں انگڑائیاں لو
یہاں پھیلائی ہے سستی کہاں کی

(۸۱) منشی دہلوی :-

منشی سیلچند دہلوی افسر دار الانشاء ریاست رامپور - ۲۹ دسمبر ۱۸۹۴ء کو انتقال کیا

(۸۲) مونس :-

پنڈت شیو جی رام صاحب دیوان ہیں

(۸۳) میکش دہلوی :-

میر ارشاد احمد ولد میر قادر علی دہلوی مقیم بھوپال

(۸۴) میکش دہلوی :-

میر احمد حسین دہلوی ولد میر کرار حسین نہایت خوش فکر شاعر تھے۔ اور تاریخ بہت اچھی کہتے تھے - ہنگامۂ غدر مخنوق ہوئے - اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکر کرتے تھے - نمونہ کلام :-

گفتمش دے بہ کہ مے رفتی خراماں سوئے باغ
گفت میکش بودہ باشد کاں گرفتار منست

(۸۵) ناظم :۔

نواب یوسف علی خان والئی رامپور خلف نواب محمد سعید خان بہادر فارسی و عربی میں اچھی دستگاہ تھی۔ دہلی میں عرصہ تک رہے۔ غیاث الدین رامپوری مولف غیاث اللغات اور مفتی صدر الدین آزردہ کے فارسی اور عربی میں شاگرد تھے۔ نمونہ کلام :۔

دل سے ہائے جان کے دشمن کہ نہ اتارا ہوتا
چڑھ گئے تھے ہم اگر زد پہ تو مارا ہوتا
میں جانتا ہوں میری فغاں سے اڑی ہے نیند
واں جاگتے ہیں غیر کے وہ انتظار میں
معرفت عابد و زاہد کو کہاں ہے ناظم
بس یہ اتنے ہیں کہ اوراد و مسائل سمجھیں

(۸۶) نامی :۔

منشی شیو دیبی دیال عرف منیب جی مقیم اکبر پور ضلع فیض آباد کلرک ڈسٹرکٹ بورڈ اناؤ۔ تذکرہ بہار سخن میں ان کے نام میں اختلاف ہے۔

(۸۷) نیر دہلوی :۔

نواب ضیاء الدین احمد خان رئیس لوہارو خلف الرشید نواب احمد بخش خان بہادر مرحوم والئی فیروز پور جھرکہ ۱۸۸۳ء میں وفات پائی حواشی دیکھئے نمونہ کلام۔

پیری و مفلسی میں نہ لو نام مے کہ اب
لطف ار تکاب میں نہ اجر اجتناب میں

بوالہوس اور بھی مرنے کی کرینگے خواہش
لے کے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجیے

(۸۹) **وفاؔ:۔**

نواب ابراھیم علی خاں۔ اصل وطن سہسوان تھا۔ بڑودہ میں سکونت پذیر تھے۔ اور وہاں کے سر برآوردہ سرداروں میں سے تھے میر عالم خان ان کے بھائی تھے۔ حکیم احمد حسن خان فناؔ آپ کے قرابت دار تھے۔ تینوں نے مرزا غالب سے استفادہ کیا۔

(۹۰) **ولیؔ:۔**

مولوی امتوجان دہلوی۔ ہیڈ ماسٹر اردو اسکول فیروزپور جھرکہ آپ کے لڑکے بشیر الرحمٰن بشیرؔ و عنایت الرحمٰن عنایتؔ شاعر ہیں۔

نمونہ کلام:۔

پردہ جبھی تلک ہے کہ پردہ میں ہے وہ شوخ
چہرہ کھلا تو راز چھپایا نہ جائے گا
محشر میں روبرو مرے آکر کھڑا ہوا
جانا کہ اس سے شور مچایا نہ جائے گا
غم بے ستوں نہیں ہے کہ آگے سے ٹال دوں
سینہ کا سنگ ہے یہ ہٹایا نہ جائے گا

(۹۱) **رمزؔ:۔**

صاحب عالم مرزا فخر الدین فتح الملک بہادر معروف بہ میرزا فخرو بہادر شاہ ثانی کے دوسرے ولی عہد تھے۔ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء میں وفات پائی۔ ۱۸۵۴ء میں مہر نیمروز ان ہی کے حکم سے شائع ہوئی

تھی۔ پہلے ذوقؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد غالبؔ کے شاگرد ہوئے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ سالانہ وظیفے کے علاوہ غالبؔ کو باقر علی خان اور حسین علی خان کے میوہ کے لئے دس روپیہ ماہانہ الگ دیتے تھے طبیعت بڑی رسا تھی۔ اشعار میں عجب لطف انگیز چونچلاپن پایا جاتا ہے صاحب دیوان و مثنوی ہیں۔ واسوخت غدر سے بیشتر چھپ چکا تھا۔ مرزا خورشید عالم اور مرزا فرخندہ جمال آپ کے صاحبزادے تھے۔ نمونہ کلام:۔

آنکھیں تو اس کو دیکھ کے ہوتی ہیں بیقرار
بن دیکھے دل تڑپنے لگا اسکو کیا ہوا
دلِ بیتاب ہو گیا تجھ سے رفاقت کی امید
کوئی ہوتا ہے بُرے وقت میں جو تو ہوگا
وہ تو ملتا مگر دل کم ظرف
تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
تم رہو اور مجمعٔ اغیار
میر کیا ہے ہوا، ہوا، نہ ہوا
ہم کو کیا غیر کے آنے کی خبر
چُغلیاں نقشِ قدم کھاتے ہیں

(۹۱) ہشیارؔ:۔

کیول رام ولد بخشی سلطان سنگھ کائستھ سکسینہ چاندپور میں مدرس تھے کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور صاحب دیوان فارسی ہیں۔ ان کے بھائی لالہ مٹھن لال شاعر صاحب خزینۂ ہندی اور ماہر موسیقی تھے۔ ۱۸۸۵ء تک بقید حیات تھے:۔

(۹۴) نشاطؔ:۔

ہر گوبند سہائے ماتھر خلف منشی خوب لال، ساکن قدیم کول (علی گڑھ) مقیم آگرہ محلہ ہر گوبند گنج۔ آپ وکیل عدالت دیوانی تھے۔ مبادی الحساب منظوم، تالیف ہر گوبند اور تعلیم اخلاق آپ کی تالیف و تصنیف ہیں:۔

# حصۂ دوم

## مکتوبات و حواشی

# مکتوبات

(۱)

فرد

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت ✤ مے تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

اندیشہ گواہ است و مشاہدہ شاہد کہ کاستن از بہر آراستن است و زدودن از برائے نمودن۔ سرور را چوں بیارایند بہ پیرانید و بادہ را تا بہ پیمایند بپالائید نی پارہ تا بو بیدن پارہ ازاں بجز دگی نمرود۔ صورت قلم نتزباں داد و کاغذ را تا بدریدن لخت لخت نشود نامہ نام نتواں نہاد۔ آرے در کارگاہ کون و فساد، ہیچ فساد بے کون و ہیچ کون بے فساد نیست۔ از خاکم آفریدند و بہ سپہر بردند و چندے ہم بداں پایہ نگاہ داشتند و سپش بر زمین زدند تا پیکرم چناں بخاک نقش بست کہ آں نقش بہ ہیچ کزلک از خاک نتواں سترد۔ گوئی دریں کون و فساد کہ ناگاہ رو بیداد مرا بر دند و خستہ را بجائے من آوردند کہ ہرگ از زیستن و خندہ از گریستن نشناسد۔ یارب ایں پیکر کہ بخاک نقش بست و ایں نقش کہ ازاں پیکر بخاک نشست زود باشد کہ از روئے خاک تہ خاک سپر ند۔ دریں روزگار کہ از بند ستم رستگار و بہ بندِ غم گرفتارم سخنور جادو بیان از خود رفتہ منشی ہر گو بال تفتہ را بہ سرم گزار افتاد۔ شنیدم کہ آں لطف گستر کہ بہ وطن رفتہ بودند۔ اینک آمدہ اند۔ عجب آمد کہ بہ نامہ نواختند۔ ہمانا ہمنشینی و ہمزبانی من

بالتفتہ[3] مہربانی و ہمنشینی خویش بامن شناختند۔ وحقاکہ چنیں است۔ دوش یکے از شاہزادگان تمرخانۂ[4] بزم سخن آراستہ بود وسخن سنجاں را بہ غزلخوانی خواندہ۔ مرا کہ گفتن ریختہ سری نماندہ اگرچہ دل بہ سگالش نشتہ بودم۔ امّا روزیکہ شب بداں انجمن بایست رفت خاصہ ہنگامی کہ سوارہ رہ مے بردم بیتی چند بے خواست از دل غمزدہ سر برزد۔ چنانکہ بہ شما مے فرستم ومی خواہم کہ ہم دریں زمین غزلے گفتہ بہ من فرستند۔

از اسد اللہ

نگاشتہ سہ شنبہ ۱۶ ربیع الاوّل [۱۲۶۴ھ] و ۲۱ فروری [۱۸۴۸ء]

(۲)

صاحب بندہ! میاں نسیم اللہ[1] یہاں آئے ۔ ۔ اور وہ حکمت امام الدین خاں[2] سے اور فلسفہ مولوی صدر الدین[3] سے پڑھتے تھے ناگاہ از روئے اضطرار دل کو چلے گئے۔ وقتِ وداع کہتے تھے کہ والد کی بیماری کی خبر وطن سے آئی ہے۔ ناچار میں جاتا ہوں۔ اور کتب درسی یہیں چھوڑے جاتا ہوں۔ بعد حصولِ افاقت مریض پھر آؤنگا۔ آج تک وہ معاودت کر کر نہیں آئے۔ آپ از راہِ مہربانی ان کا حال اور ان کے والدِ ماجد کی صحت و مرض کا حال منشی ہرگوپال تفتہ سے معلوم مجھکو لکھئے۔ ضرور ضرور۔ فقط

[۳ ربیع الآخر ۱۲۶۴ھ] ۹ مارچ ۱۸۴۸ء

(۳)

بندہ پرورا بہت دنوں سے میرا دھیان آپ میں لگا ہوا تھا۔ بارے آپ کے خط آنے سے بہت خوشی اور فرحت حاصل ہوئی۔ یہ آپ نے کیا لکھا ہے کہ میں بدایوں کے حکیم کی دوا کر رہا ہوں۔ تیری بتائی ہوئی دوا ابھی نہیں کر سکتا۔ آپ غور تو کیجئے میں نے تو دوا نہیں بتائی۔ ایک ترکیب[1] پانی کے مدبر کرنے کی عرض کی ہے۔

صاحبانِ امراضِ سوداویہ مزمنہ کو اس پانی کا پینا نفع کرتا ہے۔ اور نفع اس کا

برسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور اس پانی کے استعمال کے زمانے میں دوا کو ممانعت نہیں۔ جو دوا چاہئیے کھائیے جو غذا چاہئے تناول فرمائیے۔ صرف یہ پانی کب دوا ہو سکتا ہے۔ آپ شوق سے اس پانی کو شروع کیجئے اور دوا طبیب کی بدستور کئے جائیے۔ اور غذا موافق طبیب کے کھائے جائیے۔ پانی جب پیجئے تب یہی پانی پیجئے۔ جہاں جائیے آدمی کو حکم کیجئے کہ ایک صراحی اس پانی کی لے لیوے اور یہ بھی آپ کے خیال میں رہے کہ اگر ناگاہ کوئی ضرورت لاحق ہوا اور یہ پانی موجود نہ ہوا اور آپ پانی بجنس ضرورت پی لیویں تو بھی محل اندیشہ نہیں ہے۔ منشی ہرگوپال ستودہ خصال کے باب میں جو کچھ لکھا تھا معلوم ہوا۔ خدا کی قسم۔ مجھ کو اُن سے ہرگز ملال نہیں ہوا۔ بلکہ مجھ کو یہ غم تھا کہ کہیں وہ اپنی غلط فہمی سے مجھ سے ملول نہ ہوئے ہوں۔ بہر حال اس گفتگو میں منشی صاحب نے ایک فقرہ اپنی مدح میں بڑھوا لیا۔ یعنی سپہر سخن را ماہ دو ہفتہ۔ آپ ان سے میرا سلام کہئے گا۔ اور یہ کہئے گا کہ میں تم سے راضی اور خوش ہوں۔ یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے راضی رہو اور مجھ کو اپنا خدمت گزار سمجھو۔ رباعیاں آپ کی بھیجی ہوئی میرے پاس موجود ہیں بعد اصلاح کے آپ کے پاس بھیجدوں گا۔ گھبرائیے نہیں اور خاطر جمع رکھئے۔

مغاں شیوہ بانواں۔ بانو بادشاہ کی بیوی کو کہتے ہیں اور الف نون جمع کا ہے یعنی بیبیاں۔ مغاں شیوہ کی وہ ترکیب ہے جو گل رخسار اور ماہ جبیں کی ترکیب ہے۔ یعنی وہ شخص کہ جس کا رخسار مانند گل کے ہے اور پیشانی چاند کی سی ہے اور شیوہ مغاں کا سا ہے۔ مغ آتشکدہ کا کارفرما اور چونکہ بادشاہان پارس آتش پرست تھے تو وہ خدمت آتشکدوں کی عمائد و اکابر و اشراف و علماء کو دیتے تھے۔ اور شراب کو چونکہ وہ بہت عمدہ چیز اور پاک اور متبرک جانتے تھے۔ اور ہر سفلہ اور فرومایہ کو نہیں پینے دیتے تھے۔ یہ بھی مغوں کی تحویل میں رہتی تھی۔ تاکہ وہ جس کو لائق سمجھیں اور اہل جانیں اس کو بقدر مناسب دیں۔ بہر حال وہ لوگ یعنی مغ بہت خوبصورت اور خوش سیرت، عالم فاضل

طرحدار بذلہ گو حریف ظریف ہوا کرتے تھے۔ اس راہ سے پارسیوں نے مغاں شیوہ مدح معشوقوں کی ٹھہرائی ہے یعنی چالاک اور خوش بیان اور طرحدار اور ترچھا اور بانکا مانند مغوں کے۔ اور اس کا نظیر ہندوستان میں یہ ہے کہ جیسے کسو بیگم یا عمدہ عورت کو کہیں کہ فلانی بیگم یا فلانی عورت میں کتنا ڈومنی پن نکلتا ہے۔ قصہ مختصر مغاں شیوہ اس محبوب کو کہتے ہیں کہ جو بہت گرم اور شوخ اور شیریں حرکات اور چالاک ہو۔ مغاں شیوہ بانواں۔ مغاں شیوہ دلبراں۔ مغاں شیوہ شاہداں خواہی بہ جمع خواہی بہ انفراد ترکیب مقلوب ہے یعنی بانوئے مغاں شیوہ یا بانوانِ مغاں شیوہ۔ قس علیٰ ہذا اور الفاظ۔

مدح جناب سید الشہدا میں قطع ہے ؎

معذوری ار ز حادثہ رنجی از آں گریستن — از نازکی بہ طبع گوارا گریستن
مسکیں نہ دیدۂ ز مغاں شیوہ بانواں — در خوابگاہِ بہمن و دارا گریستن

حاصل معنی یہ کہ شاعر اپنے نفس کو یا کسو اور کو مخاطب کر کر کہتا ہے کہ تو معاف ہے اگر وقائع و حوادثِ دہر سے آزردہ ہوتا ہے اس واسطے کہ تو بہت نازک ہے اور گریہ و زاری کی شدت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ بیان بہ سبیل طعنہ و تعریض واقع ہے جیسا کہ دوسری بیت میں کہتا ہے کہ اے شخص تو نے خوابگاہِ بہمن و دارا میں پریزاد و نازک و مغاں شیوہ بیگمات کو روتے پیٹتے نہیں دیکھا کہ کیسے بادشاہانِ جلیل القدر کی بیبیاں تھیں اور کیسی طرحدار و نازک کہ جیسے مغ ہوتے ہیں اور پھر ان پر کیا مصیبتیں گزریں ظاہرا تو نے یہ قصہ کتب تواریخ میں نہیں دیکھا۔ اور وجہ بہمن و دارا کے نام خاص کی یہ ہے کہ بہمن ابن اسفندیار کو آغازِ شباب میں اژدہا نگل گیا ہے اور دارا ابن داراب ابن بہمن عین جوانی میں سکندر کی لڑائی میں اپنے دو مصاحبوں کے ہاتھ مارا گیا۔

والسلام والاکرام — اسد اللہ

[مطابق ۱۲ رجب سنہ ۱۲۶ھ] — نگاشتہ یکشنبہ چارم جون سنہ ۱۸۴۸ء

(۴)

شفیق میرے۔ مشفق میرے۔ کرم فرما میرے۔ عنایت گستر میرے۔ تمہارے ایک خط کا جواب مجھ پر فرض ہے کیا کروں سخت غم زدہ اور ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے۔ اور سوانح اور عوایق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا۔ خلاصہ میرے رنج والم کا یہ ہے کہ میں اب صرف مرنے کی توقع پر جیتا ہوں۔ ہیہات ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید  نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

آج اسی ہجوم غم واندوہ میں تمہارا اور تمہارے بچوں کا خیال آگیا۔ بہت دن گزرے کہ نہ تمہارا حال معلوم اور نہ پیاری بھتیجی زکیہ کا حال معلوم۔ نہ منشی عبداللطیف اور نصیرالدین کی حقیقت معلوم۔ دعاگو ہوں تمہارا اور ثناخواں ہوں تمہارا۔ بہرحال لڑکوں کو دعا کہدینا۔ اور اگر مولانا تفتہ ہوں تو ان کو سلام کہنا اور کہنا کہ بھائی دو ایک جزو تمہارے اس کارنامے کے دیکھے ہیں آئندہ مجھ کو کثرت غم و ہم سے فرصت دیکھنے کی نہیں ملی۔

از اسداللہ

نگاشتہ نہم و فرستادہ دہم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء

[بروز بدھ مطابق ۲۴ صفر سنہ ۱۲۶۶ھ]

(۵)

بھائی صاحب! بندہ گنہگار حاضر ہوا ہے اور بندگی عرض کرتا ہے اور عفو تقصیر کا آرزومند ہے۔ دو خط آپ کے آئے ہیں اور ان کا جواب لکھ نہیں سکا۔ ظاہرا شیخ وزیرالدین نے عرض کیا ہوگا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ میرا اور آپ کا لہو ملتا ہی جب وہاں احتراق کی شدتیں ہیں تو یہاں اسکا ظہور کیونکر نہ ہوا ایک مدت سے میرا پاؤں پھیل رہا تھا چھوٹے چھوٹے دانے اطراف دائرہ کف پا کے محیط تھے۔ ناگاہ جیسے ایک قوم میں سے ایک شخص امیر ہو جائے۔ ایک دانہ ان دانوں میں سے بڑھ گیا۔ اور پک گیا اور پھوڑا ہو گیا اور وہ قریب ٹخنے کی ہڈی کے تھا۔ قیاس کیجئے کیا حال ہوگا۔ عید کے دن بادشاہ کے ساتھ عیدگاہ نہ جا سکا۔ دوسرے دن

لنگ لنگاں قلعہ گیا۔ اور عید کی نذر دی۔ آخر کار تپ چڑھی اور صداع شدید عارض ہوا وہ پھوڑا اپکا اور پھوٹا۔ کھولن عرض کروں۔ سوزش عرض کروں۔ دس بارہ دن برابر یہ حال رہا مرہم لگا کئے۔ آخر کار وہ پھوڑا پھوٹا۔ اس میں سے مادۂ منجمد جس کو کیل کہتے ہیں۔ وہ نکلا۔ دوا لگ کا زخم پڑ گیا۔ اب وہ زخم بھر گیا ہے۔ دوچار ہوں میں اچھا ہو جائے گا۔ تپ جو عارضی تھی جاتی رہی۔ مگر صداع شاید مادی اور بجائے خود ایک مرضِ حقیقی تھا کہ ہنوز باقی ہے۔ یا اللہ العظیم اگر اس عرصے میں ایک صفحہ لکھا ہو جہاں تک تم کو بھیج چکا ہوں' دہیں تک تحریر ہے۔ ایک فقرہ اس پر زاید نہیں لکھا گیا۔ اور اگر یہی درد سر ہے تو نہ لکھا جائے گا۔ اس سبب سے تحریر خط میں مقصر رہا ہوں۔ معاف رکھئے گا اور اس خط کا جواب لکھئے کہ ان دنوں دلّی میں تپ و درد سر و اقسام امراض کی شدّت ہے۔ بارے اطلاع دیجئے کہ آپ کا مزاج کیسا ہے اور میرا بھتیجا اور پیاری بھتیجی کس طرح ہے۔ پہلے خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ دوات قلم لیکر الگ بیٹھتی ہے اور مجھ کو خط لکھا کرتی ہے اور جب لڑتی ہے تو کہتی ہے کہ میں مرزا صاحب کے ہاں چلی جاؤں گی۔ اب آپ اس سے مرزا صاحب کہنا موقوف کروائیے۔ اس سے مجھ کو چچا کہلوایا کیجئے۔ اگر خدا چاہتا ہے تو ان جاڑوں میں ایک بار بطریق ڈاک کول آؤں گا۔ اور دوچار دن رہوں گا۔ تم کو دیکھوں گا اور اپنے بھتیجے کو دیکھوں گا تفتہ کا حال معلوم ہوا ہم نے بھی بادشاہ کی نوکری کی تھی۔ وہ ہمارے شاگرد ہیں۔ کیونکر راجہ کی نوکری نہ کرتے۔ سنو بھائی۔ بات وہ ہے جو تم کہتے ہو۔ تفتہ کو نوکری سے اپنے جان وتن کی پرورش منظور نہیں۔ دیوان کے چھپنے کی فکر ہے۔ کیا کروں دستگاہ نہیں اور بے مقدور ہوں ورنہ کیا سو دوسو سے تفتہ کی اعانت نہ کرتا۔ اپنے سے بیزار۔ یاروں سے شرمسار۔ کیوں کر کوئی جانے کہ میں اپنے دوستوں کو کس طرح چاہتا ہوں۔ تفتہ دوست کی بات کیا اور اس کی آبرو کیا۔ ہاں صاحب اگر بابو ہرگوبند سنگھ آپ کے پاس آئیں تو ان سے میری دعا کہنا۔ اور یہ میرا حال کہدینا۔ اور ان کو اطلاع دینا کہ تمہارا خط پہنچا ہے جواب اس راہ سے نہیں لکھا

کہ تم اپنا احوال مجھ کو لکھو۔ اب زیادہ کیا لکھوں۔ لڑکوں کو دعا کہدینا۔ اور شیخ وزیر الدین کا حال لکھنا۔ والسّلام والاکرام۔

[اگست تا اکتوبر سنہ ۱۸۵۰ء]

(۶)

اپنے بھائی صاحب قبلہ کی خدمت میں بندگی عرض کرتا ہوں۔ اور اپنی بھتیجی کو دعا کہتا ہوں اور اپنے پیارے بھتیجے کو پیار کرتا ہوں۔ اور اس کی تندرستی کی دعا مانگتا ہوں۔ سنا ہیں نے کہ پھر اس کو دست آنے لگے۔ صاحب اندیشہ نہ کرو۔ جوں جوں یہ بڑھتا جائے گا۔ اور حرارت اس کے مزاج میں آتی جائے گی۔ ووں ووں یہ حالت رفع ہوتی جائیگی انشاءاللہ تعالیٰ۔ اصل خیری۔ جوارش عود و جوارش مصطگی بنوا رکھو۔ نہ ہر روز بلکہ گاہ گاہ اس کو چٹا دیا کرو۔ اور خورشہائے ناگوار مت دیا کرو۔ اب میرا حال سنو منجن پہنچا۔ درد سے مر رہا تھا۔ واللہ بے تکلف کہتا ہوں ہیں نے اس پچپن برس کی عمر میں ایسی سریع التاثیر دوا نہیں دیکھی۔ ایک بار کے لگانے سے درد تو فوراً جاتا رہا۔ صبح کو ورم بالکل نہ تھا۔ ڈاڑھ کے درد کی مگر اکسیر یہ ہے لیکن باوجود اس کے تکلیف نہ گئی۔ بھائی یہ درد از قسم اوجاع نزلہ و رطوبت نہیں۔ ڈاڑھ گرنے کو ہے جگہ چھوڑ دی ہے اوپر کو اٹھ آئی ہے۔ ہنوز کچھ علاقہ مسوڑھے سے باقی ہے جب وہ علاقہ جل چکے اور ڈاڑھ گر چکے تب فرصت ہو، چار ڈاڑھیں گر چکی ہیں یہ پانچویں گرا چاہتی ہے۔ چونکہ بے انتہا ہیں اس کو اکھڑوا نہیں سکتا۔ بہرحال آپ کی عنایت سے وہ درد اور ورم کہ جو منشاء آزار تھا جاتا رہا۔ اب یہ قصہ تو جبتک زندہ ہیں۔ رہے گا۔ پانو بھی اب اچھا ہے۔ زخم تھوڑا سا باقی رہا ہے۔ زحمت و تکلیف رنج و آشوب نہیں ہے۔ تمہارا حال ان دونوں خط سے معلوم ہوا۔ کیا کروں کچھ اختیار کی بات نہیں۔ خدا تم پہ رحم کرے۔ یہ مرض نہیں روگ ہے۔ اس روگ کو خدا کھو دے۔ میاں نسیم اللہ صاحب نے اچھا کیا۔ بیکاری سے بہتر ہے۔ اگر قسمت یاوری کرے گی۔ اور

نیک نام رہیں گے ترقی کر جائیں گے۔ مولانا تفتہ کا حال معلوم ہوا۔ اچھا ہے کچھ دنیا کا بھی دھندا لگا رہے۔ یقین ہے کہ کہیں سے وہ خط مجھ کو بھی لکھیں گے۔ منشی ہرگوبند سنگھ نے ایک خط مجھ کو اکبرآباد سے بھیجا تھا۔ اس میں اپنی ملاقات کا حال جانی بانکے رائے سے معرفت تفتہ کے لکھا تھا میں نے اس کا جواب نہیں لکھا۔ کیونکہ وہ جواب طلب نہ تھا۔ ہاں صاحب اب بابر بادشاہ کا حال تمام لکھ چکا ہوں۔ اب مجھ کو یہ لکھ بھیجئے کہ وہ جو میں نے آپ کو بھیجا ہے وہ کہاں تک ہے۔ خاتمہ کا فقرہ یا شعر جو کچھ ہو وہ لکھ کر بھیج دو تاکہ میں وہاں سے لکھ کر تم کو بھیجوں اب چھ مہینے پورے ہو چکے۔ جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک اب میں دیکھوں یہ مشاہرہ مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آئندہ ماہ بماہ کر دیں گے تو تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا اسلام ہے ابھی بابر کا حال حضور میں بھی نہیں بھیجا کل مسودہ تمام ہوا ہے۔ صاف ہو رہا ہے۔ اب صاف کر کر دیدوں گا۔ اور ماہ بماہ کی استدعا کروں گا چھ ماہی آخر ہونے کو تھی۔ اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا۔ اس سبب سے فرصت تم کو خط لکھنے کی نہ ہوئی۔ لاحول ولاقوۃ کیا بک رہا ہوں قلم ہاتھ سے چھٹتا ہی نہیں۔ واللہ اس وقت تم کو اپنے پاس بیٹھا ہوا سمجھا ہوں اور تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ سودائے محبت اسی کو کہتے ہیں۔ للجنون فنون۔

انا اسداللہ

[۲ صفر ۱۲۶۷ھ] روز پنجشنبہ وقت صبح دوم جنوری ۱۸۵۱ء

(۷)

بھائی صاحب کو بندگی پہنچے۔ ان دنوں میں حضور والا حضرت خواجہ صاحب کی درگاہ گئے ہوئے تھے اور احقر العباد بھی ساتھ گیا تھا۔ چنانچہ آپ کا نوازشنامہ جو میرے خط کے جواب میں تھا وہ میرے آدمیوں نے وہیں درگاہ میں میرے پاس پہنچایا تھا فرصت جواب لکھنے کی نہیں ہوئی۔ چار دن ہوئے کہ میں درگاہ سے شہر میں آیا۔ آتے ہی میں نے

فصد کھلوائی۔ اس سبب سے دو دن خط نہیں لکھا۔ آج لکھتا ہوں میں یہ سمجھا ہوا تھا کہ جب درگاہ سے آؤں گا تو تمہارا خط آیا ہوا ہوگا۔ وہ پاؤں گا۔ آدمیوں سے معلوم ہوا کہ کول کا کوئی خط نہیں آیا۔ ناچار مشوش ہوا۔ تشویش کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زکیہ کی چیچک کا حال پہلے خط میں لکھا تھا۔ اگرچہ یہ بھی لکھا تھا کہ دو چار دانے نمود ہو کر جاتے رہے اور فرصت ہو گئی۔ مگر پھر بھی خیال باقی رہا۔ دوسرے وجہ تشویش تمہاری طرف سے آیا مزاج کیسا ہو۔ مرض کا حال کیا ہو۔ علاوہ اس سے کہیں دورہ کہیں کثرتِ کاروبار۔ بہر رنگ دھیان تمہاری طرف لگا ہوا ہے۔ مجھ کو بھی بہ سبب فصل بہار کے ہیجانِ خون ہے۔ احتراق کے شدائد بہ نسبت اور دنوں کے زیادہ ہیں۔ لازم یوں تھا کہ شاہترہ پیتا اور مسہل پیتا۔ مگر کچھ نہ ہو سکا۔ صرف فصد باسلیق پر قناعت کی اور آدھ سیر خون لے لیا۔ اب آئندہ جو کچھ ہو سو ہو۔ اجنٹ راجپوتانہ خود بھرتپور کے نواح میں ہے۔ یقین ہے کہ جانی بانکے رائے بھی ہوں گے۔ اور منشی ہرگوپال تفتہ بھی ساتھ ہوں گے۔ تم اپنے اجزا کیوں نہیں منگوا بھیجتے ہیں۔ نہ صرف تمہارے لطف طبع و ذوق کے واسطے التزام اس مشقت کا اپنے اوپر کیا ہے۔ منگواؤ اور منگوا کر مجھ کو اطلاع دو اور نشان خاتمہ عبارت لکھو۔ تاکہ بقیہ بھی لکھ بھیجوں۔ منشی عبداللطیف سلمہ اللہ تعالیٰ کو دعا پہنچے۔ نصیر الدین کو دعا۔ زکیہ کو دعائے دیدہ بوسی اور اس کی خیر و عافیت کی استدعا۔ والسلام

۲۸ ربیع الثانی سنہ ۱۲۶۷ھ] نگاشتہ یکشنبہ دوم مارچ سنہ ۱۸۵۱ء

(۹/۱)

("بنام منشی عبداللطیف" بن منشی نبی بخش حقیر)

برخوردار نورِ چشم منشی عبداللطیف سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے دوام دولت و طول عمر معلوم کریں کہ جانی صاحب کے کہنے سے معلوم ہوا کہ تمہارے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ بہت مجھ کو خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تم کو مبارک کرے۔ اور تم کو تمہارے باپ کے

سایۂ عطوفت اور اس کو تمہارے ظلِ رافت میں سلامت رکھے۔ اس کی اولاد تم کو دکھلاوے۔ معلوم ہے کہ بھائی صاحب دورے کو گئے ہیں۔ ان کے نام کا خط تمہارے خط کے ساتھ بے لفافہ بھیجتا ہوں اس کو پڑھ لینا اور قطعہ تاریخ کی نقل لے لینا۔ اور خط کو اپنی عرضی میں ملفوف کر کے اپنے والد ماجد کو بھیج دینا اور جو نام رکھو اس سے مجھ کو اطلاع دینا میں چاہتا ہوں کوئی نام ایسا لے کہ جس کے اعداد سے سال ولادت ظاہر ہو۔ والدعا۔

انا اسد اللہ

[۲۷ ربیع الاول ۱۲۶۷ھ] مرسلہ دوشنبہ ۱۰ مارچ ۱۸۵۱ء

(۹)

بھائی صاحب کو سلام پہنچے۔ بھائی علی بخش خاں[1] اور بھائی طرہ باز خاں[2] اور مرزا زین العابدین خاں[3] اور مجموع احباب سلام کہتے ہیں اور پوتے کے ہونے کی مبارکباد اور اس کی طول عمر و دوام عیش کی دعا دیتے ہیں۔ بی بی میری تمہاری بی بی کو سلام اور تمہاری بہو کو دعا کہتی ہیں۔ اور تم کو اور تمہاری بی بی کو جو تمہاری بیٹی اور تمہاری بہو کو مبارکباد دیتی ہے اور زکیہ کو پیار کرتی ہے اور نصیر الدین کو دعا کہتی ہے۔ یہ سب باتیں تمہارے پیام کے جواب میں ہیں۔ تم نے جو لکھا تھا کہ اپنے گھر میں میرے گھر کی طرف سے سلام اور لڑکے بالوں کی طرف سے بندگی کہنا۔ یہ اس کا جواب ہے۔ یہ جواب اور سب اخوان و احباء کا سلام و تہنیت کئی دن سے میرے پاس امانت تھا۔ آج جمعہ کے دن دوپہر کے وقت گونہ فرصت تھی کہ میں نے یہ لکھ رکھا اگر جیتا رہا تو کل صبح ڈاک کے وقت یہ خط روانہ کروں گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ میرا دل بہت خوش ہوا کہ تم نے شیخ اکرام الدین عرف عبد السلام کر کے لکھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو سلامت رکھے۔ اور اسے مراتب عالی کو پہنچا دے کہ وہ اپنے اب و جد کا نام روشن کرے اور فخر خاندان ہو۔

مرزا حسن علی بیگ ایک روز میرے پاس آئے تھے۔ کہ منشی صاحب چاہتے ہیں کہ تو کول آوے۔ میں نے کہا۔ صاحب یہ دن جانے کے نہیں۔ اگر خدا چاہے گا تو

انبہ کے موسم میں کول اور مارہرے جاؤنگا۔ مارہرے کے پیرزادے کے بیٹے آئے تھے میں نے ان سے بھی کہہ دیا ہے کہ کول برسات میں آؤں گا۔ اگر بھائی نے رخصت دی تو مارہرے بھی آؤں گا۔

بھائی تم نے وہ اوراق کھودئے۔ اب میں کیا کروں۔ اگر وہ تمہارے پاس ہوتے تو مجھ کو ایک لگاؤ رہتا اور میں مشقت کھینچکر جو کچھ کہ اب لکھا ہے وہ لکھ کر تم کو بھیج دیتا۔ جب میں نے دیکھا کہ تم کو ذوق نہیں۔ میرا بھی دل سرد ہوگیا۔ خیر یہ تو ہنسی ہے اب تم وہ اوراق وہاں سے نہ منگواؤ۔ میں حضرت ہمایوں کا حال تمام لکھ چکا ہوں اب از سر نو کسی کاتب سے لکھوا کر تم کو بھیجوں گا۔ خاطر جمع رکھنا۔ امیر تیمور چار پشتیں بعد ان کے بابر تک ایسی گزریں کہ جس میں کشور کشائی و لشکر کشی نہیں ہوئی۔ بابر، ہمایوں۔ یہ تین بادشاہ اولوالعزم کا حال بسبیل اجمال لکھ چکا ہوں۔ اب حضرت اکبر شاہ کا حال شروع کرونگا۔ نوروز کا ہنگامہ تھا اور قصیدے کی فکر تھی۔ اس واسطے ابھی نثر کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور ابھی دو چار دن دم لے لوں تو اب پھر سرگرم کار ہو کر اکبر شاہ کا حال لکھنا شروع کردوں تمہارے واسطے کاتب خوشنویس صحیح نویس پیدا کر کر لکھواتا ہوں۔ گھبرانا نہیں۔ تفتہ کا حال آپ نے بھی لکھا تھا اور اُن کا خط بھی آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کول سے اکبر آباد کو گئے ناچ رنگ شراب و کباب میں محو ہوں گے۔

صاحب میرے کچھ اشعار جانی بانکے لال کے تفتہ نے میرے پاس بھیجے اور ایک خط ان کا یعنی جانی جی کا اکبر آباد سے بے توسط تفتہ مجھ کو آیا۔ غرض یہ ہے کہ نظم و نثر اس شخص کی مربوط ہے۔ میں اس کو اتنا نہیں جانتا تھا۔ اب آپ اس سے اوراق کا تقاضا نہ کیجئے میں آپ کے واسطے اور بھیجے دیتا ہوں۔ والسلام

اسد اللہ

نگاشتہ جمعہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء [۲۵ جمادی الاول ۱۲۶۷ھ]

(۱۰)

بھائی صاحب! یہ عنایت نامہ بھی پایا اور جس کی مجھے فکر تھی وہ بھی آیا۔ اختلافِ مدت کا مدار رہرکاروں کی طبیعت پر ہے۔ حال منشی عبد اللطیف اور زکیہ کا معلوم ہوا گرمی کا موسم ہے میں جانتا ہوں ان دونوں کو زہر مہرہ کا استعمال مفید ہوگا کبھی کبھی شربتِ نیلوفر میں گھس کر پلا دیا کریں۔ اور چاٹ لیا کریں۔ بھائی لڑکوں کا گھر ہے۔ شربت نیلوفر۔ شربت بنفشہ عرق نعناع کی سکنجبین۔ عرق کاسنی۔ عرق بادیان۔ اس طرح کی چیزیں گھر میں تیار کرو۔ گاہ گاہ استعمال میں آتی رہیں۔ ہاں صاحب نصیر الدین کا ذکر آپ نے خط میں بہت دنوں سے نہیں لکھا۔ مگر وہ بھی نہیں ہمارے شیخ اکرام الدین کے ساتھ آگرے چلا گیا۔

آپ کی کتاب کی فکر میں ہوں۔ اگر اجل امان دیتی ہے تو اب لکھ کر بھیجے دیتا ہوں۔

ہمایوں کا حال پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو میں آیا ہے ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں۔ سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں۔ نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں۔ داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی۔ یا کچھ اور شکل۔

کہنے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آتا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
سمجھے ہوئے ہیں تم اسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہمنفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اس انجمنِ نازکی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل — اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے — کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہات آئیں تو انھیں ہات لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے — تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے — کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

[اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء]

(۱۱)

بھائی صاحب۔ تم کو مبارک ہو نصیر الدین کا بیاہ اور عبد السلام کا ختنہ۔ الحمدللہ کہ بخیر و عافیت یہ سب کام کر کر علیگڈھ آ گئے۔ منشی عبد اللطیف صاحب کو عبد السلام کے ختنے کی مبارکباد میری طرف سے دیجئے گا اور نصیر الدین کو اس کی شادی کی مبارکباد دیجئے گا۔ اور بی زکیہ کو بھائی کے بیاہ کی اور بھتیجے کے ختنے کی تہنیت کہئے گا اور بعد ان سب ظرافتوں کے بھابی صاحب کو میرا سلام اور مبارکباد کہئے گا۔ فقط

واسطے خدا کے اب کول آ گئے ہو۔ وہ عرق شروع کرو جس طرح عرض کیا گیا؟

کبھی شربت نیلوفر کے ساتھ اور کبھی شربت مرکب کے ساتھ۔ بندۂ خدا ایک پچاس دن میرا کہا مانو اور اس عرق کو پیو۔ جب تمام ہونے کو آئے نسخہ تمہارے پاس ہے پھر کھچواؤ اور دس دن کم دو مہینے اس کا استعمال کرو۔ ضرور ضرور۔ فقط

کیا پوچھتے ہو زین العابدین خاں کا حال اور کیا کہوں اس کی بی بی کا حال۔ پہلے اس کی حقیقت سنو۔ بھائی اس کو ناگاہ رعاف ہوا۔ رعاف میں ناک سے لہو آتا ہے مگر اس کو منہ سے لہو آیا ناک سے تھوڑا تھوڑا۔ اور منہ کا کیا حال تھا گویا مشک کا دہانہ کھول دیا ہے۔ ایک ہفتہ میں خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آٹھ دس سیر خون نکلا سیاہ اور بدبودار توقع جینے کی باقی نہ رہی۔ اور سب ناامید ہو گئے۔ بارے خدا نے بچا لیا بچ گیا۔ اس کو تصور کیجیے کہ تھا کیا۔ صرف استخوان و پوست رکھتا تھا۔ اب سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ اگرچہ ہنوز صاحب فراش ہے اور چلنا پھرنا تو کہاں پلنگ پر سے اٹھ بھی نہیں سکتا۔ مگر بیم ہلاک نہیں ہے۔ اس کی بی بی کا حال سنئے تین مہینے سے تپ اور کھانسی میں گرفتار ہے۔ خدا اس پر اور اس کے بچوں پر رحم کرے۔ اور اس کو بچا لے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر یوں سمجھو کہ اگر یہ بچ جائے تو گویا مردہ جیا۔ باقی حضرت صاحب اور ان کی اولاد اور سب احباب خوش ہیں۔ اسد اللہ

[اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء]

(۱۲)

بھائی صاحب کو سلام اور منشی عبد اللطیف اور نصیر الدین اور پیاری زکیہ کو دعا پہنچے۔ حضرت عرق پئے جایئے اور گھبرایئے نہیں۔ دیکھنا کیا فائدہ کرتا ہے۔ مجھ کو تو مفید پڑا۔ یقین ہے کہ تم کو بھی نفع کرے گا۔

بندہ پرور! پاکھل کا مربا اور اچار دونوں موجود ہیں۔ خدا حضور کو سلامت رکھے جب چاہوں مانگ لاؤں مگر بھیجوں کیونکر۔ ہاں ڈاک۔ اس کا یہ حال ہے کہ مرتبان

کمال یہ ہے کہ ٹین میں رکھ کر بھیجئے۔ الٹا سیدھا لاکلام ہوگا۔ اگر مربہ ہے توشیرہ اور اگر اچار ہے تو گر گر جائے گا۔ بہر حال اچار پاکھل کا کہ وہ بہ نسبت مربہ کے زیادہ تر سود مند ہے لے آیا ہوں اور میرے پاس رکھا ہے جس طرح حکم کرو۔ اس طرح بھیجدوں۔

حضرت کالے[۱] صاحب اور میاں نظام[۲] الدین اور بھائی غلام حسین[۳] خاں او طرہ باز خاں خاں اور مغل علی خاں اور سب صاحب سلام کہتے ہیں ملازین العابدین خاں اچھا ہے۔ بی بی بھی اس کی فرصت پاتی چلی ہے۔ مرض کی صورت خطرناک نہیں رہی۔ خدا چاہے تو صحت ہو جائے بھائی خدا کے واسطے حسن علی بیگ کو سمجھا دو۔ کہ یہ کیا طور ہے کہ ایک لونڈے کے واسطے بی بی کو چھوڑ دیا ہے۔ والدہ بھی تمہاری اس کی بات نہیں پوچھتیں۔ وہ غریب اپنی خالہ کے ہاں پڑی ہوئی ہے۔ اپنی ماں کو لکھو کہ بہو کو منا کر لے آویں اور تمہارے پاس روانہ کریں یعنی یہ صلاح تم مرزا کو سمجھاؤ اور بہت سا لکھو۔ فقط

[اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء]

(۱۳)

آداب بجالاتا ہوں۔ بہت دن سے آپ کا خط نہیں آیا۔ بیگم میں میرا دھیان لگا ہوا ہے۔ آپ اکثر مجھ کو بھول جاتے ہیں۔ اور جب میری طرف سے شکایت شروع ہوتی ہے تو حضرت رجوع بعدالت فوجداری کرتے ہیں اور کثرت اشغال سرکاری کو دستاویز عذر بناتے ہیں۔ بہر حال اتنا تو بھولنا مناسب نہیں۔ ہر ہفتہ میں ایک خط آپ کا اور ایک خط میرا آتا جاتا رہے۔ ان دنوں میں بہ سبب عید کے قصیدے کی فکر کے مجھکو فرصتِ تحریر نہیں ملی۔ قصیدے جب چھاپا ہو کر آئیں گے تو موافق معمول آپ کی خدمت میں ارسال کرونگا۔

میرے ایک دوست ہیں انھوں نے ایک روپیہ مجھکو دیا ہے اور یہ چاہا ہے کہ میں وہ روپیہ آپ کے پاس بھیجوں اور آپ اپنے بھائی صاحب کے پاس باہر ایک

بھیجدیں۔ اور وہ ایک روپیہ کے چاقو جیسے کہ وہاں بنتے ہیں بہت تاکید کر کر اور فرمائشی تحفہ بنوا کر آپ کو بھیجدیں۔ اور آپ خواہی کسی کے ہاتھ خواہی ڈاک میں مجھ کو بھیجدیں۔ میں حیران تھا کہ روپیہ آپ تک کیونکر پہنچے۔ بارے مرزا صاحب آج آگئے اور انھوں نے کہا کہ میں کل کول جاؤنگا۔ میں نے یہ خط لکھ کر مع روپے کے ان کو دے دیا۔ مہربانی فرماکر ہاترس بھیجئے اور تاکید لکھئے کہ بہت اچھے چاقو جتنے آویں مگر ایسے کہ ان سے بہتر نہ ہوں بنوا کر بھیجدیں۔ جلد۔ والسلام

منشی عبد اللطیف کو دعا پہنچے بیگم کو اور نصیر الدین اور عبد السلام کو دعا پہنچے۔

جناب میر طالب علی چھولس کے رئیس کہ جو حیدرآباد کے رسالے میں مرزا ذو الفقار علی بیگ رسالدار کی رفاقت میں مدرس رسالہ ہیں۔ وہ اپنے کو آپ کے والد ماجد کا آشنا بتاتے ہیں اور آپ کو سلام کہتے ہیں۔

حق تعالے تم کو خوش و خرم و تندرست تمہاری اولاد کے سر پر سلامت رکھے اور تم ان کا بڑھاپا دیکھو اور ان کے بچوں کو کھلاؤ۔ منشی ہرگوبند سنگھ آئے اور بیگم کا مجھے پیام دیا کہ چچا میں نے کان چھدوائے ہیں۔ سو تم میری طرف سے اس کو دعا کہنا اور کہنا تم کو مبارک ہو اور تم کو زمرد اور یاقوت کے پتے بالیاں پہننی نصیب ہوں۔

[جولائی ۱۸۵۱ء]

(۱۷)

بھائی صاحب! آپ کا خط بہت دن کے بعد آیا۔ خیر و عافیت معلوم ہوئی دل خوش ہوا۔ اب ہوا سرد ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ شیخ اکرام الدین بھی مع الخیر آ جاویں گے۔ آپ کے خط کا جواب جو دیر میں لکھا ہے اس سبب سے لکھا ہے کہ بتقریب عید قریب آگئی تھی قصیدے کی فکر میں سرگراں تھا۔ بارے عید ہو چکی۔ قصیدہ[۱] پڑھ چکا۔ اب جواب آپ کے خط کا لکھا۔ کہو گے کہ قصیدہ مجھ کو کیوں نہ بھیجا۔ ۱۱۳ شعر ہیں

اور صرف میں لکھنے والا۔ یہ لکھنا فکر شعر سے کم نہیں۔ انشاء اللہ لکھوں گا اور بھیجوں گا۔

تحریر تاریخ اسی سبب سے ملتوی رہی اب اس طرف متوجہ ہونگا۔ آپ کے واسطے لکھواتا ہوں۔ کاتب کے آگے کار ضروری فرمائش سے حاکم کی آگیا ہے۔ اس کو وہ تمام کرے تب اس تحریر کی طرف توجہ کرے۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ جب تک آپ کے پاس نہ پہنچ لے اور آپ اس کو نہ دیکھ لیں تب تک خود میرا دل خوش نہ ہوگا۔

وائے بر جان سخن گر بہ سخنداں نرسد

—— یہاں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ مخدوم زادہ بھی تندرست ہوتا چلا ہے۔ میں بدستور احتراق کی بلا میں مبتلا ہوں مگر التفات نہیں کرتا۔ میرے سب اخوان و احباب تم کو سلام کہتے ہیں۔

زکیہ کو میری طرف سے دعا کہہ دینا اور اس کو میری طرف سے پیار کرنا۔ منشی عبد اللطیف صاحب کو دعا اور نصیر الدین کو دعا۔ جب میاں عبد السلام وطن سے آجائیں تو مجھ کو اطلاع دینا۔ والسلام

از اسد اللہ

[مطابق ۶ شوال ۱۲۶۷ھ] مرسلہ سہ شنبہ۔ چہارم اگست ۱۸۵۱ء

(۱۵)

بھائی صاحب قبلہ!

زکیہ اور عبد السلام کا آنا مبارک ہو۔ بڑے لڑکے کو بھی پروردگار تندرستی بخشے۔

ہاں صاحب اخبار میں اکبر آباد اور عظیم آباد کی وبا کی دھوم سنی جاتی ہے۔ کول کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اب آپ کے لکھنے سے معلوم ہوا۔ حق تعالےٰ اپنے سب بندوں کو امن و امان میں رکھے۔ اس شہر میں امن ہے مگر ہاں جیسا کہ شروع فصل میں تغیر ہو جاتا ہے اور تپ دلرزہ قدکام پھیل جاتا ہے۔ وہ ہے۔ وبا نہیں ہے۔ گرمی بہت پڑتی ہے

دو دن سے ہوا سرد ہو گئی ہے۔ ابر آنے لگا ہے۔ بارش نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ آج کل میں مینہ برسے گا۔ حضور والا قطب صاحب کی درگاہ میں تشریف رکھتے ہیں اس مہینے کی یعنی ذیقعدہ کی بیسویں کو آویں گے۔ مجھ کو دو چار دن کے واسطے درگاہ جانا ضرور تھا۔ مگر میرے پاؤں میں دو ایک پھوڑے نکلے ہیں۔ اس عذر لنگ سے نہیں گیا۔

تاریخ کا حال کیا پوچھتے ہو۔ صرف ہمایوں کا حال لکھ چکا ہوں۔ اکبر بادشاہ کا احوال شروع بھی نہیں ہوا۔ بھائی مجھ سے یہ درد سر ہو نہیں سکتا۔ بس یہ اتنا ہی رہا۔ ایک کاتب ہیں بہت خوشنویس اور صحیح نویس۔ ان کو میں نے مسودے دئے اور ان سے کہا کہ اس کی دو نقلیں مجھ کو کر دو۔ ایک تمہارے واسطے اور ایک جانی بانکے لال کے واسطے۔ وہ ایک لکھ کر لائے ہیں۔ نے وہ جانی جی کو بھیج دی۔ خیال کیا کہ بھائی کو دس روز کے بعد بھیجدوں گا۔ ناگاہ کاتب کو ایک کتاب تاریخ کی سشن جج نے لکھنے کو دی وہ لکھ رہے ہیں۔ اس سبب سے درنگ ہو گئی ہے۔ آپ گھبراویں نہیں۔

جاروب لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
باگردِ فرش و سینہ بہ ایواں برابر است

ترکیب الفاظ یوں ہے کہ شرک فی الوجود باگردِ فرش برابر است و سینہ بہ ایواں برابر است، یعنے دل بمنزلہ ایوان کے ہے اور شرک فی الوجود بمنزلہ گردِ فرش کے ہے۔ اس گردِ فرش کو جھاڑا چاہیے۔ گرد جھاڑتے ہیں جھاڑو سے۔ لائے نافیہ کو جھاڑو مقرر کیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ لائے نافیہ کی جھاڑو لا اور دل کے ایوان سے شرک فی الوجود کی گرد جھاڑ ڈال۔ اب سمجھئے کہ شرک فی الوجود کیا اور لائے نافیہ کیا۔ شرک کئی قسم پر ہے۔ شرک فی الصفات۔ شرک فی الافعال۔ ان شرکوں کو سب جانتے ہیں۔ مگر شرک فی الوجود بہت پوشیدہ ہے اور سب اس میں مبتلا ہیں۔ یعنی اشیا کے واسطے وجود جداگانہ قرار دینا اور خلق اور خالق کو الگ الگ سمجھنا۔ مذہب وحدت وجود کا یہ ہے کہ موجودِ حقیقی حق ہے

اور اس کے سوا کوئی موجود نہیں۔ لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ "لا" واسطے نفی کے ہے۔ اہل ظاہر لا الہ الا اللہ کو یوں سمجھتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی لائق عبادت کے نہیں۔ بس وہ نفی استحقاق عبادت کرتے ہیں اور صوفیہ کہتے ہیں کہ نہیں کوئی موجود سوائے اللہ کے۔ پس یہ لوگ اشیاء کی موجودیت کے عقیدہ کو شرک فی الوجود کہتے ہیں اور اہل ظاہر کو شرکِ خفی جانتے ہیں۔

بالائے طفل یک شبہ درخم زراستی

باقامت خمیدۂ پیراں برابر است

خیال میں ہوگا کہ یہ شعر منجملہ ان اشعار کے ہے کہ جو ماہِ نو کی تشبیہ میں واقع ہوئے ہیں۔ ایک تشبیہ یہ بھی ہے۔ طفل یک شبہ پہلی رات کا چاند۔ بالا یہاں بمعنی قد کے ہے نہ بہ معنی اوپر کے۔ راستی بمعنی سچ کے ہے نہ بمعنی سیدھے کے۔

بر دست شاہ تیغ وکماں راست جایگاہ

باتیغ و باکماں بہ چہ برہاں برابر است

واہ بھائی۔ تم اور اس شعر کے معنے پوچھو۔ یہ دو تشبیہیں ماہِ نو کی ہیں۔ تلوار اور کمان۔ شاعر کہتا ہے کہ تلوار اور کمان بادشاہ کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہلال بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں پھر کس برہان سے اور کس دلیل سے شعرا اس کو تلوار اور کمان کے برابر جانتے ہیں۔

دانم نہ تیغ مصقلۂ تیغ بادشاست

نشگفت گر بہ تیغ بدیں سال برابر است

یہ بیت متعلق پہلی بیت سے ہے۔ پہلے شعر میں آپ نے ایک شبہ وارد کیا کہ تلوار بادشاہ کے ہاتھ میں چاہیئے اور ہلال وہاں نہیں ہے۔ پس اس کو تلوار کیونکر کہئے اب آپ ہی مجیب ہوتا ہے کہ ہاں میں بھی جانتا ہوں کہ یہ تلوار نہیں مگر بادشاہ کی تلوار کا

مصقلہ ہے اور عجب نہیں کہ بادشاہ کی تلوار کا مصقلہ تلوار کے برابر گنا جاوے۔ ہاں یہ پوچھئے کہ مصقلہ کیا۔ مصقلہ آلہ ہے تلوار صیقل کرنے کا اور وہ ایک چیز ہے لوہے کی گھوڑے کے نعل کی صورت۔

تیغ مرا اگرچہ بود خفتہ در نیام
پولادِ با بدخش بدخشاں برابر است

بدخش فارسی میں اسم ہے یاقوت کا اور یہ جو شہر کا نام بدخشاں ہے اسی سبب سے ہے کہ وہاں یاقوت کی کان ہے۔ "تیغ مرا" یہ جو "را" ہے یہ اضافت کے معنے دیتا ہے یعنی میری تلوار کی فولاد یعنی لوہا۔ اگرچہ تلوار میان میں ہو لیکن یاقوت کے برابر ہے یعنی سرخ۔ اگرچہ تلوار نہ کھینچوں اور کسی کو نہ ماروں تو بھی میری تلوار خون آلودہ ہے اور مانند یاقوت کے سرخ ہے۔ خالق نے اس کی سرشت میں یہ صفت ودیعت رکھی ہے۔

والسلام والاکرام غالب

شنبہ ششم ستمبر [۱۸۵۱ء] [۱۰ ذیقعدہ ۱۲۶۷ھ]

(۱۶)

بھائی صاحب! آپ کا خط پہنچا۔ حضرت آپ نے مولوی قمرالدین خاں کو اتنا تنگ ناحق کیا۔ میرا مدعا اسی قدر تھا کہ خط کا پہنچنا معلوم ہو جائے۔ اور کاغذ تلف نہ ہو۔ ورنہ مجھ کو اُن سے کسی طرح کا رنج نہیں ہے۔ میں نے اگر کچھ تم کو لکھا تھا تو وہ لکھنا بطریق اختلاط و انبساط تھا۔ نہ بسبیل ملال۔ بہرحال مسودہ کے پہنچنے سے خاطر جمع ہو گئی۔ اب اُن کے خط کے آنے کی کچھ حاجت نہیں۔ میں ان کا خادم اور دوست دلی ہوں اور ان کی پیاری پیاری باتیں مجھ کو پسند ہیں۔ اب میرا یہ رقعہ ان کو مقرر دیجئے گا۔ یہاں لڑکے بالے سب خیر و عافیت سے ہیں۔ تم کو بندگی اور اپنے بھائی بہنوں کو

سلام کہتے ہیں۔ میری طرف سے بیگم کو دعا پہنچے اور عبد السلام اور کلثوم کو دعا پہنچے۔ منشی عبد اللطیف کی خیر و عافیت لکھتے رہیئے گا۔

میر قاسم علی[۲] کا کوئی خط اگر کہیں سے آیا ہو تو مجھ کو اطلاع دیجئے گا۔

[ستمبر ۱۸۵۱ء تا مارچ ۱۸۵۲ء]

(۱۷)

قبلہ معاف رکھیے گا۔ کئی دن کے بعد آپ کو خط لکھتا ہوں۔ منشی ہرگوپال صاحب کے خط سے آپ کی اور لڑکے بالوں کی خیر و عافیت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ اور چار پانچ دن ہوئے۔ آپ کا نوازش نامہ بھی آیا تھا۔ میاں تفتہ نے کچھ حال آپ کے آشوب چشم کا لکھا تھا۔ پھر ان کے ہی خط سے یہ بھی دریافت ہوا کہ کچھ فرصت ہے۔ حق تعالیٰ تمہاری چشم جہاں بیں کو روشن اور تم کو تمہارے فرزندوں کے سر پر سلامت رکھے۔ میرے وجع الصدر کی اتنی فکر نہ چاہیئے۔ میرے امراض بیشتر دورے ہیں۔ آگے ایک قولنج کا دورہ تھا اب وجع الصدر کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔ جب یہ درد اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ چار پہر چھ پہر دوپہر رہتا ہے۔ پھر رفع ہو جاتا ہے۔ منشی جی کی غزلیں آئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کا اپنے پاس پہنچنا جلد چاہتے تھے اور مجھ کو اس دن وہ درد شروع ہوا تھا۔ میں نے لکھ بھیجا کہ آج کل غزلوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ بارے تیسرے دن میں نے ان کی غزلیں بھیجدیں۔ انھوں نے ناحق تم سے ان کا ذکر کیا۔ جو تم متفکر ہوئے۔ قصہ مختصر اچھا ہوں۔

حکیم امام الدین خاں صاحب سے اب رجوع نہیں کرتا۔ حکیم احسن اللہ خاں[۱] صاحب میرے چارہ گر ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ آمد فصل تو ہے۔ تو مسہل لے ڈال۔ چنانچہ دس بارہ منضج اور تین مسہل ہوئے۔ تیسرا مسہل تھا آج۔ تبرید پی کر تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں اور آدمی رقعہ لے کر خاں صاحب کے پاس گیا ہوا ہے۔ دیکھوں مژدۂ امن و فراغ لاتا ہے یا پرسوں ایک مسہل اور بھی ہونا ہے۔ یہ سبب تھا جو آپ کے خط کا جواب

دیر میں لکھا۔ اب آپ مہربانی فرما کر اپنے مزاج کا حال اسی تفصیل سے مجھ کو لکھئے اور بچوں کی خیر و عافیت لکھئے۔

منشی عبداللطیف صاحب کو دعا پہنچے۔ زکیہ بیگم کو دعا پہنچے۔ اور یہ معلوم ہو کہ تم اب کیا پڑھتی ہو۔ اور تمہارا سبق اب کہاں تک پہنچا ہے۔ اس کی ہم کو اطلاع دو۔ نصیر الدین کو اور عبدالسلام کو دعا پہنچے۔ مہمانِ نورسیدہ کا نام بھی بھول گیا ہوں اس کو دعا کہئے۔ اور اس کا نام مجھ کو لکھئے۔

والسلام مع الاکرام از اسداللہ نگاشتہ صبح چارشنبہ

[۲۷ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ نہم مارچ ۱۸۵۲ء بعد آشامیدن تبرید

(۱۸)

بھائی صاحب! آج ہفتہ کا دن پندرھویں مئی کی صبح کا وقت ہے۔ میں نے دو خط تم کو لکھے ہیں ایک خط تو ابھی ڈاک میں روانہ کیا ہے اور ایک خط حکیم الٰہی بخش صاحب کو دیتا ہوں۔ یہ صاحب شرفائے سکندرہ میں سے ہیں۔ اور دوست اور شاگرد اس کے ہیں کہ جس کا میں بغیر دیکھے عاشق ہوں۔ یعنی جناب صاحب عالم صاحب مارہروی سلمہ اللہ تعالےٰ۔ یہ ان کا خط میرے نام لائے تھے۔ کئی مہینے یہاں رہے اور حکیم امام الدین خاں صاحب سے مفرح القلوب پڑھی۔ بہت خوب آدمی اور مہذب ہیں۔ حسن طبع بھی رکھتے ہیں۔ یہاں ان کی نوکری کا کہیں اسلوب نہوا۔ اور زمانے نے مساعدت نہ کی۔ اب یہ اپنے گھر جاتے ہیں۔ کول میں پہنچکر آپ سے ملیں گے۔ ان کی توقیر کیجیے گا۔ اور ان کو اپنا دوست دیرینہ تصور فرمائیے گا۔ اور اس کا خیال آپ کو رہے کہ اس ضلع میں ٹھیکہ دار اور مال گذار بہت ہیں۔ اگر کسو کی خواہش طبیب کی ہو۔ تو انکو اس سے بخوبی ملوا دیجیے گا۔ اور اس باب میں کچھ ایسی جلدی نہیں ہے۔ تم کو خیال رہے۔

جوالہ سنگھ کل آیا۔ اس کے لائے ہوئے خط کا جواب آج ڈاک میں روانہ ہو گیا

مرزا حسن علی بیگ عازم کول ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ پاکھل کا مربہ یا اچار جو ہاتھ آئے گا۔ وہ ان کے ہات بھیجدوں گا۔ اور اگر خدا نے چاہا تو اجزائے تواریخ بھی انھیں کو دے دونگا۔ اوروں کو دعا خط میں کیوں لکھوں۔ حکیم جی خود زبانی سب سے کہدینگے۔

والسلام ازاسد اللہ رقمزدہ صبح شنبہ ۱۵ مئی ۱۸۵۲ء

[۲۵ رجب ۱۲۶۸ھ]

(۱۹)

بھائیصاحب! آگے اس سے دو خط تم کو بھیج چکا ہوں۔ ایک بطریق ڈاک اور ایک حکیم الٰہی بخش کے ہاتھ۔ کل میں قلعہ سے آتا تھا۔ راہ میں مرزا حسن علی بیگ ملے۔ انھوں نے کہا کہ میں کل جاؤنگا یعنی آج۔ یہ تم کو معلوم رہے کہ کل پنجشنبہ تھا۔ ۲۹ رجب اور ۲۰ مئی کی۔ اور آج جمعہ ہے۔ غرض کل رات کو پاکھل کا مربہ مرتبان میں رکھ کر اور اس کو مومی جامہ سے بند کیا۔ اور اس پر اپنی مہر کر کر کلو کے ہاتھ مرزا کے پاس بھجوا دیا۔ کلوان کو مربہ دے کر رات کو اپنے گھر رہا۔ اب صبح ہوئی اور کلو آیا تو اس نے بیان کیا کہ مرزا حسن علی بیگ نے بندگی کہی ہے اور کہا ہے کہ میں کل نہ جاؤں گا۔ پرسوں جاؤنگا۔ اور مرتبان کو اچھی طرح احتیاط سے لے جاؤنگا۔ حضرت کو معلوم رہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کی عنایت سے مربہ ہاتھ آگیا ہے ورنہ اکثر سائلوں کو سرکارِ شاہی سے اچار ملتا ہے۔ مربہ نہیں ہاتھ آتا۔ اب اختیار مرزا صاحب کا ہے کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں اس کو لے جائیں۔ بندہ بری الذمہ ہے۔

اجزائے تواریخ تیموریہ لکھے جاتے ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ جو کوئی جزو لکھا جاتا ہے۔ وہ میرے پاس آتا ہے۔ میں اس کے حاشیے پر معنی لغات لکھتا جاتا ہوں۔ چنانچہ تین جزو لکھ چکا ہوں۔ یعنی تین جزو لکھے ہوئے میرے پاس آچکے ہیں۔ اور میں ان کا حاشیہ لکھ چکا ہوں۔ جب سب آچکے تو بسبیل پارسل ارسال کروں گا چھوٹی تقطیع

خوش آیندہ پر گیارہ سطر کے مسطر سے لکھے جاتے ہیں۔ یقین ہے کہ گیارہ بارہ جزو ہونگے۔ گویا دو ثلث تحریر باقی ہے۔ خدا کرے جلد تمام ہو تاکہ میری شرمساری رفع ہو۔

جوالا سنگھ دو بار میرے پاس آیا۔ میں نے رقعہ لکھ کر ایک ایسے شخص کے پاس بھیجدیا کہ وہ مرجع ہے اس محکمے کے اہل مقدمہ کا۔ اگر حاجت ہوگی اور جوالا سنگھ خواہش کرے گا تو میں اس کو مولوی صاحب کے بھی سامنے کر دوں گا۔ تم مجھ کو حکیم الٰہی بخش کا حال لکھو۔ کہ وہ تم سے ملے اور سکندرہ راؤ کو گئے۔

تفتہ کا حال لکھو۔ کہ یہیں ہیں یا اکبرآباد کو گئے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آج شام تک تمہارا خط میرے پاس آجائے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ صبح کو میں نے خط ڈاک میں بھیجا ہے اور شام کو ہرکارے نے تمہارا خط آکر دیا ہے۔ یہاں عجب اتفاق ہے کہ جیٹھ کا مہینہ ہے اور روز مینہ برستا ہے اور جاڑا پڑتا ہے۔ لوگ شب کو رضائیاں اوڑھتے ہیں اور میں لحاف۔ نوروز سے یہی صورت دیکھتا ہوں کہ دن رات مینہ برستا ہے اور سردی کی شدت ہے۔ دو دن گرمی پڑی اور تیسرے دن مینہ آیا۔ اور دو چار دن بارش رہی۔ تم بھی لکھو کہ تمہارے شہر میں کیا عالم ہے۔

سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہمعصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی۔ کہ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔

آج آپ نے دریافت کیا ہوگا کہ جی چاہا تم سے باتیں کرنے کو۔ یہ میں باتیں

کر رہا ہوں۔ خط نہیں لکھتا مگر افسوس کہ اس گفتگو میں وہ لطف نہیں جو مکالمۂ زبانی میں آتا ہے۔ یعنی میں ہی بک رہا ہوں۔ تم کچھ نہیں کہتے۔ وہ بات کہاں کہ میری بات کا تم جواب دیتے جاؤ اور تمہاری بات کا میں جواب دیتا جاؤں۔ کیا کروں عجب طرح سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میرے حالات سراسر میرے خلاف طبیعت ہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ چلتا پھرتا رہوں۔ مہینہ بھر وہاں اور دو مہینے وہاں اور صورت یہ کہ گویا مشکیں بندھا ہوا پڑا ہوں کہ ہرگز جنبش نہیں کر سکتا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کاغذ تمام ہو گیا اور ہنوز باتیں بہت باقی ہیں۔ اس خبط میں میں نے اپنے بچوں کو بھی دعا نہیں لکھی۔ بھائی تم کہدینا۔ اپنے خط میں ان کی خیر و عافیت لکھنا۔

[یکم شعبان ۱۲۶۸ھ] [۲۱ مئی ۱۸۵۲ء بروز جمعہ]

(۲۰)

بھائی صاحب لو آپکا خط آیا۔ پاکھل کے مربہ کا پہنچنا معلوم ہوا۔ یارب میری ذکیہ اور میرے عبدالسلام کی آنکھیں اچھی ہو گئی ہوں۔ بارہ جزو اجزائے تواریخ کے پہنچتے ہیں۔ ان کی جلد بندھوا لینا۔ ورنہ اوراق تباہ ہو جائیں گے۔ وہ چار روپے جو آپ نے شیخ بخش الدین کے ہاتھ بھیجے تھے۔ وہ میں نے نواب صاحب کو یعنی وہ جو کتابت کرتے ہیں دے دئے تھے۔ ایک نسخہ انھوں نے لکھا وہ میں نے ان سے لے کر ایک اور جگہ بھیج دیا پھر ان کو کثرت کار سے فرصت اس تحریر کی نہ ہوئی۔ اب انھوں نے از راہ مہربانی یہ لکھ کر مجھ کو عنایت کئے۔ آپ نے ایک خط میں مجھ کو لکھا تھا کہ اجرت کاتب میں جو کچھ چاہئے ہو وہ مجھ سے منگوا بھیج۔ واللہ میں نے اپنے پاس سے کچھ نہیں دیا۔ صرف اسی چار روپے میں کاغذ اور دست مزد کاتب ہے۔ آپ خاطر جمع رکھئے۔ محصول ڈاک دیجئے اور کتاب لے لیجئے۔ ہاں بھائی شیخ وزیر الدین بہت تباہ اور خراب ہے۔ اس کا دادا معزز آدمی تھا اور میرا بڑا دوست تھا۔ یہ تمہارا بھی نیاز مند ہے حتی الوسع خیال دوڑاؤ اور گنجائش نکالو۔

اگر کہیں نوکری قرار پا جائے تو گویا مجھ پر احسان ہوگا۔

جوالا سنگھ کل تین بار میرے پاس آیا ہے۔ کچھ ہرزہ گوش آدمی ہے۔ میں نے اسے رقعہ لے کر ایک ایسے شخص کے پاس بھیجدیا تھا۔ جو حاکم کی زبان اور حاکم کے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میرا جو کام تھا میں نے کیا۔ اگر وہ کہے گا تو حاکم سے بھی ملا دوں گا۔ کل تفتہ کا خط آگرہ سے آیا بہت دن کے بعد۔ اچھی طرح ہیں۔ عرضی شیخ کی پہنچتی ہے۔ اس کا جواب مناسب لکھئے اور کوشش کیجئے۔

بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزادگان تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا۔ سو میں حکم بجا لایا اور غزل لکھی۔ پہلے تم ایک بات میری سن لو۔ پھر غزل پڑھو۔ شیخ وزیر الدین بیمار ہو کر انچی ڈاک سے کول کو روانہ ہوا ہے۔ میں اگرچہ خدمت گزار خلق ہوں۔ پر ان کی کچھ خدمت بجا نہ لا سکا اور ان سے شرمندہ رہا۔ تم ان کی دلجوئی کرنا۔ آدمی ان کے گھر بھجوانا اور ان کی خبر پوچھنا۔ اور بھائی اگر ہو سکے تو کسو کے اپنے علاقہ میں مختار کاری سر رشتہ کی عرائض نویسی نقل نویسی کچھ نہ کچھ ان کے واسطے کر دینا۔ ضرور ضرور۔

لو اب غزل پڑھو۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے نصیب اسکے ہیں راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

[مئی یا جون ۱۸۵۲ء]

(۲۱)

بھائی صاحب - آپ کے دو خط آئے - پہلے خط میں آپ نے ایک بیت کے معنی پوچھے ہیں - وہ سنئے -

تو گوئی مگر مہر زیرِ زمیں ... فروزاں فوہ بود پشتِ نگیں

یہ شعر شبِ معراج کی توصیف میں ہے - کہ وہ شب ایسی روشن تھی ..... ...... کہ بہ سبب روشنی کے زمین ایسی چمکتی تھی - کہ جیسے ڈانک سے نگینہ چمک جاتا ہے - آفتاب رات کو تحت الارض ہوتا ہے - اور ڈانک بھی نگینے کے تلے لگاتے ہیں - اور نگینہ بقدر ڈانک کی حقیقت کے چمکتا ہے - پس جس نگیں کے نیچے آفتاب ڈانک ہوگا - وہ نگیں کتنا درخشاں ہوگا - فوہ فارسی لغت ہے بمعنی ڈانک کے -

دوسرے خط کا جواب کیا لکھوں - تم سے شرمندہ ہوں - پنڈت جوالا ناتھ صاحب سے شرمسار - میں جو تاریخ تیموریہ لکھتا ہوں تو صرف حالات و واقعات لکھتا ہوں - ملک کی جمع بندی اور اضلاع و مضافات کی تحقیقات سے مجھے کام نہیں - اور علی گڈھ کول صوبہ نہیں - سرکار ہو تو ہو - اور اس طرح کا معمورہ نہیں کہ کبھی کسی عہد میں بادشاہ کا تخت گاہ رہا ہو - جیسے بدایوں اور جونپور - اور کڑا مانک پور کہ یہ بھی مانند کول کے چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں - اور تخت گاہ رہی ہیں - کول میں کبھی ایسا

اتفاق نہیں ہوا۔

دفتر شاہی کا حال کیا لکھوں۔ حضرت فردوس منزل شاہ عالم کے عہد کا کاغذ سو بھی وہ کہ جنرل لارڈ لیک صاحب کے عرائض اور بادشاہ کے شقوں کی نقل، وہ تو ہیں اور باقی تمام دفتر موافق مثل مشہور کہ گاؤ خورد ہو گیا۔ جو کتابیں کہ ہندوستان میں متعارف ہیں۔ وہ بھی تو نہیں۔ ملک کے بندوبست اور پرگنہ بندی اور جمعبندی کا کیا ذکر۔ جو کچھ پنڈت صاحب نے از روئے ترجمہ آئین اکبری لکھا ہے اس سے زیادہ کہیں سے ہاتھ نہ آئیگا۔ اگر رقعہ میں یہ نہ لکھا ہوتا کہ یہ از روئے ترجمہ آئین اکبری ہے۔ تو میں کہیں سے آئین اکبری بہم پہنچا کر اس میں دیکھتا۔ اب میں کہاں سے دریافت کروں۔ پنڈت صاحب کو میرا سلام کہئے۔ اور یہ خط ان کو پڑھا دیجئے۔ میں فن تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنوں کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازان دفتر شاہی خلاصہ حالات از روئے کتب اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ میں اس کو فارسی کر کر حوالہ کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں۔ میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں۔ مورخ نہیں ہوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

بھائی صاحب تمہاری جان کی قسم۔ میں اس فن سے اتنا بے خبر ہوں کہ یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھا کہ پنڈت صاحب نے کیا کچھ لکھ لیا ہے اور وہ کیا ہے جس کی اُن کو خواہش ہے۔ میرے بھائیوں میں نواب ضیاء الدین احمد خاں خلف نواب احمد بخش خاں مرحوم کہ وہ فن نظم و نثر میں میرے شاگرد ہیں۔ اب جو ان کی طبیعت فن تاریخ کی طرف آئی ہے۔ تو اس میں وہ یگانۂ روزگار اور بڑے دانا و ہوشیار ہو گئے ہیں۔ میں نے ان سے چاہا تھا کہ کچھ دریافت کر کے لکھ بھیجوں۔ سو انھوں نے کہا کہ آئین اکبری کے سوا

کسی اور کتاب میں کچھ پتہ نہ پایا جائے گا۔ حالانکہ کوئی کتاب اس باب کی ایسی نہیں کہ انکی نظر سے نہ گزری ہو اور خلاصہ اس کا حافظہ میں موجود نہ ہو۔ میرا وہ حال جس پر مجھ کو بھروسا اس کا یہ بیان۔ بادشاہ کے کتب خانہ کی وہ صورت۔ بندگی اور شرمندگی۔

[۶ صفر سنہ ۱۲۶۹ھ] از اسد اللہ نگاشتہ و رواں داشتہ جمعہ ۱۹ نومبر سنہ ۱۸۵۲ء

(۲۲)

بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنے میں تم کو تامل رہا۔ اس میں دو استفہام آپڑے ہیں۔ کہ وہ بطریق طعن و تعریض معشوق سے کہے گئے ہیں ؎

موت کی راہ نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں۔ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بن آئے نہ رہے۔ کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے کہ ایک دن آئے ہی گی۔ انتظار ضائع نہ جائیگا۔ تم کو چاہوں۔ کیا خوب۔ کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے۔ یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے۔ گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی۔ تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں۔ بات یہ ہے کہ پڑھنے میں ؎ تم کو چاہوں کہ نہ آؤ یہ جملہ ملا ہوا سمجھ میں آتا ہے تو آدمی حیران ہوتا ہے۔ تم کو چاہوں الگ ہے کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے یہ جملہ الگ ہے تم نے غور نہ کی ورنہ خود بخود کیفیت اس تعریض و استفہام کی حاصل ہو جاتی۔

ہاں صاحب اجمیر سے خط آگیا۔ پارسل پہنچ گیا۔ تردد رفع ہوا۔ اب جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہے گا محل تشویش و تردد نہیں۔ حکیم نسیم اللہ صاحب کی روانگی میں پانچ چھ روز اور ہیں۔ اگر ہاتھ آگیا تو پاکھل کا مربہ اچار جو کچھ ہو گا ان کے ہاتھ بھیجدوں گا۔

منشی عبد اللطیف صاحب کو دعا پہنچے۔ نصیر الدین کو دعا پہنچے۔ ہمارے شیخ اکرام الدین اور تمہارے عبد السلام کو دعا پہنچے۔ لو صاحب اب کوئی مجھ سے گلہ نہیں

کر سکتا۔ میں سب کے بعد اپنی پیاری بھتیجی زکیہ بیگم کو دعا لکھتا ہوں۔ حق تعالیٰ اس کو جیتا رکھے اور مجھ کو اس کی صورت دکھلا دے۔ ورنہ اب آگے بڑھ کر جب وہ بی بی صاحبزادی بن جائے گی۔ تو ہمارے سامنے کاہے کو آئے گی۔ ہم سے چھپے گی۔ کس واسطے کہ میں سچ مچ کا چچا تو ہوں نہیں زبردستی اپنی طرف سے چچا بن گیا ہوں۔ تفتہ کو میرا سلام کہدینا اور کہدینا کہ تم کو خط بھیج چکا ہوں اور جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکا ہوں۔ اب کوئی نئی بات نہیں ہے جو لکھوں۔

والسّلام از اسد اللہ محررہ شنبہ ہشتم جنوری ۱۸۵۳ء

[۲۷ ربیع الاوّل ۱۲۶۹ھ]

(۲۳)

بھائی صاحب! کئی دن ہوئے کہ آپ کا عطوفت نامہ پہنچا۔ جواب کیا لکھتا۔ حکیم نسیم اللہ خاں روانہ ہو گئے تھے۔ پاکھل کے مربے کا حال ان سے زبانی کہہ دیا تھا۔ سن لیا ہوگا۔ حیات بخش باغ خاصہ خسروی میں ایک درخت ہے پاکھل کا۔ میزان و سنبلہ میں وہ بار لاتا ہے۔ اس کا اچار مربہ بن جاتا ہے۔ اب کے وہ نخل بار نہ لایا۔ ناچار اب کے مربہ اچار نہ بنایا۔ تمہارا کمترین بھائی مجبور ہے۔ بندہ پرور تفتہ سے ملاقات ہوتی رہتی ہوگی۔ مجھ کو لکھئے کہ اب وہ کیسے ہیں اور کس فکر میں ہیں۔ اجمیر جائیں گے یا نہیں۔ منشی عبد اللطیف صاحب کو دعا پہنچے۔ زکیہ بیگم کو دعا پہنچے۔ اور یہ معلوم ہو کہ جو تم نے لکھا تھا وہ مجھ کو معلوم ہوا۔ اور میری خاطر جمع ہوئی۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے۔ اور عفت و عصمت اور عزت و حرمت اور مال و دولت عطا کرے۔ نصیر الدین اور عبد السلام کو دعا پہنچے۔ فقط

[فروری یا مارچ ۱۸۵۳ء]

(۲۴)

لو بھائی! اب تو بی زکیہ ہمارے تمہارے برابر ہو گئیں۔ آخر ہم تم بھی تو اس عمر میں سورۂ مبارکہ الم نشرح پڑھتے ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عم یتساءلون کا یہ پارہ تمام

نہ ہوگا کہ میں آن کر ان کا سبق سنوں گا۔ واللہ علیٰ کُل شئیٔ قدیر۔

مسہل میں نے اس واسطے لیا تھا کہ میرے اعضا میں درد رہتا تھا۔ اور فضول معدہ میں جمع ہو گئے تھے۔ سو عنایت ایزدی سے مقصود حاصل ہو گیا۔ اب میں سبکسار اور تندرست ہوں۔ امام الدین خاں سے میرا اعتقاد۔ ان کی مجھ پر عنایت بدستور لیکن حکیم احسن اللہ خاں صاحب سے ربط بڑھ گیا۔ اور اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے اور یہ بھی پایہ علم و عمل میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ اس واسطے انہیں کی رائے کے مطابق تنقیہ کیا گیا۔

حکیم نسیم اللہ صاحب تم سے ملیں یا منشی عبداللطیف سے ملیں اور کچھ نہ کہیں۔ مجھ کو اس سے کچھ کام نہیں۔ مدعا یہ کہ پاکھل کے مربہ کا پیام ان کی تحویل ہے۔ وہ آپ سے کہدیں۔ ہر چند وہ کیا ہے جو کہا چاہئے۔ مگر مجھ پر سے احتمال قصور جاتا رہتا ہے اور وہ پیام یہ ہے کہ پاکھل کا حیات بخش باغ میں کل ایک درخت ہے اور وہ اکتوبر نومبر میں بار لاتا ہے۔ اس کے اثمار کا اچار مربہ بنا لیتے ہیں۔ اب کے سال وہ درخت کم بخت بارور نہ ہوا۔ اس راہ سے مربہ ہاتھ نہ آیا۔

جے پور سے ہنوز کوئی امر فیصل نہیں معلوم ہوا۔ کتاب اور عرضی راجہ صاحب کے پاس بھیجی ہے اور وہ خوش ہوئے ہیں۔ اور دیوان کو اپنی نظر میں رکھتے ہیں۔ اور پہنچانے والے سے عرضی کے جواب کا وعدہ ہے۔ نئے ایجنٹ کے آنے کا ہنگامہ تھا۔ وہ بھی ختم ہوا۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ دل بجھ گیا ہے جو ابتدا میں رنگ امید کا تھا وہ اب نہیں ہے۔

نیم کی پنیاں تم پیتے ہو۔ خوب کرتے ہو۔ یہ کہ اس کو کھا کر ایک بیسن کی ٹکیا گھی ڈال کر کھاتے ہو۔ یہ ترکیب عامیانہ ہے۔ ہاں یہ مسلّم کہ چنے کی روٹی ان امراض میں اگر غذا منحصر اسی پر کی جائے۔ اور ایک مدّت تک یہ طریق نبھ جائے تو بہت نافع ہے۔ میں ایک بات تمہیں اور بتاتا ہوں۔ تم نیم کی مستی پیا کرو۔ یعنی بعضا نیم رستا ہے اور

اس میں سے ایک رطوبت نکل کر جم جاتی ہے۔ اسے نیم کی مستی کہتے ہیں۔ سبیل اس کی یہی ہے کہ دو پیسے بھر سے شروع کرو اور پانچ ماشہ بڑھاتے جاؤ۔ جب پانچ تولہ پر آجاؤ تو تھم جاؤ۔ بھلا زیادہ نہیں تو بیس دن تو پانچ پانچ پیسا بھر ہو۔ پرہیز بدستور بیشتر چنے کی روٹی کھایا کرو۔ دوا پی کر ٹکیا کھانی زائد ہے۔ چنے کی روٹی کے ساتھ وقت غذا کے گھی بقدر برداشت طبع کھاؤ۔ گھیا۔ توری۔ خرفے کا ساگ۔ بتھوے کا ساگ۔ کھیرا۔ ککڑی جس کا قلیہ مرغوب ہو۔ کھاؤ۔ دیکھو تو یہ ترکیب موافق آتی ہے یا نہیں۔ بہ منشی عبداللطیف دعا برسد۔ نصیر الدین و زکیہ بیگم و عبدالسلام و کلثوم بیگم دعا خوانند۔

[۶ جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ] از اسد اللہ پنجشنبہ ۱۷ مارچ ۱۸۵۳ء۔

(۲۵)

حضرت عجب تماشا ہے۔ منشی ہرگوبند سنگھ کا اظہار تو یہ ہے کہ منشی صاحب تو میرے سامنے ہاترس سے ہو آئے۔ اور قرینہ دال اس پر ہے کہ تم ہنوز ہاترس ہو اور کول نہیں آئے۔ قرینہ یہ کہ خط آپ نے مجھ کو نہیں لکھا۔ قصیدہ کے لفافہ کی رسید نہیں لکھی۔ کیوں صاحب میں نے کیا تقصیر کی ہے۔ میری کیا خطا ہے مجھ کو آپ کیوں بھول گئے۔ میں بھی تم کو خط نہ لکھتا لیکن کیا کروں منشی ہرگوبند سنگھ نے بیگم کا پیام بھیجا۔ ناچار اس کا جواب لکھنا پڑا۔ اسی ضمن میں تم کو بھی کئی سطریں لکھ دیں۔ وہ کہتے تھے کہ بیگم نے کہا ہے کہ چچا میں قرآن پڑھتی ہوں۔ پس میری طرف سے دعا کہا چاہیے۔ اور کہا چاہیے کہ بُوا تم بہت بھلا کرتی ہو کہ قرآن پڑھا کرتی ہو۔ پروردگار تم کو عمر و دولت و عصمت اور تندرستی اور راحت دے۔ منشی عبداللطیف صاحب کو دعا اور نصیر الدین و عبدالسلام اور کلثوم کو دعا پہنچے۔

ہاں بھائی صاحب۔ اب میں جدا خط کیا لکھوں۔ ضرور ضرور یاد کر کر منشی ہرگوپال صاحب کو میری دعا کہو۔ اور یہ کہو کہ بھائی وہ تو میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں کہ ابالی راج جے پور نے ہردیو سنگھ سے بعد ہولی رخصت کرنے کا وعدہ کیا ہے اور جانی صاحب نے

اس کے واسطے سانڈنی بھیجنی چاہی ہے۔ اگر وعدہ وفا ہوا ہوتا اور ہر دیو سنگھ اجمیر پہنچا ہوتا تو البتہ راجہ کا شقہ اور ۲۴ روپے کا خط اور وہ میرے بھیجے ہوئے لفافے بابو صاحب مجھ کو بھیج دیتے۔ اور عنوان چگونگی رخصت سے اطلاع دیتے۔ نہیں معلوم کہ رخصت عمل میں آئی یا نہ آئی اگر آئی تو جانی جی شاید اجمیر میں نہیں ہیں۔ بھرتپور گئے ہوئے ہیں۔ اب مجھے دو تشویشیں لاحق ہیں۔ ایک تو یہ جس کا ذکر کیا۔ بلکہ سچ پوچھو یہ کچھ نہیں۔ ایک بار یچہ ہی۔ اصل تشویش بابو صاحب کی طرف سے ہے۔ تم اگرچہ وہاں نہیں ہو مگر بہ نسبت میرے تم کو اطلاع ہوتی رہتی ہے قصہ مختصر جو کچھ تم کو معلوم ہوا ہے فوراً مجھ کو لکھ بھیجو۔ بلکہ میں اس وقت تک منتظر ہوں کہ شاید کوئی خط تمہارا آجائے۔ بھائی تم کو میرے سر کی قسم یہ سطریں میاں تفتہ کو پڑھا دینا۔ والسلام۔

از اسد اللہ محررہ شنبہ چارم اپریل ۱۸۵۳ء

[۴ ۲ رجادی الثانی ۱۲۶۹ھ]

(۳۶)

بھائی صاحب۔

کیسی تاریخ اور کیسی نقل۔ کیا فرماتے ہو۔ پہلے مجھ سے حقیقت تو پوچھ لیا کرو۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جو نظم و نثر تمہاری نظر سے نہ گزرے وہ ضائع ہے۔

وائے برجانِ سخن گر بسخنداں نہ رسد

اب سنئے ماجرا کیا ہے۔ جب ہمایوں کے حال تک پہنچا تو میں نے از راہ عذر و حیلہ بلکہ بہ سبیل اظہار حقیقت واقعی حکیم صاحب کا رفرما سے کہا کہ مجھ سے انتخاب حالات ممکن نہیں۔ آپ مدعا کتب سیر سے نکال کر زبان اردو میں ایک مسودہ اس کا لکھوا کر میرے پاس بھیج دیا کیجئے۔ میں اس کو فارسی کر کے تم کو دے دیا کروں گا۔ انھوں نے اسکو قبول کر کر ابتدائے آفرینش عالم و آدم سے میرے پاس مسودہ اردو بھیجا۔ تو اب گویا

ایک اور کتاب لکھنی پڑی۔ میں نے اس کا چھوٹا سا دیباچہ لکھ کر ایک اور ہی انداز کی عبارت میں لکھنا شروع کیا۔ آدم سے لے کر چنگیز خاں تک انھوں نے میرے پاس مسودہ بھیجا۔ میں نے اپنے طور پر لکھا اور مسودہ حوالے کیا۔ رمضان کے مہینے سے کہ آج اس کو دس مہینے ہوئے وہ مسودہ آنا موقوف ہوگیا۔ بہمہ جہت چار جزو ہوں گے۔ دو چار بار میں نے ان سے تقاضا کیا یہی جواب سنا کہ اب رمضان ہے۔ پھر کہا کہ عید کا ہنگامہ ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھ کو کیا۔ میں کیوں طالب مشقت ہوں تقاضا موقوف کیا۔ وہ چار جزو میرے لکھے ہوئے حکیم صاحب کے پاس ہوں گے۔ اب کہاں ان سے مانگوں اور کیوں مانگوں۔ جانے دو۔ دور کرو۔ جو بنا اٹھی ہی نہیں اس سے غرض کیا۔

جے پور کا حال کیا پوچھتے ہو۔ ایک گدائی کی طرح نکالی تھی۔ ایک دوست مددگار ہوا اور اس طرح کو اس نے کمال کو پہنچایا۔ راول مختار راج اور سعد اللہ خاں وکیل راج یہ دونو ذریعہ حصول مآثر تھے۔ وہاں کا رنگ یہ ہوگیا کہ راول بھاگتا پھرتا ہے اور وکیل استعفا بغل میں دابے رہتا ہے۔ راجہ لڑکا ہے۔ اور کوئی محرک نہیں۔ بس اب اس امر خاص کو بھی ہم نے فہرست حسرت ہائے دیرینہ میں لکھ دیا۔ واللہ علی کل شئی قدیر۔ سب بچوں کو خصوصاً بیگم کو دعا کہنا۔ اور میری طرف سے پیار کرنا۔

والسلام از اسد اللہ

یکشنبہ دہم اپریل ۱۸۵۳ء [یکم رجب المرجب ۱۲۶۹ھ]

(۲۷)

بھائی۔ یہاں بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ ہر مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے۔ پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور فارسی کا ایک مصرعہ اور ریختہ کا ایک مصرعہ طرح کرتے ہیں۔ اب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہوا اس میں مصرعہ فارسی یہ تھا ع زیں تماشہ گاہ گریاں می رود۔

ریختہ کا مصرعہ یہ تھا ؎ خارِ عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے۔ نظر ہے کیا کہئے، خیر ہے کیا کہئے۔

میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا ریختہ اسی طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھا۔ وہ تینوں غزلیں تم کو لکھتا ہوں پڑھ لینا۔ اور میاں تفتہ کو بھی دکھا دینا۔ بچوں کو دعا کہہ دینا۔ تمہارا دوسرا خط معہ رقعہ ملفوفہ پہنچ گیا ہے والسلام و الاکرام ؏

[۱۰ ار تا ۲۳ ر اپریل سنہ ۱۸۵۳ء]

چاک[۱] از جیبم بہ داماں مے رود
تا چہ بر چاک از گریباں مے رود

جوہرِ طبعم درخشان ست لیک
روزم اندر ابر پنہاں مے رود

گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار
چوں رود از دست آساں مے رود

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں مے رود

ہر شمیمے را مشامے در خور ست
بوئے پیراہن بہ کنعاں مے رود

آید و از ذوق نشناسم کہ کیست
تا رود پنداشتی جاں مے رود

مے برد اما نہ یکجا مے برد
مے رود اما پریشاں مے رود

ہر کہ بیند در رہش گوید ہمے
قبلۂ آتش پرستاں مے رود

اوّل ماہ است و از شرمِ تو ماہ
آخرِ شب از شبستاں مے رود

بگذر از دشمن دلش سخت است سخت
آبروئے تیر و پیکاں مے رود

کیست تا گوید بداں ایواں نشیں
آنچہ بر غالب ز درباں مے رود

---

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

رہے ہے یوں گہ وبیگہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے بھی ہمیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال
کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیے

تمہیں نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے

کہا یہ کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

* * *

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہئے

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنئے
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہئے

کہیں حقیقتِ جانکاہئ مرض لکھئے
کہیں مصیبت ناسازئ دوا کہئے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہئے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

[۵۳] نہ ہو نگار رہیں الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانئ روشِ و مستئ ادا کہئے

[۵۴] نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبئ ہوا کہئے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

(۲۸)

بھائی صاحب۔
بڑا تعجب ہے تم اس شعر کے معنے پوچھتے ہو۔

اوّل ماہ است از شرمِ تو ماہ
آخر شب از شبستاں مے رود

اوّل ماد - یہاں ماہ بمعنی مہینے کے ہے اور اوّل سے ۸، ۹، ۱۰ تاریخ مقصود ہے - اوّل راتوں میں بعد آدھی رات کے چاند چھپ جاتا ہے - پس شاعر کہتا ہے کہ ہنوز ابتدائے حال ہے اور قمر زاید النور ہے - اور باوجود اس روز افزونی دولت کے تیری شرم سے آخر شب کو بھاگ جاتا ہے اور تمام رات تیرے مقابل نہیں رہ سکتا - اس کو حسن تعلیل کہتے ہیں - یعنے چاند کا اوائل ماہ قمری میں آخر شب غروب ہونا ضروری ہے - شاعر نے اس کی ایک اور وجہ قرار دی ہے - فقط

بارے میاں تفتہ کی صحبت غنیمت ہے - میری جگہ خالی - افسوس کہ میں نہیں - عبد اللطیف میری جان ہے - میرا جگر ہے - میرا فرزند ہے - تم اس کے مقدمے میں بولنے والے اور واسطۂ حصول مدعا ہونے والے کون - اس کو کس نے منع کیا ہے - اس کو کون منع کرتا ہے - نظم و نثر جو اس کو منظور ہو میرے پاس بھیجے - تقاضا نہ کرے - میں اپنے طور پر دیکھوں گا اور تم کو بھیجوں گا - اس شرم نے مجھ کو مارا جب عبد السّلام پیدا ہوا اور میں نے مبارکباد لکھی - تو جناب منشی صاحب یعنی میاں عبد اللطیف نے جواب نہ لکھا - آخر تم نے مجھ کو لکھا کہ بھائی وہ تو شرماتا ہے تم کو جواب کیا لکھے - اب یہ نثر کا واسطے اصلاح کے بھیجنا بھی کوئی ایسا امر ہے کہ جس میں حضرت کو شرم آتی ہے - خدا کی پناہ - زکیہ بیگم کو دعا کہو - زیادہ زیادہ -

[شنبہ مطابق ۱۴ر رجب المرجب ۱۲۶۹ھ] ۲۳ر اپریل ۱۸۵۳ء

(۲۹)

بھائی صاحب! آپکا عنایت نامہ مقام ہاتھرس سے پہنچا - بیگم کا کول میں آجانا خوب ہوا - دیکھئے تم کب تشریف لاتے ہو - خط کا نہ لکھنا فراموش کاری کی راہ سے

نہیں ہے۔ یہ خیال کہ ابھی ہاترس سے نہ آئے ہوں مانعِ تحریر رہا۔ منشی ہرگوپال صاحب کو ایک خط میں کچھ حال جے پور کا لکھا تھا۔ سو یہ بھی ان کو لکھا تھا۔ کہ اگر بھائی ہاترس سے آگئے ہوں تو ان کو یہ خط پڑھوا دینا۔ اور جب وہ آویں تو مجھکو خبر کرنا۔ آج اس بات کو سات دن ہوئے۔ ان کا ابھی کوئی خط نہیں آیا۔

گرمی کا کیا حال پوچھتے ہو۔ میرا تو بعینہٖ وہ حال ہوتا ہے۔ جو زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا ہوتا ہے بقول ظہوری سے حالِ سگ حالِ گربہ حالِ شغال۔ جب مجھ کو اس موسم میں دیکھو تو جانو کہ میں کیونکر زندگی بسر کرتا ہوں۔

ایک نئی بات سنو۔ شہر میں ایک وبا آئی ہے۔ یعنی وکیل کمپنی نے سنینِ ماضیہ کے کاغذ دیکھ کر رسوم سرکاری جس شخص پر لینی تھیں۔ اس کا مطالبہ کیا ہے اور مطالبہ کیا مواخذہ یعنی بہت شدت۔ ازانجملہ مجھ پر بھی بابت رسوم سرکاری پانسو روپے آٹھ آنے نکلے۔ اور اس کی طلب بقید حکم قید ہوئی۔ میں آٹھ آنے کو محتاج پانسو کہاں سے لاؤں۔ بارے حضرت انگریزی تنخواہ میں سے پانچ روپے مہینہ بطریق قسط مقرر کر دیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ پاتا تھا۔ ستاون روپے آٹھ آنے رہ گئے۔ پانچ روپے مہینہ کا ساٹھ روپے سالیانہ ہوا۔ اب یہ توقع کہاں کہ پوری تنخواہ پاؤں گا۔ یوں سمجھے کہ ستاون روپے کا پنشن دار ہوں۔ بارے کل فیصلہ ہوا۔ تین دن تک سوار نہ ہوا۔ اور قلعہ نہ گیا۔ کل گیا تھا۔ اور آج گیا تھا۔ اب خیر و عافیت ہے۔ چونکہ لڑکے بالوں میں سے کوئی تمہارے پاس نہیں ہے اور میں خط بمقام ہاترس بھیجتا ہوں۔ اس واسطے کسی کو دعا نہیں لکھتا۔ پر دیتا ہوں دعا۔

والسلام مع الاکرام۔ از اسد اللہ

[۲۰ شعبان ۱۲۶۹ھ بروز اتوار]

۲۶ مئی ۱۸۵۳ء

بھائی صاحب کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کا ہاترس سے کول آجانا ہم کو معلوم ہوگیا تھا ہمارا ایک وقائع نگار اس ضلع میں رہتا ہے حق تعالےٰ اس کو جیتا رکھے۔

گرمی کا حال کیا پوچھتے ہو اس ساٹھ برس میں یہ لُو اور یہ دھوپ اور یہ تپش نہیں دیکھی۔ چھٹی ساتویں رمضان کو مینہ خوب برسا۔ ایسا مینہ جیٹھ کے مہینے میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب مینہ کھل گیا ہے۔ ابر گھرا رہتا ہے۔ ہوا اگر چلتی ہے تو گرم نہیں ہوتی اور اگر رک جاتی ہے تو قیامت آتی ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا کبھی حقہ پی لیا کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔

جے پور کا حال آپ کو منشی صاحب کے اظہار سے یا ان کے نام کے خطوط دیکھ کر معلوم ہوگیا ہے۔ مکرر کیوں لکھوں۔ خیر غنیمت ہے۔ یہ کیا فرض تھا کہ جو ہم چاہتے تھے وہی ہوتا۔

ہاں بھائی پرسوں کسی شخص نے مجھ سے ذکر کیا کہ اردو اخبار دہلی میں تھا کہ ہاترس میں بلوہ ہوا اور مجسٹریٹ زخمی ہوگیا۔ آج میں نے ایک دوست کے ہاں سے اس اخبار کا دو ورقہ منگا کر دیکھا واقعی اس میں مندرج تھا کہ راہیں چوڑی کرنے پر اور حویلیاں اور دکانیں ڈھانے پر بلوہ ہوا۔ اور رعایا نے پتھر مارے اور مجسٹریٹ زخمی ہوا۔ حیران ہوں کہ اگر یوں تھا تو صاحب وہاں سے چلا کیوں آیا۔ اور اگر حاکم نہیں آیا تو آپ کیونکر تشریف لائے۔ ہوسنا نہ خواہش ہے کہ آپ اس حال کو مفصل لکھیے۔

ہاں صاحب منشی عبداللطیف صاحب ارادہ کر کے رہ گئے۔ اپنی نثریں کیوں نہیں بھیجتے۔ کیا میرے خطوط اردو زبان میں دیکھ کر وہ ایسا گمان کرتے ہیں کہ یہ فارسی نثر لکھنی بھول گیا۔ میری طرف سے ان کو دعا کہو اور کہو کہ صاحب ہم تمہاری نثر دیکھنے کے مشتاق ہیں۔

شیخ نصیر الدین اور زکیہ بیگم اور شیخ عبدالسلام اور کلثوم بیگم کو دعا پہنچے اور بیگم کو یہ معلوم ہو کہ بوا ابھی کچھ نہیں کہتا اگر اتفاق ہوا تو قریب عید کے یا بعد عید کے میں تم کو دیکھونگا۔ اور تمہارا قرآن پڑھنا سنوں گا۔ لیکن تم اپنے باوا سے یہ بات نہ کہنا اور اپنے دل میں رکھنا۔ کس واسطے کہ اگر وہ سن لیں گے تو مجھ سے اس کی تفصیل پوچھیں گے۔ نگاشتہ و رواں داشتہ چار شنبہ ۱۴ رمضان [۱۲۶۹ھ] و ۲۲ جون ۱۸۵۳ء۔

(۱۳۱)

پیر و مرشد! غلام کی کیا طاقت کہ آپ سے خفا ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ جہاں آپکا خط نہ آیا میں نے شکوہ لکھنا شروع کیا۔ ہاں یہ پوچھا چاہیئے کہ اب کے گلہ کی نگارش کیوں ملتوی رہی۔ سنئے میرزا یوسف علی خاں ابن مرزا نجف علی خاں علیگڈھ سے آئے۔ انسے پوچھا گیا ہمارے بھائی صاحب ملے تھے۔ انھوں نے کہا صاحب نہ وہ وہاں ہیں نہ منشی عبداللطیف یعنی دونوں صاحب دورہ میں صاحب مجسٹریٹ کے ساتھ ہاترس گئے ہیں اب آپ ہی کہئے کہ میں خط کس کو لکھتا اور کہاں بھیجتا۔ منتظر تھا کہ آپ کا خط آئے تو اس کا جواب لکھوں۔ کل حضرت کا نوازشنامہ آیا۔ آج جواب لکھا۔ آپ ہی فرمائیے کہ میں آپسے خفا ہوں یا نہیں۔

بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو۔ اور اگر تم نے پوچھا ہے تو میں کیا لکھوں۔ دست موقوف ہو گئے مگر کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ تپ جاتی رہی مگر گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے۔ ہچکی اس شدت کی نہیں رہی۔ گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکار سی آتی ہے۔ ہوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں۔ اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس ہیئت

سے برآمد بھی ہوتے ہیں۔ قلعہ ہی قلعہ میں پھر کر پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصور کیجئے اور مشہور بھی یوں ہی ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے۔ بہرحال جب تک سلامت رہیں، غنیمت ہے لیکن وہ میرا مدعا کہ غسلِ صحت کریں اور نذریں لیں اور میں رخصت لوں اور بسبیل ڈاک باندہ کو جاؤں۔ دیکھئے کب تک حاصل ہو۔ ڈاک کا لطف آدھا رہ گیا یعنی وہ آم کہاں اور برسات کہاں۔ مگر خیر کول میں بھائی کا ملنا اور بچوں کا دیکھنا اور باندہ میں بھائیوں کا ملنا اور بچوں کا دیکھنا یہ دیکھا چاہئے کب میسر ہو۔ اس بوڑھی ڈاڑھی پر اپنے فرزند کو دم کیا دونگا۔ بھائی خدا کی قسم یہ سفر میرے دلخواہ اور موافق مزاج تھا اور ہے مگر غور کر دکہ کیا اتفاق ہوا۔ اگر اور صورت بھی ہو جاتی تو بھی میں اب تک تمہارے پاس ہو کر باندے کو روانہ ہو جاتا۔ کیا کروں۔ اس صورت میں رخصت نہیں مانگی جاتی۔ اور رخصت لئے بغیر جانا نہیں ہو سکتا۔ عرفت ربی بہ فسخ العزائم۔ تفصیل پھر لکھوں گا۔ بچوں کو دعا

اسداللہ۔ فقط

[۱۶ ذیقعدہ ۱۲۶۹ھ بروز یکشنبہ] ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء

(۳۲)

بھائی صاحب! یہ شعر کس کا ہے ؎

بڑھ گئی تعظیم میری امتناعِ دخل سے
اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مجھکو اسکے درباں دیکھکر

ہاں اور کس کا ہو گا یا میرا یا میرے بھائی کا۔ واللہ کیا شعر ہے۔ یہ ایک روش خاص ہے۔ ہر کوئی اس کو نہیں جانتا۔

بارے ان دنوں میں دو آدمیوں کی زبانی آپ کی خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ ایک تو محبوب خاں رسالدار اور دوسرے میاں محمد حسین دلی کے رہنے والے کہ وہ صدر الصدور کی ملاقات کو کول گئے تھے۔ غزل بھی تمہاری انھوں نے مجھکو دکھائی۔

ساری غزل خوب ہے۔ مگر اس شعر کا عالم اور ہے۔

آپ میرے عزم کو بالکل ویسا ہی بالجزم تصور کیجئے گا۔ بادشاہ اچھے ہوگئے غسل صحت کرنے کی دیر ہے۔ غسل صحت کا دربار ہوا اور میں نے مبارکباد کا قصیدہ یا قطعہ پڑھا اور رخصت لی اور ڈاک گاڑی میں بیٹھا اور کول پہنچا۔ اور وہاں آٹھ پہر رہا اور آگے کو روانہ ہوا۔

ایک شیخ مومن علی[۲] صاحب صدر امین کول یہاں آئے تھے۔ ایک دن وہ میرے ہاں تشریف لائے میں سوار ہوگیا تھا۔ نہ ملا۔ دو دن کے بعد میں ان کے ہاں گیا۔ ملا۔ تمہارا بھی ذکر آیا۔ تمہاری بہت تعریف کرتے تھے۔ میں منتظر تھا کہ وہ اب پھر آئیں گے۔ تا یہ کہ دن چار ایک ہوئے کہ میں نے قلعہ میں حکیم امام الدین خاں سے پوچھا کہ صدر امین کول جن کا آپ علاج کرتے تھے وہ اب کیسے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ کول کو گئے۔ غرض یہ کہ اگر آپ سے ملاقات ہو تو فرمائیے گا کہ اسداللہ روسیاہ بعد سلام عرض کرتا ہے کہ وہ رتبہ میرا تو کہاں کہ میں آپ سے شکوہ کروں کہ مجھ سے مل کر آپ نہ گئے مگر ہاں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو خبر کیوں نہ ہوئی ورنہ میں تودیع کو پہنچتا۔

حضرت بہت دن سے منشی ہرگوپال صاحب کا خط نہیں آیا۔ خدا جانے سکندر آباد میں ہیں یا کہیں اور تشریف لے گئے ہیں۔ تماشا یہ ہے کہ بابو جانی بانکے لال صاحب کا خط بھی بہت دن سے نہیں آیا۔ کچھ ان کا حال معلوم نہیں۔ آپ کو ان دونو صاحبوں کا حال جو کچھ معلوم ہو مجھ کو لکھئے۔ منشی عبداللطیف اور میاں نصیر الدین اور بی زکیہ بیگم اور عبدالسلام کو دعا پہنچے۔

از اسداللہ نگاشتہ یکشنبہ سوم ستمبر ۱۸۵۳ء

[۲۹ ذیقعدہ ۱۲۶۹ھ]

بھائی صاحب! تمہارا خط آیا۔ اور حال جیت سنگھ کا معلوم ہوا۔ پھر وہ برہمن صاحب آئے۔ ان کی زبانی آپ کی خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ حق تعالےٰ تم کو معہ فرزندوں کے سلامت رکھے اور مجھ کو تمہاری ملاقات سے اور بچوں کے دیدار سے شاد کرے۔

بھائی میں وہ قسمت لایا ہوں کہ جو چاہوں وہ نہ ہو ؎

مرا مادر دعا کرد است گوئی

کہ از تو دور یا دا انچہ جوئی

ڈاک کے سفر کی خوشی۔ کول پہنچنے کی مسرت۔ بھائی سے ملنے کی فرحت فرزندوں کے دیکھنے کا لطف۔ راہ میں جابجا آم خریدنے کا ذوق۔ کیا کہوں کہ کیسی حسرت رہ گئی۔ تم کو معلوم ہے۔ روپیہ فتوح[۱] کا آیا ہوا تھا۔ چاہتا تھا کہ اس کو اس سفر میں خرچ کروں۔ یہاں یہ رنگ درپیش آیا۔ اب سنتا ہوں کہ حضور بعد محرم جشنِ غسلِ صحت کریں گے۔ عزم میرا بدستور۔ مگر روپیہ کہاں۔ بہرحال رخصت کے مانگنے کا موقعہ تو آئے۔ قرض وام کر کر بھی قصد کروں گا۔ اگر اس اثنا میں کوئی شعبدہ تازہ نہ اٹھا۔

منشی ہرگوبند سنگھ کول آئے ہیں۔ آپ سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا اور یہ فرمانا کہ آپ کا خط آیا۔ حال ظاہر ہوا۔ دعائیں مانگتا ہوں۔ کہ تمہارا گھر تم کو مل جائے۔ اور تم دلی میں آؤ۔

منشی ہرگوپال تفتہ[۲] بھرت پور میں اور جانی جی آگرے گئے ہوئے ہیں۔

لفٹنٹ گورنر بریلی میں مر گئے۔ دیکھئے اب ان کی جگہ کون مقرر ہوتا ہے۔

دیکھو۔ اس قوم کا کیا انتظام ہے۔ ہندوستان کا اگر کوئی اتنا بڑا امیر مرا ہوتا تو کیا انقلاب ہو جاتا۔ یہاں کسی کے کان پر جوں بھی نہیں پھرتی۔ کہ کیا ہوا اور کون مر گیا۔

منشی عبداللطیف صاحب کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ میاں اشرف علی[۳] کول سے آئے اور مجھ سے ملے۔ تمہاری بہت تعریف کرتے تھے۔ نصیر الدین اور زکیہ بیگم

وعبدالسلام وکلثوم بیگم کو دعا پہنچے۔

از اسد اللہ یکشنبہ دوم اکتوبر ۱۸۵۳ء

[۲۹ ذی الحجہ ۱۲۶۹ھ]

(۳۴)

بھائی صاحب!

یہ نئی طرز روش ہے کہ خط کی رسید تو نہیں لکھتے اور الٹا شکوہ کرتے ہو۔ ظاہرا یہ لطیفہ خیال میں آیا ہوگا ؎ کہ یاراں فراموش کردند عشق۔ اور یہ درج نہ ہو سکتا تھا بغیر شکایت کے۔

ناچار خط کے بھیجنے سے قطع نظر کی۔ ڈاک کتاب معہ رسید میرے پاس موجود ہے۔ روز یکشنبہ دوم اکتوبر ۱۸۵۳ء کو خط روانہ ہوا ہے۔ مزا اس میں یہ ہے کہ آپ کا خط یکشنبہ دوم اکتوبر کا لکھا ہوا ہے۔ تم خیال کرو۔ مجھ میں تم میں اکثر ایسا واقع ہوتا ہے کہ جس دن میں تم کو خط لکھتا ہوں۔ اسی دن تم مجھ کو خط لکھتے ہو۔

اگلی غزل پہلے تو میاں محمد حسین دہلوی لائے اور پھر آپ نے اپنے خط میں بھیجی۔ ایک شعر اس میں میرے انداز کا تھا۔ وہ میں نے آپ کو لکھ بھیجا تھا۔ اور باقی اور اشعار سب اچھے اور بے عیب اور ہموار۔ اگر جگہ اصلاح کی ہوتی تو میں کبھی چشم پوشی نہ کرتا۔ تم سے میرا یہ معاملہ نہیں ہے۔ کہ خوشامد کروں۔ تمہارا کلام میرا کلام۔ تمہارا ہنر میرا ہنر۔ تمہارا نقص میرا نقص۔ اب دیکھو اس غزل میں ایک شعر موقوف کر دیا گیا۔ اور مطلع میں اور ایک بیت میں تغیر الفاظ ہو گیا جن شعروں پر صاد ہے وہ بہت خوب ہیں۔ واہ واہ سبحان اللہ اور جن پر صاد نہیں وہ خوب ہیں بس۔

اجی پیر و مرشد! یہ نثر جس کو آپ نے خط تعبیر کیا ہے اور واقعی کہ وہ خط ہے۔ مگر مینا بازار کے برابر یا سہ نثر ظہوری کے برابر یا آدھی پنج آہنگ کے برابر۔ آپ اس کے

کاتب کا نام عنایت اللہ خاں لکھتے ہیں۔ کہیں سہو نہ ہوا ہو۔ عطاء اللہ خاں صاحب ایک بزرگ وہاں ہیں۔ شاید ان کی تحریر ہو۔ ؎ باید متاع نیکو از ہر دکاں کہ باشد۔

کیا کہنا ہے۔ بہت خوب ہے اور بہت پاکیزہ پھیلا وا کتنا اچھا ہے۔ مضامین کیسے بلند ہیں۔ ترکیب الفاظ کتنی درست ہے۔ میں آپ کا احسانمند اور شکر گزار ہوں کہ آپ کی عنایت سے یہ نظم و نثر میں نے دیکھی۔ میں حق گزار سخن اور ہوا خواہِ اہلِ سخن ہوں۔ جہاں اصلاح کی جگہ ہوتی ہے۔ وہاں فروگذاشت نہیں کرتا۔ معہذا فضول نہیں ہوں کلام بے عیب و بے سقم میں دخل نہیں کرتا۔ آپ یہ اوراق ان صاحب کو دیدیجئے۔ اور میرا سلام کہئے۔ اور یہ سطریں انھیں دکھلا دیجئے۔

بعد محرم سنا جاتا ہے کہ جشن غسل صحت ہوگا۔ بادشاہ اچھے ہیں۔ رہا ضعف وہ لازمہ عمر ہے۔ بہر تقدیر بعد عشرۂ محرم طالب رخصت ہوں گا۔ مگر موقع دیکھ کر اور تدبیر مصارف سفر کر کر۔ کل دن بھر تابش آفتاب اور گرمی ہوا ایسی رہی کہ جیسی جیٹھ اساڑھ میں ہوتی ہے۔ شام ہوتے ہوتے وہ سردی ہوگئی کہ اغنیا نے دوشالے توشہ خانہ میں سے نکلوائے۔ اور غربا نے گٹھڑیاں کھول کھول کر رضائی اور ٹٹو نکالے۔ ابر سیاہ تمام رات محیط آسمان پر رہا۔ مگر مینہ نہیں برسا۔ اب صبح ہوتے وہ پانی پڑا۔ کہ جل تھل بھر گئے قلعہ نہیں جا سکا۔ مینہ برس رہا ہے۔ اور میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اگر یہی عالم ہے تو آج اس خط کو نہیں بھیج سکوں گا۔ بڑے زور سے مینہ برس رہا ہے پنجشنبہ ۶ ماہ اکتوبر ۱۸۵۳ء

بچوں کو دُعا۔ پروردگار سب کو جیتا رکھے اور خوش رکھے اور مجھ کو ان کا دیدار دکھلادے۔ یہاں چنا، گیہوں، بیسن، بائیس سیر اور گھی دو سیر سوا دو سیر ہے۔ اُدھر کا حال آپ لکھئے کہ کیا ہے۔ یہاں منگل کو چاند دکھلائی دیا۔ بدھ کو محرم کی پہلی ٹھیری۔ آج دوسری ہے۔ وہاں کا حال مقرر لکھئے گا۔ فقط

۲ محرم [سنہ ۱۲۷۰ھ] پنجشنبہ ۶ ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۵۳ء

(۳۵)

بھائی صاحب!

یہ آپ کے دل میں کس نے شبہ ڈال دیا۔ کہ گریاں اور افشاں کو آپ نے ایطا تصوّر کیا۔ بات کو طول دیتا ہوں اور مفصّل لکھتا ہوں۔ سنئے صیغۂ امر کے بعد جو الف آتا ہے وہ افادہ معنی فاعلیت دیتا ہے۔ واں صیغۂ امر ہے دانستن میں سے اور یہ بھی یاد رہے کہ امر مضارع سے پیدا ہوتا ہے۔ اور قاعدہ اس کا گرا دینا ہے دال کا۔ اور یہ کلّیہ ہے۔ رود، رو۔ شود، شو۔ آرد، آر۔ گوید، گوے۔ پس دال کے آگے الف آیا، دانا ہوگیا۔ رو کے آگے الف آیا، روا ہوگیا۔ گوے کے آگے الف آیا، گویا دیدن کا مضارع بیند۔ امر میں الف کے آنے پر بینا۔ روا یعنی رونده۔ گویا یعنی گوینده دانا یعنی داننده۔ بینا یعنی بیننده۔ یہ سب ایطا ہے۔ یعنی یہ الف سب ایک قسم کے ہیں یا الف نون جمع کا۔ جیسے خوباں۔ اور بتاں، نیکاں اور بداں۔ یہ سب ایطا ہے۔ یعنی الف نون سب ایک قسم کے ہیں۔ اسی طرح ایک الف نون حالیہ ہے کہ وہ بھی امر کے صیغے کے آگے آتا ہے۔ خندیدن مصدر۔ خندد مضارع۔ خند امر۔ گریستن مصدر گرید مضارع۔ گری امر۔ افتادن مصدر۔ افتد مضارع۔ افت امر۔ خاستن مصدر۔ خیزد مضارع۔ خیز امر۔ خنداں۔ گریاں افتاں۔ خیزاں یہ سب الفِ نونِ حالیہ ہیں۔ اور ایطا ہیں۔ اب دیکھا چاہئے کہ افشاں کیا لفظ ہے۔ افش امر اور الف نونِ حالیہ نہیں ہے۔ افش کوئی لغتِ جامد بھی نہیں۔ افشاندن مصدر۔ افشاند ماضی۔ افشاند مضارع افشاں امر۔ پس یہ الف نون اصلی ہے۔ مثل پریشاں اور حیراں اور ایماں اور نہاں کے۔ اگر یہ الف نون حالیہ کے ساتھ قافیہ ہو۔ تو کس کی مجال ہے۔ کہ اس کو ایطا کہے۔ مگر وہ کہ جو قواعد کلیہ اور اکثریہ اور بعضیہ فارسی زبان کی نہ جانتا ہو۔

پیر و مرشد! عید کو بادشاہ ماندے ہوئے۔ جو کچھ کہا تھا وہ رہنے دیا کہ کبھی پھر

کام آئے گا۔ بکرید کو کچھ کہا ہی نہیں۔ ایک رباعی پڑھ دی تھی جشن غسلِ صحت۔ اس کا کچھ پتہ نہیں سنتے ہیں۔ کہ ہوگا۔ قصیدہ کہہ رکھا ہے۔ اگر ہوا تو پڑھ دوں گا اور وہ سراج الاخبار میں چھاپا جائے گا۔ اور آپ کی بھی نظر سے گزرے گا۔ بلکہ قصد یہ ہے کہ اسی محفل میں باندے کے جانے کی رخصت بھی لے لوں۔ تو اس صورت میں یقین ہے کہ بعد اس قصیدے کے میں بھی آپ کی نظر سے گزر جاؤں۔

بیگم کا حال معلوم ہوا۔ بھائی یہ لڑکی ضعیف البنیان ہے۔ حق تعالےٰ اس پر اپنا فضل رکھے۔ تم بھی پڑھنے کی اس پر شدت نہ کیا کرو۔ تمہاری کم فرصتی کا حال مجھ کو معلوم ہے۔ بہت بڑا مقدمہ ہے۔ یہ فیصل ہوتے ہی ہوگا۔

ٹامس[1] مٹکاف صاحب ایجنٹ و کمشنر دہلی مر گئے۔ ہم لوگوں کے جاننے والے ایک یہی صاحب رہ گئے تھے۔ جنازہ ان کا اس دھوم سے اٹھا تھا کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ کشمیری دروازے سے ان کی کوٹھی تک لاکھ آدمی کی بھیڑ تھی۔ سکندر صاحب کی گرجا گھر میں فریزر[2] صاحب کے پاس ان کو رکھا ہے۔

منشی عبداللطیف صاحب کو اور کیہ بیگم کو اور میاں نصیرالدین کو اور جو لڑکے بالے یہاں ہیں ان کو دعا پہنچے۔

[۵ صفر ۱۲۷۰ھ] از اسداللہ دوشنبہ ہفتم نومبر ۱۸۵۳ء

(۳۶)

بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی۔ مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں۔ اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی

آج یکبار مر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

از اسد اللہ نگاشتہ پنجشنبہ ۲۰ ربیع الاول [سنہ ۱۲۷۰ھ] و ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۵۳ء

(۳۷)

بھائی جان!

تمہارا وہ خط کہ جو شیخ رحمت اللہ[1] صاحب کے ذریعے کے خط کے جواب میں تھا پہنچا۔ تفقد ان کے حال پر مبذول رہے۔

یہاں چیچک کا زور شور نہیں۔ بلکہ ان دنوں میں اس کا کہیں مذکور نہیں۔ کول میں اطفال خورد سال کی خیر رہے۔ زکیہ و عبدالسلام کا ہنوز آگرے میں رہنا مناسب ہے۔ یہ ہنگامہ جہاں ہوتا ہے چند روزہ ہوتا ہے۔ جب یہ وبائے خاص جاتی رہی۔ اور ہوا صاف ہو جاوے۔ تب آویں۔

وہ مثنوی[2] اور اعلام نامہ میں نے تمہارے پاس بھجوایا ہے۔ وجہ یہ کہ جب حضور نے حکم دیا۔ کہ عائدِ اہلِ سنن جو اطراف و جوانب دہلی میں ہیں۔ ایک ایک نقل ان کو بھیجی جائے۔ میں نے دفتر میں بقید علیگڈھ کول مفتی صدرالدین خاں صاحب کا اور تمہارا نام لکھوا دیا۔ اور کالپی میں نواب[3] انوار الدولہ اور بریلی میں سید احمد[4] کا نام لکھوا دیا۔ اور کوئی ایسا سنی گرانمایہ میرے ہاتھ نہ آیا۔

مرزا نجف علی خاں مرحوم تمہارے دوست ہوں گے۔ وہ یہاں مر گئے۔ ان کے فرزند ارجمند میرزا یوسف علی خاں کو میں اپنے فرزند کی جگہ جانتا ہوں اور انکی سعادتمندیاں اور خوبیاں کیا بیان کروں کہ میں ان کا عاشق ہوں۔ وہ اب کول کو گئے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ ان کے ہاں جاؤ اور فاتحہ پڑھو اور ان کا حال ان کی زبانی سنو۔ وہ صاحبزادۂ ناز پروردہ گرم و سرد زمانہ نہ دیدہ ہیں۔ دو ایک حویلیاں ان کے والد ماجد کی وہاں ہیں۔ خدا جانے وہ کیا کریں گے۔ آپ کو ان کی مربی گیری کرنی چاہئے مگر وہ

پنجشنبہ کو روانہ ہونے والے ہیں آج دوشنبہ کو یہ خط میں تم کو بھیجتا ہوں یقین ہے کہ کل پہنچیگا۔ بمجرد اس کے پہنچنے کے آپ ان سے ملیے گا۔ ماتم زدہ کا بلانا مناسب نہیں۔ آپکو بتقریب تعزیت جانا چاہیئے۔ اور یہ جو خط آپ کے نام کا ہے ان کو پڑھا دیجئے۔

مولوی عبداللطیف کی خدمت میں میری طرف سے یہ شعر مولانا شرف الدین مصنف "نامۂ حق" کا پڑھ دیجیگا ؎

در طلب کردنِ حقیقتِ کار ❊ از خدا شرم دار و شرم مدار

از اسد اللہ رقم زدہ و رواں داشتہ چاشت گاہِ دوشنبہ

[۲۳ ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ] ۲۳ جنوری ۱۸۵۴ء ضروری جواب طلب

(۳۸)

بھائی صاحب! میں نہیں جانتا تھا کہ تم کہاں ہو۔ تنہا میاں عبداللطیف کو علیگڈھ میں سمجھا ہوا تھا۔ کل منشی ہرگوپال صاحب کا خط آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ بھی یہیں ہیں۔ بارے کہئے کہ زکیہ و عبدالسلام کب آئیں گے۔ مجھ سے تو وہ اگر کول میں ہوں تو بھی دور ہیں۔ مگر تمہارے واسطے پوچھتا ہوں کہ ان کی دوری تم پر شاق ہے۔

لو حضرت یہاں بھی چیچک کا زور شروع ہوا۔ بارے یہ خدا کا فضل ہے کہ انجام بخیر ہے جس زمانے میں آپ نے لکھا تھا کہ کول میں شدت ہے۔ اس زمانے میں یہاں کچھ ذکر نہ تھا۔ اب ہنگامہ گرم ہے۔ ظاہرا کول کی راہ سے تشریف لائی ہیں۔ بہرحال آپ بچوں کی خیر و عافیت اور ان کے آنے کا حال کہ آگئے اور اگر نہیں آئے تو کب آئیں گے مفصل لکھ بھیجئے گا۔ منشی عبداللطیف صاحب کو دعا پہنچے۔

[بروز پنجشنبہ مطابق ۲۵ جمادی الاول ۱۲۷۰ھ] اسد ۲۳ فروری ۱۸۵۴ء

(۳۹)

بھائی صاحب! آپکا خط آیا۔ حال لڑکے بالوں کا اور تمہارا معلوم ہوا حق تعالیٰ

تم کو اور ان سب کو سلامت رکھے۔ یہ کا فراحتراق کی بیماری جس رنگ سے ظہور کرے زائل ہونا نہیں جانتی۔ تخفیف اس میں بمنزلۂ صحت ہے مجھ کو دیکھو۔ اگرچہ میرے تمہارے حالات متفاوت ہیں لیکن اصل مرض ایک ہے۔ اب کے میرے ہاں اس کا ظہور بصورت تپ ولرزہ کے ہوا۔ آٹھ دن غذا نہ کھائی۔ اب اگرچہ تپ نہ رہی۔ لیکن اور عوارض پیدا ہو گئے چنانچہ کل پانچواں مسہل تھا اور کل پھر ہوگا۔

مرزا تفتہ سے عند الملاقات کہدینا کہ یہ اوراق اشعار جو تیسری بار آئے ہیں۔ ہنوز ان کے دیکھنے کی فرصت نہیں ہوئی۔

ثناءاللہ خاں ثنا فتحپوری مسجد کے ایک حجرے میں مع اپنے فرزند کے رہتے ہیں احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر سے ان کو ملوا دیا۔ آج پانچواں دن ہے کہ جناب حکیم صاحب میرے دیکھنے کو آئے تھے۔ ثناءاللہ خاں مع قصیدے کے موجود تھے۔ ان سے قصیدہ پڑھوا دیا۔ دوسرے دن وہ ان کے گھر گئے۔ انھوں نے پانچ روپیہ ان کو دئے پھر ان کو مع قصیدے کے بھائی ضیاء الدین خاں جو چھوٹے بیٹے نواب احمد بخش خاں کے ہیں انکے پاس بھیجا۔ پانچ روپیہ انھوں نے دئے۔ یہ دہا کا ان کو وصول ہو گیا ہے۔ کل ثناءاللہ خاں میرے پاس نہیں آئے۔ آج شاید آئیں۔ اب وہ چھوٹم نامی ایک رنڈی ہے۔ مہاراج ہندوراؤ کی نوکر ہے۔ اس کو وہ اپنا شاگرد بتاتے ہیں اس سے رخصت ہونے کی فکر میں ہیں جب وہ ان کو کچھ دے گی۔ تب وہ کول کو تمہارے پاس روانہ ہوں گے۔

منشی عبداللطیف کو آیا میری دعا کہتے ہو یا نہیں۔ میں ان کی نثر کے دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ باقی اور سب لڑکے بالوں کو خصوصاً بیگم کو دعا پہنچے۔ بھائی عورتوں کے واسطے اتنا کافی ہے کہ حرف شناس ہو جائیں۔ اور قرآن شریف ناظرہ پڑھ لیا کریں۔ آگے پڑھنے کے واسطے شدت نہ کیا کرو۔

[۲۷ جمادی الآخر ۱۲۷۰ھ] اسد اللہ دوشنبہ ۲۷ مارچ ۱۸۵۴ء

(۴۰)

بھائی صاحب! الحمدللہ کہ اور تو سب طرح خیر و عافیت ہے مگر گرمی کی وہ شدّت ہے کہ عیاذاً باللہ میں آپ احتراق کا مارا۔ دوسرے یہ مصیبت۔ ایک وقت کا کھانا کھانے والا۔ سو وہ اب موقوف۔ غذا منحصر دہی پر ہے۔ کہاں تک دہی کھاؤں۔ کیا کروں۔ اگرچہ تاب مجھ میں روزہ رکھنے کی کہاں۔ مگر بدتر روزہ داروں سے ہوں۔ روزہ داروں کو کیا کہوں کیا حال ہے۔ میرے چار خدمت گزار ہیں۔ چاروں روزہ دار۔ آخر روز مجھکو یوں نظر آتا ہے۔ کہ چار مردے پھر رہے ہیں۔ یہ پریشانی اور یہ بے سامانی۔ نہ خس خانہ نہ برف آب ۔

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
روزہ میرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خسخانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

افطارِ صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

یہ رباعی اور یہ قطعہ کل حضور میں پڑھا تھا۔ بہت ہنسے اور خوش ہوئے۔

احتراق میں مر رہا ہوں۔ مگر آموں کو تک رہا ہوں کہ کب نکلیں۔ بنگالہ میں یقین ہے کہ آم چل نکلے ہوں گے۔ دو برس کلکتے میں رہا ہوں۔ جون کے مہینے میں آم بکتے ہیں۔ دن تین ایک ہوئے ایک میوہ فروش پانچ آم لایا تھا۔ مزہ نہ تھا۔ لُو کے پکے ہوئے تھے۔

بھلا یہ تو سب باتیں ہو لیں۔ مگر انگریزی ڈاک کا حال کہئے نہیں معلوم کیا

بندوبست جدید ہوا ہے کہ بالکل ڈاک کا انتظام و اعتماد جاتا رہا ۔۔ ایک دو خط انگریزی ایک فرنگی کے تلف ہو گئے۔ اس نے یہاں کی ڈاک میں گفتگو کی۔ کوئی اس کا مجیب نہ ہوا۔ اس نے بڑے پوسٹ ماسٹر سے شکایت کی۔ جواب پایا کہ کچھ جواب نہ پاؤ گے تم نے دیا۔ ہم نے بھیج دیا۔ اب پہنچے یا نہ پہنچے۔ میرٹھ سے بھی فریاد آئی ہے۔ آگرے کے خطوں سے بھی سنا جاتا ہے۔ اگرچہ میرا کوئی خط اب تک تلف نہیں ہوا ہے مگر وبائے عام میں بچاؤ کہاں۔ ناچار میں نے یہ قاعدہ قرار دیا ہے کہ آگرے میں میجر جان جاکوب صاحب اور کول میں تم اور باندہ میں ایک میرا ماموں کا بیٹا بھائی ہے سو اور دو ایک دوست اضلاع متفرقہ میں ان کو لکھ بھیجا ہے۔ کہ وہ مجھ کو اور میں ان کو خط بیرنگ بھیجا کروں۔ بھائی حساب برابر ہے مگر اس صورت میں خاطر جمع رہتی ہے۔ اب اگر تمہارا خط پوسٹ پیڈ آئے گا تو میں آزردہ ہونگا۔ بیرنگ بھیجا کرو۔ اور منشی ہرگوپال کو بھی سمجھا دو۔ بلکہ یہ تحریر دکھا دو۔ بہت پوسٹ پیڈ خط ضائع ہوتے ہیں۔ بیرنگ پر اعتماد ہے۔

لڑکے بالوں کو دعا پہنچے۔ بہت دن ہوئے کہ خیر و عافیت نہیں سنی سب کا حال لکھو۔ خصوصًا بیگم کی خیریت۔ حسین علی کورنش عرض کرتا ہے۔

اسد اللہ

[۸ رمضان ۱۲۷۰ھ بروز یکشنبہ] جمعہ ۲ جون ۱۸۵۴ء

(۱۴)

بھائی صاحب! کیا کہوں کہ کتنا ہنسا ہوں تمہاری اس بات پر کہ تو قطعہ یا رباعی کہہ کہ الگ ہو گیا اور مجھ کو تیس روزے رکھنے پڑے۔ گویا الگ الگ مجھ پر اور تم پہ روزے فرض نہ تھے۔ بلکہ ایک کام بہ شراکت مجھ کو اور تم کو سپرد ہوا تھا۔ اس میں میں نے تو کچھ نہ کیا اور اپنے حصے اور میرے حصے کا کام صرف تم نے کیا۔ خدا حضرت کو سلامت رکھے۔

بھائیصاحب! میں نہ سمجھا کہ زکیہ بیگم عم بتیسا لون کا سیپارہ پڑھ چکی یا حفظ کر چکی۔ اللہ اکبر اگر حفظ کیا ہے تو بڑا کام کیا ہے اور بہت بڑا کام کرے اگر تیسوں سپارے حفظ کرے۔ بارے یہ تو کہو۔ کہ تم نے تو اس کو پڑھتے سُنا ہوگا حرف شناس ہو گئی ہے۔ اور مفردات نکال کر آپ اُن کو پیوند دے لیتی ہے۔ یا یونہی طوطے کی طرح حق اللہ پاک ذات اللہ پڑھتی ہے۔

منشی عبد اللطیف اور ہمارے شیخ اکرام الدین اور شیخ نصیر الدین اور کلثوم بیگم اور بی حافظہ بیگم جن کا ذکر ہو چکا ہے سب کو دعا پہنچے اور سب بخیر و خوبی سلامت رہیں۔

دل کڑھتا ہے مرزا حسن علی بیگ رسالدار کے حال پر۔ بی بی نے انکی پانچ چھ ہزار روپیہ نقد و جنس تباہ کر دیا۔ روپیہ کیا گویا گھر خاک میں ملا دیا۔ اب وہ غریب کیا کرے میرے پاس دو تین بار آئے۔ ایک دن تنہائی میں اپنا حال کہا۔ میں دیکھتا تھا کہ اس شخص کو اب رونا آتا ہے۔ سچ ہے ؎

زنِ بد در سرائے مردِ نکو

ہم دریں عالم است دوزخ او

یہاں دلّی میں ایک اصطلاح نئے نواب کی۔ اور یہ لفظ عام ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان اس پر صادق آجاتا ہے۔ صورت یہ کہ جہاں کوئی شخص مرا، بشرطِ آنکہ دولتمند ہو، اس کا بیٹا مال پر متصرف ہوا۔ بدمعاش لوگ فراہم ہوئے اور اس کو خداوند نعمت اور جناب عالی کہنا شروع کیا۔ فلانی رنڈی آپ پر مرتی ہے۔ فلانا امیر اپنی مجلس میں آپ کی یوں تعریف کر رہا تھا۔ آپ کو لازم ہے اس رنڈی کا بلانا اور اس امیر کی دعوت کرنی۔ دنیا اسی واسطے ہے۔ روپیہ ساتھ نہیں جاتا۔ آپ کے باوا کیا لے گئے جو آپ لے جائیں گے۔ غرض کہ بندہ آج تک تین نئے نواب دیکھ چکا ہے۔ ایک تو کھتری ٹوڈرمل لاکھ روپیہ کا آدمی تھا۔ پانچ سات برس میں سب کچھ کھو کر شہر سے نکل گیا اور مفقود الخبر ہو گیا۔ دوسرا ایک پنجابی لڑکا سعادت نام۔ پچاس چالیس ہزار روپیہ کھو کر تباہ ہو گیا۔ تیسرا خان محمد نام۔ سعد اللہ خاں

کا بیٹا - کہ وہ بھی بیس پچیس ہزار روپیہ لٹا کر اور بھیوں پر چڑھ کر اب جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ غرضکہ مردوں کو نئے نواب بنتے سنا تھا - عورتوں میں اس نیک بخت کو دیکھا - اصل اسکی یہ ہے ایک خانگی ہے مکارہ اور عیارہ - اب بڑھاپے میں اس نے میرے حقیقی سالے یعنی زین العابدین خاں مرحوم کے ماموں کو دام میں لا کر ان کے گھر میں بیٹھی ہے - اور نیکبخت بہو بیٹیوں کو لوٹتی پھرتی ہے - اسی نے رسالدار کی بی بی سے مل کر اس کو نیا نواب بنایا اور سارا گھر لٹوایا - چنانچہ رسالدار کی زبانی آپ کو مفصل معلوم ہوگا - بے چارے نے ہر چند چاہا کہ یہ میرے ساتھ چلے ہر گز نہ گئی ؎

در کنج دماغم مطلب جائے نصیحت

کایں حجرہ پر از زمزمۂ چنگ و رباب است

اب یہ تنہا آپ کے پاس آتے ہیں - ان کی رام کہانی ان کی زبانی سنئے گا -

حسین علی آپ کو بندگی اور اپنے بہن بھائیوں کو علیٰ قدر مراتب سلام بندگی کہتا ہے - ا ب ج ح خ پڑھتا ہے - خدا میری شرم رکھ لے اور اس میں کوئی اس طرح کا قصور نہ رہ جائے جو لوگ مجھ کو نام رکھیں کہ کیا بری طرح پرورش کی۔

از اسد اللہ نگاشتہ دوشنبہ ۲۲ رمضان ۱۲۷۰ھ و ۱۸ جون ۱۸۵۴ء

لو صاحب اب کے جمعہ کو الوداع اور اگلے منگل یا بدھ کو عید ہوگی۔

(۸۲)

بھائی صاحب! یہ جو آپ نے لکھا کہ تیرے وہ اشعار سنے جاتے ہیں کہ جو کبھی نہیں سنے تھے - حال یہ ہے کہ میں نے ان دنوں میں دو غزلیں لکھی ہیں - ایک تو دریا نہ ہوا صحرا نہ ہوا - سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا - دوسری غزل رواں کیوں ہو اور گماں کیوں ہو - وہ اب بھیجتا ہوں - ان دو غزلوں کے علاوہ حال میں کوئی غزل

نہیں کہی۔ پس اگر اس کے سوا کوئی کچھ آپ کے سامنے پڑھے تو وہ یا میرا کلام نہ ہوگا یا سابق کی کوئی ایسی غزل ہوگی کہ وہ آگے آپ نے نہ سنی ہوگی۔

بندہ پرور! پندرہ روزوں کا اجر جو آپ نے مجھ کو دیا وہ فوراً میں نے الٹا پھیر دیا۔ میرے کس کام کا۔ نہ آم ہیں کہ کھاؤں نہ شربت ہے کہ پیوں۔

بھائی! اب کے تہنیت عید میں دو قصیدے کس انداز کے لکھے ہیں۔ کہ دیکھو گے تو حظ اٹھاؤ گے۔ پرسوں یا اترسوں روانہ کروں گا۔ ہرگوپال صاحب کو بھی دکھا دیجئے گا۔ رسالہ دار کے گھر کے باب میں جو کچھ تم نے کہا۔ وہ مطابق واقعہ نہیں ہے۔ یعنی اس نیک بخت نے ضد سے یہ کام نہیں کیا ؎ ایں حکایت را بیانے دیگر است۔ ایک زن مردافگن بدروش بدفن نے اس کو لوٹا کھایا۔ مہمانداری ہر روزہ وگل و میوہ و نقش و نگار۔ رنگ و بو۔ یہ عیاشی و بدمعاشی ہے۔ نہ آزردگی و دل آزاری۔

میں اپنے بچوں کو پیار کرتا ہوں۔ اور دعائیں دیتا ہوں۔ حسین علی تم کو بندگی اور بڑے بھائی منشی عبداللطیف کو آداب اور بہنوں کو سلام اور بھتیجا بھتیجی کو اس راہ سے کہ وہ عمر میں اور رشتہ میں چھوٹے ہیں۔ دعا کہتا ہے ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

قطعہ:
افطارِ صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانیکو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

(۲۴)

بھائی صاحب!

قصیدہ مدحیہ حضرت ولیعہد بہادر میں شین کی ضمیر مطلع سے لے کر دور تک

بطرف معشوق کے راجع ہے ۔

زہے بتانِ مغاں شیوہ دادخواہانش
زدست ہائے حنا بستہ گل بدامانش

زہے کا مورد مذکور نہیں یعنی معشوق ۔ شاعر کہتا ہے واہ عجب معشوق ہو کہ بتانِ مغاں شیوہ دادخواہ اس کے ہیں ۔ مغاں شیوہ صفت ہے بتاں کی میرے معشوق کے دادخواہ ہیں ایسے معشوق کہ جو مغاں شیوہ ہیں ۔ اور مغوں کی جہاں اور روشیں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ہاتھوں میں مہندی لگائے رہتے ہیں ۔ اور معشوقوں کے ہاتھ بھی حنائی ہوتے ہیں ۔ اور دادخواہ کا کام دامن پکڑنا ہے ۔ جب معشوق اس کے دامن گیر ہوئے اور ہاتھ ان کے حنائی ہیں ۔ تو گویا وہ دستہائے رنگین پھول ہیں ۔ اس کے دامن میں الی حاصل اس بیت تک سے گہے زہر بدل جاگزیدہ پیکانش ۔

شین کی ضمیر بطرف معشوق راجع ہے ۔ باقی اور اشعار میں اور طرف ہے کہ قرینہ اس پر دال ہے ۔

تم کس ریختے کو نیا سمجھتے ہو ۔ کہا کئے اور رہوا کئے ۔ یہ غزل پرانی ہے ۔ دریا میرے آگے ۔ صحرا میرے آگے ۔ اس پر بھی ایک سال گذر چکا ہے ۔ قلعہ مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے ۔ ۵

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

[جولائی ۱۸۵۴ء]

(۴۴)

بھائی صاحب! آپ کے عنایت نامے سے بھابی صاحبہ کے مزاج کی ناسازی اور بچوں کی ناخوشی معلوم ہوئی۔ پروردگار سب کو اپنی امان میں رکھے۔ دن برے ہیں۔ یہاں بھی تپ کا مرض عام ہے۔ مگر انجام بخیر ہے۔ یہ سب خوبیاں مینہ نہ برسنے کی ہیں۔ خدا سے دعا مانگتا ہوں اور آپ سے چاہتا ہوں کہ اب جلد آپ سب کی خیر و عافیت لکھیں۔

مرزا یوسف علی خاں اگر ابھی وہاں سے نہ چلے ہوں۔ تو ان کو میری دعا کہنا۔ اور یہ کہنا کہ میاں تمہارا خط آیا۔ تمہارے سب دوستوں کو سلام کہدیا۔ وہ سب سلام کہتے ہیں۔ اب تم منشی صاحب پر سب امور حوالہ کر کر چلے آؤ۔ درنگ نہ کرو۔

غزل دیکھی۔ بھائی صاحب۔ ان زمینوں میں مضامینِ عاشقانہ کی گنجائش کہاں۔ موافق اس زمین کے اشعار مربوط ہیں۔

منشی عبداللطیف اور ان کے فرزند بیگم اور اس کی ہمجولیوں کو دعا۔

[۱۶ ذیقعد ۱۲۷۰ھ] از اسداللہ روز جمعہ ۱۱ دہم اگست ۱۸۵۴ء

(۴۵)

بھائی صاحب!۔

پرسوں شام کو مرزا یوسف علی خاں شہر میں پہنچے۔ اور کل میرے پاس آئے۔ بیگم کی پردہ نشینی اور گھر میں بہت لوگوں کی بیماری اور پھر تمہاری ان کے حال پر عنائتیں۔ اور شام کی صحبتوں میں سخنوروں کی حکائتیں سب بیان کیں۔ حیران ہوں کہ مینہ ہر طرف خوب برس رہا ہے پھر بیماری کا شیوع کیوں ہے۔ یہاں بھی اکثر لوگ تپ میں مبتلا ہیں۔

حق تعالیٰ انجام بخیر کرے۔ اور اپنے بندوں پر رحم فرمائے۔

اگلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ مریضوں کی صحت کی خبر جلد لکھئے گا۔ ظاہرا اب تک کچھ نہ کچھ قصہ چلا آتا ہے کہ آپ کا عنایت نامہ اب تک نہیں آیا۔

حکیم الٰہی بخش سکندر آبادی آپ کے پاس پہنچے ہیں۔ بہت نیک بخت اور معقول آدمی ہیں۔ ان کی پرورش کا خیال رہے۔ اور شیخ رحمت اللہ صاحب جو آگئے آپ کی بدولت کامیاب ہو چکے ہیں۔ اگر وہاں ہوں تو ان کا بھی آپ کو خیال رہے۔ اور میرا سلام کہدیجئے۔ اور اگر وہاں نہ ہوں تو ان کا حال مجھکو لکھئے۔

مرزا یوسف علی خاں کہتے تھے کہ آپ اس قصیدے کے طالب ہیں جو بطریق مرثیہ لکھا گیا ہے اور اس میں شاہ اودھ کی مدح بھی مندرج ہے۔ اگر ہاتھ آگیا تو چھاپے کا ورنہ قلمی بھیجدوں گا۔ بادشاہ اودھ تک پہنچ گیا ہے۔ اگر کچھ ظہور میں آیا تو وہ بھی تم کو لکھوں گا۔

بیگم کو دعا پہنچے۔ کیوں بھئی اب ہم کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں۔ بھائی خدا کے واسطے سب کی خیر و عافیت جلد لکھو۔ منشی ہرگوپال کے خط سے اتنا معلوم ہوا کہ میاں عبداللطیف کے گھر میں اچھی طرح ہیں اور ونکا حال نہیں معلوم ہوا۔

[۲۱ ذیقعد ۱۲۷۰ھ] والسلام مع الاکرام۔ از اسداللہ سہ شنبہ ۱۵ ماہ اگست ۱۸۵۴ء

(۴۶)

بھائی صاحب کو بندگی پہنچے۔ یہاں کی عید کا ماجرا عرض کروں گا۔ پہلے یہ تو پوچھئے کہ یہاں کول کا کیا واقعہ مشہور ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ہر انجمن میں یہی ذکر رہا کہ کول میں بڑی خانہ جنگی ہوئی۔ اور ہندو مسلمانوں میں تلوار چلی۔ دس بیس آدمی طرفین کے مارے گئے۔ میں چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ اس عرصہ میں تمہارا خط آگیا۔ اور حال معلوم ہوا۔ میں جانتا ہوں ایسا ہی مشہور ہوگا کہ دلّی میں تلوار چلی۔ سو حضرت

نہ تلوار چلی۔ نہ خانہ جنگی ہوئی۔ دو دن ہندو دکانداروں نے دکانیں بند کر دی تھیں۔ سو صاحب مجسٹریٹ بہادر اور کوتوال نے سارے شہر کا گشت کیا۔ بملاطفت و ملائمت و بتاکید و تہدید دکانیں کھلوائیں۔ بکریاں بھی قربان ہوئیں۔ گائیں بھی۔

میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلد اس تاریخ کا تمام کر کر وہ نذر کیا۔

اس کا حال سنئے کہ وہ صورت جو پہلے تھی وہ نہیں رہی۔ آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا۔ اب شروع تحریر آفرینش عالم و ظہور آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام پرتوستان رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک۔ اس کا نام مہر نیم روز رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والی عصر تک۔ اس کا نام ماہ نیم ماہ۔ سو وہ مہر نیم روز تمام ہوا اور نذر حضور کیا۔ اب اگر زیست وفا کرے گی تو ماہ نیم ماہ لکھا جائیگا۔ توقیع خوشنودی مجھ کو مل گیا یعنی شقہ مشتمل تحسین و اظہار عنایت پر۔ اسی کو خلعت فاخرہ اور جاگیر تصور کرتا ہوں مجھ میں کہیں جانے کا دم نہیں۔ اگر بادشاہ کا توسل نہ ہوتا۔ تو بھی یہیں پڑا رہتا۔ پس میں اس کو غنیمت جانتا ہوں۔ میرا قدرداں کون کہ میں اس پر ناز کروں۔ بقول ڈوم کے جو سمجھے وہ ہمارا غلام جو نہ سمجھے ہم اس کے غلام ؎

زندگی بر گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
چار باید زیستن ناچار باید زیستن

ہاں صاحب۔ یوسف علی خاں نے لکھنو والے قصیدہ کا چھاپا جہان خاں کی معرفت تم کو بھیجا ہے۔ نہیں جانتا جہاں خاں کون ہے۔ یوسف علی خاں کی زبانی لکھتا ہوں۔ پس اگر پہنچ گیا تو خیر۔ ورنہ تم جہان خاں سے مانگ لو۔

صاحب یہاں ایک تپ پھیلی ہے کہ کوئی گھر نہ ہوگا جس کے آدھے آدمی

تپ میں مبتلا نہ ہوں۔ باری کی تپ نوبتہ۔ کلو داروغہ۔ اس کی ماں۔ مداری کی گھر والی؛ اسکے بچے سب بیمار۔ تمہاری بھابی یعنی میری بی بی اور حسین علی خاں کی پالنے والی کہ وہ گھر کی مدار المہام ہے۔ بیمار۔ مزا یہ کہ ان دونوں کا روز نوبت ایک ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ حسین علی اچھا ہے۔ آپ کو بندگی کہتا ہے اور اپنی بہن کو سلام اور اپنی چچی کو آداب۔ میں اب سے بیگم کو زکیہ یا بیگم نہ کہوں گا۔ اب میں اس کو حافظ جی لکھا کروں گا۔ حافظ جی کو میری دعا پہنچے۔ اور منشی عبد اللطیف کو اور ان کے بچوں کو دعا۔ والسلام۔ اسد اللہ

[۲۳ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ] جمعہ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء

(۴۷)

بھائی صاحب!

جی چاہتا ہے باتیں کرنے کو۔ حق تعالیٰ عبد السلام کی ماں کو شفا دے۔ اور اسکے بچوں پر رحم کرے۔ یہ جو تپ اور کھانسی مزمن ہو جاتی ہے تو یہ بیماری نہیں ہے روگ ہے اس طرح کے مریض برسوں جیتے ہیں اور اگر قسمت میں ہوتا ہے تو اچھے بھی ہو جاتے ہیں۔ کلثوم کو ماں کا دودھ نہ پلواؤ۔ دائی رکھ لو۔ مریضہ کو بھی افاقت رہے گی۔ اور لڑکی بھی راحت پائے گی۔

مجھ کو دیکھو۔ غم نہ داری بز بخر۔ کہاں زین العابدین اور اس کی بیوی مرے اور دو بچے چھوڑ جائے اور ان میں سے ایک میں لے لوں۔ مختصر کہتا ہوں۔ آج تیرھواں دن ہے کہ حسین علی نے آنکھ نہیں کھولی۔ دن رات تپ اور غفلت اور بے خودی۔ کل بارھویں دن مسہل دیا تھا۔ چار دست آئے۔ مدار دو چار بار دوا اور ایک دو بار آش جو پر ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ دادی اس کی بیمار۔ روز دوپہر کو لرزہ چڑھتا ہے۔ آخر روز فرصت ہو جاتی ہے۔ ظہر قضا اور عصر وقت پر پڑھ لیتی ہے۔ تماشا یہ کہ تاریخ دونوں کے تپ کی ایک ہے۔ بھائی بی بی کی تو اتنی فکر نہیں لیکن حسین علی کی بیماری نے مار ڈالا۔

میں اس کو بہت چاہتا ہوں خدا اس کو بچالے اور میں اس کو دنیا میں چھوڑ جاؤں۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ میں نے آگے تم کو نہیں لکھا۔ یہاں بڑی بیماری پھیل رہی ہے۔ اور کوئی بیماری تپیں ہیں رنگارنگ بیشتر باری کی یعنی اگر گھر میں دس آدمی ہیں تو چھ بیمار ہوں گے اور چار تندرست اور ان چھ میں سے تین اچھے ہو جائیں گے۔ تو وہ چار بیمار ہوں گے۔ آج تک انجام بخیر تھا۔ اب لوگ مرنے لگے۔ ہوا میں سمیت پیدا ہو گئی۔ یہ قصے تو یوں رہے ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہ ڈاک کا سررشتہ کیسا بگڑا۔ میں نے اپنے نزدیک از روئے احتیاط بیرنگ خط بھیجنا اختیار کیا تھا۔ گو بمقتضائے وہم ہو خط جب ڈاک گھر میں جاتا تھا۔ رسید ملتی تھی۔ پوسٹ پیڈ کی لال مہر۔ بیرنگ کی سیاہ مہر۔ خاطر جمع ہو جاتی تھی۔ ڈاک کتاب کو دیکھ کر یاد آجاتا تھا کہ فلانا خط کس دن بھیجا ہے اور کس طرح بھیجا ہے۔ اب ڈاک گھر میں ایک صندوق منہ کھلا ہوا دھر دیا ہے جو جائے خط کو اس میں پھینکے اور چلا آئے۔ نہ رسید نہ مہر۔ نہ مشاہدہ۔ خدا جانے وہ خط روانہ ہو گا یا نہ ہو گا۔ اگر روانہ بھی ہوا تو وہاں پہنچ کر ڈاک کے ہرکارے کو نہ انعام کا لالچ نہ سرکار کو محصول کی طمع۔ نہ دیا ہرکارے کو یا دیا۔ ہرکارے نے نہ پہنچایا۔ اگر خط نہ پہنچا تو بھیجنے والا کس دستاویز سے دعویٰ کرے گا۔ مگر ہاں چار آنے دے کر رجسٹری کروائے۔ ہم دوسرے تیسرے دن جا بجا خط بھیجنے والے روپیہ آٹھ آنے رجسٹری کو کہاں سے لائیں۔ احیاناً ہم نے تین ماشے سمجھ کر آدھ آنے کا اسٹامپ لگا دیا۔ وہ خط دو رتی بڑھتی نکلا۔ مکتوب الیہ سے دونا محصول لیا گیا۔ خواہی نہ خواہی کانٹا بانٹ رکھیے۔ کانٹے کا خار خار الگ۔ تولنے کا قضیہ الگ۔ خط بھیجنا نہ ہوا ایک جھگڑا ہوا۔ ایک مصیبت ہوئی۔ آج دسویں محرم کو یہ خط لکھا ہے۔ کل اسٹامپ کے ٹکڑے منگاؤں گا۔ سرنامہ پر لگا کر روانہ کروں گا۔ اندھیری کوٹھری کا تیر ہے۔ لگا لگا نہ لگا نہ لگا۔

خدا کے واسطے اس خط کا جواب جلد لکھنا۔ عبدالسلام کی ماں کا مفصل حال لکھنا۔ بدحواس ہوں۔ مجھ کو معاف رکھنا۔ حافظ جی کو دعا۔ منشی عبداللطیف کو دعا۔ از اسد اللہ۔

نگاشتہ دہم محرم ۱۲۷۱ھ مطابق سوم اکتوبر ۱۸۵۴ء دم سلخ چار شنبہ ۱۱ محرم و ۴ اکتوبر۔

(۴۸)

ہائے ہائے وہ نیکبخت نہ بچی۔ واقعی یہ کہ تم پر اور اس کی ساس پر کیا گزری ہوگی۔ لڑکی تو جانتی ہی نہ ہوگی کہ مجھ پر کیا گزری۔ لڑکا شاید یاد کرے گا اور پوچھے گا کہ اماں کہاں ہیں۔ یہ اس کا پوچھنا اور تم کو رلائیگا۔ بہرحال چارہ جز صبر نہیں ہے۔ غم کرو ماتم رکھو۔ رو و پیٹو آخر خون جگر کھا کر چپ رہنا پڑے گا۔ حق تعالیٰ عبداللطیف کو اور تم کو اور یتیموں کی دادی اور پھپھیوں کو سلامت رکھے۔ اور تمہارے دامن عطوفت و آغوش رافت میں ان کو پالے۔

حسین علی کا حال اگلے خط میں لکھ چکا ہوں۔ آج سولھواں دن ہے تپ کو اور نواں دن ہے کہ دانہ نہیں کھایا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ آج حقنہ ہو رہا ہے۔ مجھ میں دیکھنے کی تاب نہیں۔ میں دیوانخانے میں بیٹھا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محل میں مردانہ ہے۔ بادشاہی خاص تراش حقنہ کر رہا ہے۔ دیکھئے کیا ہو مجھ کو تو یاس ہے۔ اسد اللہ

[مطابق ۱۳ محرم ۱۲۷۱ھ] جمعہ ۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء

(۴۹)

بھائی صاحب!

آپ کا خط آیا اور منشی عبداللطیف کی دختر بلند اختر کا اپنی پھپھیوں کے ساتھ اکبرآباد جانا معلوم ہوا۔ یقین کہ عبدالسلام اپنی ماں کو یاد کرے۔ حق بجانب تمہارے ہے۔ واقعی کہ بڑا حادثہ تم پر گزرا ہے۔ خدا تم کو صبر بھی دے اور صبر کا اجر بھی دے اِنَّ اللہَ مَعَ الصّابِرِین۔

حسین علی اب اچھا ہے یعنی تپ نہیں، پیشاب میں ریگ آتی ہے۔ معدہ میں صلابت ہے۔ ضعف کی کچھ حد نہیں۔ خدا کرے بچ جائے اور بالکل اچھا ہو جائے۔

سعادت و اقبال نشان مرزا یوسف علی خاں طالِ عمرہٗ پہنچتے ہیں۔ میری طرف سے بھی مراسم تعزیت بجا لائیں گے اور حال میری غمزدگی اور خستگی کا کہیں گے۔

از اسد اللہ

[۲۲ محرم ۱۲۷۱ھ] ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۴ء

(۵۰)

آداب بجا لاتا ہوں اور جاجم کا سلام کرتا ہوں۔ یہ تکلیف کیوں کی۔ اس کی ضرورت کیا تھی۔

یوسف علی خاں کی زبانی تمہارے سامعہ و شامہ کا حال معلوم ہوا۔ بھائی واللہ باللہ میرا مدت سے یہی حال ہے کہ نہ کان میں آواز آتی ہے نہ ناک میں بو۔ باآنکہ میں یہاں موجود ہوں اور حکما میرے دوست ہیں۔ میری تدبیر نہیں ہو سکتی تم جو وہاں بیٹھے چاہتے ہو کہ یہاں سے تم کو کوئی دوا یا کوئی نسخہ ایسا بھیج دیا جائے کہ فوراً صحت حاصل ہو جائے۔ یہ کیونکر ہو سکے۔ فرصت چاہیے۔ مشقت چاہیے۔ مسہل لئے جائیں معجونیں کھائی جائیں۔ عرق پیے جائیں۔ آئندہ فائدہ ہو یا نہ ہو۔ ہر چند حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ازراہ عنایت چاہا کہ معالجہ کریں۔ میں نے جبر اٹھانا گوارا نہ کیا۔ خیر یہ قصے اور ہیں۔ بات یہی ہے کہ ان امراض کا علاج منحصر کثرت تنقیہ میں ہے۔ اور اس کو حضور طبیب و فراغ خاطر شرط ہے۔

ضیاء الدین خاں بہادر کو میں نے کہلا بھیجا ہے۔ جب وہ اپنی نظم و نثر میرے پاس بھجوا دیں گے تو میں آپ کو بھیج دوں گا۔ یوسف علی خاں کہتے تھے کہ عبد السلام و کلثوم آگرے سے آ گئے۔ اچھا ہوا۔ ماں تو غریبوں کی ہے ہی نہیں۔ اپنے دادا دادی پاس آرام سے رہیں۔

میاں نصیر الدین بھی شاعر ہوئے ہیں۔ آپ نے تخلص ان کو کیا دیا ہے۔ مجھکو اطلاع دیجئے۔

بیگم کا حال تمہاری تحریر سے معلوم ہوا۔ کہ اکثر بیمار ہو جاتی ہے۔ خدا اس کا حافظ ہے۔ پڑھنے میں اس پر شدت نہ کیا کرو۔ اس محنت کو اس پر سہل کر دو عورتوں کو علم اتنا ہی کافی ہے کہ حرف شناس ہوں۔ اور کلام مجید ناظرہ درست پڑھ لیں۔ خدا اس کو جیتا رکھے۔ سواد حرف شناسی ہو گیا ہے۔ قرآن پڑھ لے گی۔ شدت نہ کرو۔

حسین علی اچھا ہو گیا مگر صلابت معدہ اور فم معدہ کی ہاں ورم باقی ہے۔ کئی دن کے بعد کل پھر تپ چڑھ آئی۔ آخر شب تپ اتری۔ آج اچھا ہے کل دیکھوں کیا ہو۔ اس کا حقیقی دادا یعنی زین العابدین خاں کے والد اور میرے ہمزلف نواب غلام حسین خاں مر گئے۔ بہت افسوس کی بات ہے۔ یہ شخص بہت صاحب مروت اور صاحب مہر و محبت تھا۔ اسد

[۱۳؍ صفر ۱۲۷۱ھ] یکشنبہ پنجم نومبر ۱۸۵۴ء

(۵۱)

بھائی صاحب!

اسلام علیکم۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہارے بچوں کو سلامت رکھے۔ منشی عبد اللطیف کا ضعفِ دل و دماغ گویا خلقی ہے۔ اس کی فکر زیادہ نہ کرو۔ نوشدارو خمیرہ گاؤزبان۔ خمیرہ ابریشم۔ دواء المسک۔ اس طرح کے مرکبات کا استعمال چلا جائے۔ نہ علی الدوام بلکہ گاہ گاہ۔

یہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میاں ذوق مر گئے۔ حضور والا نے ذوق شعر و سخن ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک اور اس عصر میں غنیمت تھا۔

نظم و نثر نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر تخلص پہنچتی ہے۔ طبع معنی یاب و زبانِ نکتہ سنج رکھتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔

سب کو میری دعا پہنچے اور سب کی خیر و عافیت مجھ کو لکھو۔ خصوصاً بیگم کی خیر و عافیت۔ والسلام۔

از اسد اللہ

[۲؍ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ] روز پنجشنبہ ۲۳؍ نومبر ۱۸۵۴ء

(۵۲)

بھائی صاحب!۔

خدا کے واسطے ماجرا کیا ہے۔ نہ تو اپنی اور اپنے بچوں کی خیر و عافیت لکھتے ہو نہ میری زیست کی خبر پوچھتے ہو۔ نواب ضیاء الدین خاں کی نظم و نثر کے اوراق حسب الطلب تمہارے بھیجے۔ اس کی رسید بھی نہیں۔ یہ تو صورت انقطاع محبت کی سی ہے۔ گمان کرتا ہوں کہ دورہ کا سفر ہو گا۔ اس صورت میں بھی تو تم مجھ کو خط بھیجا کرتے تھے۔ کثرتِ کاروبار نئی بات نہیں۔ کیا عدالت دیوانی اور پرمٹ اور کلکٹری یہ تینوں محکمے بھی آپ ہی کے سپرد ہو گئے۔

منشی ہرگوپال بھی کول میں نہیں کہ جو ان کی تحریر سے تمہارا حال معلوم ہو۔ مجھ کو علم غیب نہیں۔ اشراق ضمیر نہیں کہ یہاں بیٹھا ہوا تمہارا حال دریافت کر لوں۔ ایک ذرا ہوش میں آؤ۔ اور اپنی معہ اپنے متوسلوں کے خیریت لکھ کر بھیجو۔ سب کا حال نام بنام لکھو۔

خدا جانے عبد اللطیف کیسا ہے بیگم کیسی ہے اور لڑکے بالے کیسے ہیں۔ تمہارا کیا حال ہے۔ گھر میں کس طرح ہیں۔ میں سب کو دعا کہتا ہوں اور حسین علی تم کو بندگی کہتا ہے۔

اسد

[بروز جمعہ مطابق ۱۷؍ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ] ۸؍ دسمبر ۱۸۵۴ء

(۵۳)

بھائی!

خدا کے واسطے رسول کے واسطے منشی عبداللطیف کی خیروعافیت لکھو۔ تفتہ بھی وہاں نہیں جو تمہارا حال لکھتے رہیں۔ اور میں تمہارا محتاج نہ رہوں۔ رات بھر مجھکو بیچینی رہتی ہے اور تمہارے خط کے نہ آنے کا خیال اور عبداللطیف کی بیماری کے تصوّر میں ملال رہتا ہے یارب۔ آج آخر روز جو وقت ڈاک کے ہرکاروں کے آنے کا ہے قاصد آجائے اور تمہارا خط لائے اور اس میں خیروعافیت عبداللطیف کی خصوصًا اوراوروں کی عمومًا مندرج ہو۔

قلعہ کو سوار ہوتا ہوں۔ یہ رقعہ لکھ کر کہار کو دے چلا ہوں۔ وہ ڈاک میں ڈال آئے گا۔ مذکیہ بیگم کو دعا پہنچے۔

از اسداللہ

[۱۰ ربیع الآخر ۱۲۷۱ھ] نگاشتہ یکشنبہ سی ویکم دسمبر ۱۸۵۴ء وقت صبح

اس خط کا جواب قسم کھاتا ہوں کہ اس سال میں نہیں آنے کا یعنی ۱۸۵۵ء میں لکھو گے۔

(۵۴)

بھائیصاحب کا عنایت نامہ پہنچا۔ میرا خط لکھنا تغافل وتساہل سے نہ تھا۔ آپ اپنے دورے کا جانا لکھ چکے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ جب آپ علیگڈھ آلیں اور مجھکو اطلاع دیں تو میں خط لکھوں۔ حافظ بیگم کو دعا پہنچے۔ حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست رکھے۔ اور تیسوں سیپارے حفظ کرنے کی توفیق دے۔

منشی عبداللطیف کا حال معلوم ہوا۔ خدا پر نظر رکھو۔ اور تقویت کی رعایت کیے جاؤ۔ لکھ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں کہ جدوار بہت مفید ہوگی۔ اگر وہاں اچھی نہ ملے تو مجھ کو لکھ بھیجو۔ میں یہاں سے بھیج دوں۔ پھر نیمروز تمہارے پاس ہے۔ اب اور کیا کرو گے۔

اگر ایسی ضرورت ہے تو لکھ بھیجو۔ میں دو تین مجلد اور بھیج دوں۔ ان دنوں میں دو رباعیاں اردو میں لکھی ہیں۔ ان کو بہ نظر اصلاح دیکھو۔

رباعی

کہتے ہیں کہ وہ مردم آزار نہیں  عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہات کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا  کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

---

ہم گرچہ ہوئے سلام کرنے والے  کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ  وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

از اسد اللہ مرسلہ پنجشنبہ ۱۸ جمادی الثانی [۱۲۷۱ھ] ۸ مارچ ۱۸۵۵ء

(۵۵)

پیر و مرشد!

مجھ پر عتاب کیوں ہے۔ نہ میں تم تک آسکتا ہوں نہ تم تشریف لا سکتے ہو۔ صرف نامہ و پیام۔ سو آپ ہی یاد کیجئے کہ کتنے دن سے آپ نے اپنی اور بچوں کی خیر و عافیت نہیں لکھی۔

شیخ وزیر الدین پہنچے ہوں گے۔ مرزا حسن علی بیگ پہنچے ہوں گے۔ بارے فرمائیے کل سے رمضان المبارک تشریف لائے ہیں۔ کل دن بھر تو گرمی رہی اور شام سے پانی تو برف ہو گیا ہے۔ اور ہوا کا یہ عالم ہے کہ رات کو میں نے رضائی اوڑھی تھی۔ اس ہوا کا اعتبار نہیں۔ ابھی منزل دور ہے۔

ہاں صاحب میاں تفتہ ہم پر خفا ہو گئے ہیں۔ دو دو ہفتہ سے ان کا خط نہیں آیا۔ خدا جانے کہاں ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ کس شغل میں ہیں۔ آپ کو اگر ان کا حال معلوم ہو تو مجھکو بھی اطلاع دیجئے۔

ہم نے اپنے گھروں میں یہ رسم دیکھی ہے کہ جہاں لڑکا آٹھ سات برس کا ہوا اور رمضان آیا تو اس کو روزہ رکھواتے ہیں۔ اور نماز پڑھواتے ہیں۔ مجھکو شب کو یہ خیال آیا کہ کہیں ایسا نہو کہ بیگم کو اب کے سال آپ روزہ رکھوائیں۔ ابھی اس کی عمر کیا ہے۔ نویں دسویں برس روزہ رکھوانا۔ بہرحال اس حال سے مجھے آگہی دو اور اپنا اور اپنے روزہ و شغلِ ہر روزہ کا حال لکھو۔

منشی عبداللطیف کا حال لکھو۔ کہ وہ کیسے ہیں۔ روزہ ذرا سمجھ کر رکھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گرمی کی تاب نہ لائیں اور روزہ رکھ کر رنجور ہو جائیں۔

میری طرف سے سب کو دعا پہنچے اور حسین علی خاں کی طرف سے سب کو بندگی۔ اور سلام اور شاید جیسے عبدالسلام اور بیگم ہے۔ ان کو دعا پہنچے۔ از اسداللہ

نگاشتہ ۱۹ مئی (سنہ ۱۸۵۵ء) ۲ رمضان [سنہ ۱۲۷۱ھ بروز شنبہ]

(۵۶)

یا الٰہی کس کس پر رشک کروں۔ مال و دولت جاہ و شوکت پر تو میں کسی کا بھی حاسد نہیں ہوا۔ شیخ وزیرالدین پر اور مرزا حسن علی بیگ رسالدار پر حسد کیونکر نہ کروں کہ میرے بھائی کو دیکھتے ہوئے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے آئے ہیں۔ مقصود اس نگارش سے یہ ہے کہ دونوں صاحب جدا جدا آئے اور آپ کی خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی۔ شیخ وزیرالدین کچھ مہر نیم روز کے مقدمے میں کہتے تھے۔ مگر میں جو بہرا ہوں تو کچھ سمجھا نہیں۔ کہ وہ کیا کہتے تھے۔ شاید یہی کہتے ہوں گے کہ جو اب پھر چھاپی جائیں تو ایک نسخہ جناب منشی صاحب کو اور بھیجنا۔

عبدالسلام کو میں از راہ نسیان بہت چھوٹا سمجھا ہوا تھا۔ اب شیخ جی کے اظہار سے معلوم ہوا کہ وہ باتیں کرتا ہے اور حسین علی کے برابر ہے۔ ان کے کہنے سے مجھکو یاد آیا کہ کم و بیش چار برس کا ہوا ہوگا۔ یقین ہے کہ اب بسم اللہ بھی ہو اور وہ پڑھنے بیٹھے۔ اسکی

مجھ کو اطلاع دیجیے گا۔ کہ بسم اللہ اس کی کب ہوگی۔

بیگم کو دعا کہدینا۔ یقین ہے کہ اب پانچواں سیپارہ شروع کیا ہوگا یا شروع کرے۔

یہاں کے سب حالات بدستور ہیں۔ حکیم نورالدین صاحب اور ان کے بھائی حکیم نصیرالدین اور حکیم مہر علی وغیرہ یہاں آئے تھے۔ نواب زینت محل بیگم کے حقیقی ماموں امین الرحمٰن خاں ان کے مرید ہیں۔ ان کے بیٹے کی شادی کی تقریب میں آئے تھے۔ انھیں کے ہاں اترے تھے۔ میں ایک دن حکیم نورالدین صاحب سے ملنے گیا۔ قضا را دہ تو تھے مگر حکیم نصیرالدین اور مہر علی ان میں سے کوئی نہ تھا۔ بادشاہ سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک تو خواجہ صاحب کی درگاہ میں اور ایک جس دن حکیم صاحب اکبرآباد جاتے تھے حسب الطلب حضور قلعہ میں گئے۔ اور بادشاہ سے مل کر رخصت ہوکر اپنے شہر کو تشریف لے گئے۔ حکیم صاحب عابد و زاہد آدمی ہیں۔ صلحا میں ہیں فقرا میں نہیں ہیں۔ حلقہ اور توجہ اور مراقبہ اور مکاشفہ اور اذکار اور اشغال اور مسائل توحید و تصوف کا بیان۔ یہ باتیں بالکل نہیں ہیں۔ صرف اوراد پر مدار ہے۔ تعلیم و تلقین بھی شاید اوراد ہی کی ہو۔ ذکر و شغل کا ذکر ہی نہ ہو۔ بہر حال خوش اوقات آدمی ہیں اور غنیمت ہیں۔

لو بھئی اب آٹھ بج گئے۔ نو بجا چاہتے ہیں۔ تم کچہری جاؤ۔ میں قلعہ ہو آؤں۔ یار باقی صحبت باقی۔ اسلام علیکم وعلیکم السلام۔ [مئی ۱۸۵۵ء]

(۵۷)

بھائی صاحب!

کہئے۔ کیا گرمی پڑتی ہے۔ اور کیونکر گزرتی ہے۔ خوب ہوا جو بیگم کو روزہ نہ رکھوایا۔ خدا کرے بخار کا آنا بھی موقوف ہو گیا ہو مجھکو اطلاع دیجیے گا۔ آپ نے اس خط میں لکھا کہ عبدالرشید کی بسم اللہ شعبان کے مہینے میں ہوگی۔ میں نہیں جانتا کہ عبدالرشید کون۔ ظاہرا عبدالسلام کو عبدالرشید سہو سے لکھ گئے ہو۔ اس کا بھی جواب لکھیے گا۔

منشی عبداللطیف صاحب احتیاط کریں اور روزہ نہ رکھیں۔ ورنہ خدا جانے طبیعت میں کیا فساد پیدا ہو جائیگا۔

واقعی میاں تفتہ دیوان کی نقل کر رہے ہیں۔ اور لاہور بھیجیں گے۔ مجھ سے خفا ہیں۔ حکم تھا کہ اس دیوان کا دیباچہ لکھا۔ میں نے کہا۔ صاحب۔ تم ہر سال ایک دیوان لکھو گے۔ میں دیباچہ کہاں تک لکھا کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے خط نہیں بھیجا۔ میں بھی ان کو خط نہ لکھوں گا اور دیکھوں کب تک مجھ کو یاد نہیں کرتے۔ دیباچہ لکھنا بھائی کیا آسان ہے۔ کلیجہ کھرچنا پڑتا ہے۔ نثر کی فکر نظم سے کم نہیں۔ اس گرمی میں کہاں لکھوں۔ کیا لکھوں۔ ایک بار ان کی خاطر کر دی۔ اور ایک دیباچہ لکھ دیا۔ سو اس بار بھی اس کا صلہ مجھکو یہ ملا تھا کہ آپ ناخوش ہو گئے تھے اور مجھ کو لکھا تھا کہ تو نے میری ہجو ملیح کی ہے۔ جب میں نے لکھا کہ بھائی تم میرے مقابل نہیں۔ میرے معارض نہیں۔ میرے یار ہو۔ شاگرد کہلاتے ہو۔ لعنت اس یار پر کہ یار کی ہجو ملیح لکھے اور ہزار لعنت اس استاد پر کہ اپنے شاگرد پر چشمک چلے۔ اور اس کی ہجو ملیح لکھے۔ تب کچھ شرمندہ ہو کر چپ ہو رہے تھے۔ تمہاری جان کی قسم۔ دیباچہ نہ لکھنا اس راہ سے نہیں ہے بلکہ مجھ میں اب دم باقی نہیں۔ خدا جانے میں جیتا کیونکر ہوں۔ عید بقرعید نوروز کے قصائد۔ غور کرو دو دو تین تین برس سے بالکل موقوف ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میرا عذر بجا اور ان کا غصہ بے جا ہے۔ آپ کو معلوم رہے —— نہ زیادہ زیادہ۔

بیگم کی خیر و عافیت اور عبدالرشید اور عبدالسلام کا حال ضرور لکھیے۔ اور میاں عبداللطیف کے روزے کا حال بھی لکھیے۔

حسین علی اچھا ہے۔ لم یکن کے سورہ تک پہنچ گیا ہے۔

از اسد اللہ

[بروز جمعہ] ۹ رمضان [۱۲۷۱ھ] ۲۵ مئی ۱۸۵۵ء

لو صاحب۔ اور تماشا سنو۔ آپ مجھ کو سمجھاتے ہیں کہ تفتہ کو آزردہ نہ کرو۔ میں تو ان کے خط کے نہ آنے سے ڈرا تھا کہ کہیں مجھ سے آزردہ نہ ہوں۔ بارے جب تم کو لکھا اور تم نے بہ آئین مناسب ان کو اطلاع دی تو انھوں نے مجھ کو خط لکھا۔ چنانچہ پرسوں میں نے اس خط کا جواب بھیج دیا۔ تمہاری عنایت سے وہ جو ایک اندیشہ تھا۔ رفع ہو گیا۔ خاطر میری جمع ہو گئی۔ اب کونسا قصہ باقی رہا کہ جس کے واسطے آپ ان کی سفارش کرتے ہیں۔ واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا قابل فرزند عطا کیا ہے۔ رہا دیباچہ۔ تم کو میری خبر ہی نہیں۔ میں اپنی جان سے مرتا ہوں ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل

کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں۔ اور مجھ کو معاف رکھیں۔ خدا نے مجھ پر روزہ نماز معاف کر دیا ہے۔ کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے۔

عبدالسلام کی مکتب نشینی مجھ کو اور آپ کو اور اس کے باپ کو مبارک ہو۔ مکتب نشینی کے باب میں سہو سے عبدالرشید لکھنا شگون نیک ہے یعنی یہ رشید ہوگا۔

منشی عبداللطیف کا حال سن کر جی خوش ہوا۔ حکیم ہو ڈاکٹر ہو۔ اپنے کام سے کام ہے ؎ باید متاع نیکو از ہر دکاں کہ باشد۔ بھائی اس غریب کو نہ تاہل میں پھنساتے ہو۔ بقائے نام کے واسطے خدا جنیار رکھے عبدالسلام و کلثوم کافی ہیں۔ میں تو بھائی ابن یمین کا معتقد ہوں ؎

مرداں بیہ کہ بدنیا نکنند میل دو کار

بجہاں ہر کہ طلبگار سلامت باشد

زن نخواہد اگرش دختر قیصر بدہند

وام نستاند اگر وعدہ قیامت باشد

کہیں یہ نہ ہو کہ اس کا جی نہ چاہتا ہو اور تم زبردستی اس کو بلا میں پھنساتے ہو۔ اس کے ہمرازوں سے اس کا مافی الضمیر معلوم کر لو۔ اگر وہ بھی راضی ہے تو خیر۔ ورنہ میرے نزدیک تو جبر ہے۔

حسین علی اپنے دادا اور دادی کو بندگی اور بہن بھائی کو سلام کہتا ہے بیگم کو میری دعا کہنا منشی عبداللطیف کو پیشگی مبارک باد دینا۔ زیادہ کیا لکھوں۔ از اسد اللہ یکشنبہ ۱۷ رمضان و ۳ رجون۔

[بروز جمعہ] ۱۷ رمضان [۱۲۷۱ھ و ۳ رجون [۱۸۵۵ء]

(۵۹)

الحمدللہ کہ حرارت صومی اور حرارت یومی باہم رفع ہو گئیں۔ یاد کرو وہ ۲۷ ر تاریخ کی رات جس کو شب قدر کہتے ہیں۔ عیاذاً باللہ وہ ہوائے گرم اور وہ تاریکی۔ بارے اب لو نہیں چلتی۔ پروا ہوا اگرچہ پانی کو بگاڑتی ہے لیکن سرد تو ہے۔ دو ایک دن کچھ بوندیاں بھی پڑیں ابر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

اب کے عید میں میں نے قصد قصیدے کا نہ کیا بلکہ قطعہ و رباعی بھی نہیں۔ اسی وقت دو تین شعر وہیں لکھ کر پڑھ دئے اور ان کا مسودہ بھی نہ رکھا۔

منشی عبداللطیف سرتاسر رمضان کیسے رہے اور اب ان کا کیا رنگ ہے۔ اور ان کے نکاح تازہ کی کیا خبر ہے۔

تم کو خبر دیتا ہوں کہ زین العابدین کی ماں یعنی دادی حسین علی خاں کی پنجشنبہ کے دن ۲۸ ر رمضان کو مر گئی۔ زین العابدین کا بڑا بیٹا باقر علی خاں وہ بھی میرے پاس آ گیا۔ دیکھتے ہو۔ بھائی چرخ ستمگر کیا شعبدہ بازی کر رہا ہے۔ بوجھ پر بوجھ مجھ پر ڈال رہا ہے زخم پر زخم مجھ پر لگا رہا ہے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ آمد وہی۔ مصارف بڑھ گئے۔ اگر مثلاً بے مروتی اور خدا ناترسی کروں تو کہئے۔ ان لڑکوں کو کس سے کہوں کہ تو اپنے لڑکوں کو سنبھال

مجھ میں مقدور نہیں۔ بہر حال چپ ہوں او متحیر ہوں۔ خدا میری شرم رکھے۔
بیگم کو دعا کہو۔ اور اُن کی خیر و عافیت مجھ کو لکھو۔ عبدالسلام و کلثوم کو دعا نہ تنہا حسین علی بلکہ اس کا بڑا بھائی باقر علی خاں دونو آپ کو بندگی کہتے ہیں۔

از اسداللہ روز جمعہ ۲۳ جون ۱۸۵۵ء و ہفتم شوال [۱۲۷۱ھ]

یہاں عید یکشنبہ کی ہوئی ہے۔

(۶۰)

بھائی جان!

منشی عبداللطیف کی شادی پہلے اس پر پھر اس کے والدین پر اور اسکی بہنوں پر اور بھائیوں پر مبارک ہو پھر کہتا ہوں کہ خدا کرے یہ امر اس کی خوشی اور رضامندی سے واقعہ ہوا ہو۔ زکیہ بیگم کی نسبت مبارک ہو۔

ہوا خوب ہو گئی ہے۔ مینہ روز برستا ہے۔ یکم جولائی سے آج تک جھڑی کی صورت ہے۔ یقین ہے کہ وہاں بھی یہی موسم ہو گیا ہوگا ؎

نہ کشت و زرع شناسیم و نے حدیقہ و باغ
زبہر بادہ طلبگارِ باد و بارانیم

اب کے آپ کا خط بہت انتظار کے بعد آیا۔ کئی دن سے چاہتا تھا کہ شکایت لکھوں۔ مینہ فرصت نہیں دیتا تھا۔ کہ آدمی ڈاک گھر جا سکے۔ بارے پرسوں آپ کا خط آ گیا۔ کل مینہ برستا رہا۔ آج کچھ کھل گیا ہے یعنی بارش نہیں ہے۔ تفلعہ بھی گیا اور تم کو بھی خط لکھا۔ والسلام والاکرام۔

از اسداللہ

[۱۹ ؍ شوال ۱۲۷۱ھ] نگاشتہ چاشت روز پنجشنبہ پنجم جولائی ۱۸۵۵ء

(۶۱)

بھائی صاحب!

مینہ کا یہ عالم ہے کہ جدھر دیکھئے ادھر دریا ہے۔ آفتاب کا نظر آنا برق کا چمکنا ہی یعنی گاہے دکھائی دے جاتا ہے۔ شہر میں مکان بہت گرتے ہیں۔ اس وقت بھی مینہ برس رہا ہے۔ خط لکھتا تو ہوں مگر دیکھئے ڈاک گھر کب جاوے۔ کہار کو کمّل اڑھا کر بھیجدونگا۔

آم اب کے سال ایسے تباہ ہیں۔ کہ اگر مثلا کوئی شخص درخت پر چڑھے اور ٹہنی سے توڑکر وہیں بیٹھ کر کھائے۔ تو بھی سڑا ہوا اور گلا ہوا پائے۔ یہ تو سب کچھ ہے مگر تم کو تفتہ کی بھی کچھ خبر ہے پتمبر سنگھ اس کا لاڈلا بیٹا مر گیا۔ ہائے اس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی ؎

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را

چہ کند گوئی کہ تن درندہد چوگاں را

تم اب خط لکھنے میں بہت دیر کرتے ہو۔ آٹھویں دن اگر ایک خط لکھتے رہو تو ایسا کیا مشکل ہے۔

یہاں دونوں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ اب وہاں کے لڑکوں کی خیر و عافیت لکھئے۔ اسد

[۱۱ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ] پنجشنبہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء

(۶۲)

عیاذاً باللہ۔

یہ سخت ماجرا ہے منشی عبداللطیف کہاں اور میرٹھ کہاں۔ ایک صاحبزادہ نازپروردہ یہ بھی نہ جانتا ہوگا کہ شہر میں اناج کا کیا بھاؤ ہے اور گوشت کیا سیر بکتا ہے۔ صبح اٹھے اور باپ کے ہاں کی سواری پر چڑھے۔ کچہری چلے گئے۔ آئے تو اپنی بی بی بچوں میں مل کر روٹی کھالی۔

والدین سے مفارقت اور پھر خانہ داری کی مشقت۔ سواری کھنی۔ تین آدمی سے کم کام نہ نکلے گا۔ نوکری ایسی کیا ہے کہ جس میں یہ مدارج طے کر کر کچھ بچ رہے۔ صاحب یہ صورت تو بہت بری ہے۔ واللہ قلبنا ملال تم کو ہوا ہے۔ اس سے کم مجھ کو نہیں ہے۔ میں بھی اتنا ہی ملول ہوں۔ بارے اب اطلاع دیجئے کہ وہ کس تاریخ کو لوانہ ہوں گے۔ ظاہرا یکم اگست سے اس دفتر میں ملازم ہوئے ہوں گے۔

زکیہ بیگم کی خیریت لکھو۔ آنکھوں کی زردی اور حرارت جاتی رہی یا ابھی کچھ باقی ہے۔

باقر علی اور حسین علی دونوں خوش ہیں۔ تپ رفع ہو گئی۔ آپ عبداللطیف کا اور بیگم کا حال لکھئے۔ اسد

[۲۰ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ بروز بدھ] ۴ ماہ اگست ۱۸۵۵ء

(۶۳)

حضرت۔

بہت دن سے حال تمہارا اور بچوں کا اور خصوصاً منشی عبداللطیف کا معلوم نہیں۔ آج صبح کو گھبرا کر تم کو یہ خط لکھتا ہوں۔ خدا کرے شام کو ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لائے اور خیر و عافیت سب کی معلوم ہو جائے۔

نصیر الدین کو دعا پہنچے۔

ہم نے تمہارے اشعار ایک تذکرے میں دیکھے اور جانا کہ تم چھپے رستم ہو۔ اپنے شعر ہم سے اس لئے چھپائے ہوں گے کہ یہ مضمون چرا نہ لے۔

بیگم کو دعا پہنچے۔ عبدالسلام اور کلثوم کو دعا پہنچے۔ جلد سب کی خیر و عافیت لکھئے زیادہ کیا عرض کروں۔ از اسد

[۴ محرم ۱۲۷۲ھ] یکشنبہ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۵ء

(۶۴)

پیرومرشد۔

بات کو بھی سمجھتے ہو یا یوں ہی شکوہ کرنے کو موجود ہو جاتے ہو۔ میں نے قصیدہ لکھنا موقوف کیا۔ موقوف کیا کیا۔ مجھ سے لکھا ہی نہیں جاتا۔ قطعہ یا رباعی عیدین کو لکھ کر نذر کر دیتا تھا۔ اب کے حکیم صاحب نے بہت شدت کی اور کہا کہ صاحب یہ تو نذر عید نہ ہوئی۔ جیسے معلم لڑکوں کو عیدی کے دو شعر لکھ دیتے ہیں۔ یہ تو ویسی عیدی ہے۔ ناچار میں نے یہ مثنوی کی روش پر چالیس بیالیس بیت لکھ کر نذر کر دی۔ اگر اپنے دیوان کے حاشئے پر یہ شعر چڑھائے ہوئے ہوں تو قسم لو۔ یہ ہے کیا کہ میں تم کو بھیجتا۔ افسوس یہ ہی کہ تم کو میرے حال کی خبر نہیں۔ اگر دیکھو تو جانو ؎

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

کوئی دم ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو دم واپسیں کا خیال نہ ہو۔ ساٹھ برس کا ہو چکا اب کہاں تک جیوں گا۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ رباعی۔ فارسی اردو دس بارہ ہزار بیت کہہ چکا۔ اب کہاں تک کہوں گا۔ زندگی بری بھلی جس طرح بنی کاٹی۔ اب فکر یہ ہے کہ دیکھیں موت کیسے ہوتی ہے۔ اور بعد موت کے کیا درپیش آنا ہے ؎

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

نہ بھیجنا ان اشعار کا صرف افسردگی سے تھا گویا یہ شعر کہے ہی نہیں۔ دیوان میں رکھتا اور تم کو نہ بھیجتا اس کے معنی کیا جب دیوان ہی میں نہ رکھے تو تم کو کیا بھیجوں۔

منشی عبداللطیف کا جو حال میں سمجھا ہوا تھا۔ وہ ہی تم نے لکھا۔ اس کا وہاں دل نہ لگنا اور مشاہرہ کا مصارف ذات کو کافی نہ ہونا اور تمہارا اور اس کی والدہ کا بےچین رہنا یہ سب ایسے امور نہیں ہیں کہ بغیر تمہارے لکھے خیال میں نہ ہوں۔ بھائی روزگار

پیشگی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ترقی مراتب کا امیدوار رہا چاہیے۔ کاش عبداللطیف کی نوکری عدالت دیوانی میں ہوتی تو یہ دو مہینے تعطیل کے اپنے گھر میں رہتا۔

نصیرالدین کا حال معلوم ہوا میں نے ہنسی سے لکھا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ شعر تمہارے ہیں۔

پلنگ کے پائے ڈھونڈتا ہوں یقین ہے کہ مل جائیں گے۔ مگر یہ لکھو کہ شادی کس مہینے میں قرار پائی ہے۔ اس کی ضرور اطلاع دو۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ لڑکوں کو دعا اور لڑکوں کی طرف سے بندگی۔ از اسد اللہ محررہ دوشنبہ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۵ء

[۱۲ محرم ۱۲۷۲ھ]

(۶۵)

بھائی!

تمہارا غصہ میرے سر، آنکھوں پر۔ واللہ یہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ البتہ یہ خیال تو مجھ کو آیا کہ دیکھو بھائی کو میرے کلام سے انس نہیں ہے ورنہ ایسی چیز کو ہاتھ سے نہ دیتے۔ نہ یہ کہ اس کا دینا باعث اس کا ہوا ہو کہ اور نسخہ تم کو نہ بھیجوں۔ چھاپے خانے والوں نے سوداگروں کے ہاتھ بطریق پیشگی سو سو دو دو سو مجلد بیچ ڈالے تھے۔ چھاپے خانے سے جو میں نے منگایا تو مجھ کو نہ ملا۔ اب متفرق کتاب فروشوں سے کہہ دیا ہے۔ کوئی نسخہ ہاتھ آیا اور میں نے بھیجا۔ میرا تو یہ حال ہے کہ جو کچھ میں نے کہا پھر جب تک تمہارے پاس نہ بھیج لوں مجھ کو چین نہیں آتا۔ تم کو سخن فہم جانتا ہوں۔ رات کو ایک غزل کئی برس کے بعد لکھی ہے اب صبحدم تم کو لکھتا ہوں۔ خدا کے واسطے غور کرنا کہ غزل اس کو کہتے ہیں۔

عید کی مثنوی صرف روپے بچانے کی تھی۔ یعنی اگر وہ نہ ہوتی تو مجھ کو چار روپے نذر دینے پڑتے۔ جب مسودوں میں نہ رکھوں اور دیوان میں نہ لکھوں تو

حضرت کو کیوں بھیجوں۔

پلنگ کے پائے ڈھونڈ رہا ہوں۔ خاطر عاطر اس طرف سے جمع رہے۔ لو غزل سنو مگر غور سے دل لگا کر۔ اس کی نقل جہاں چاہو وہاں بھیجو ؎

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور

گر خود نجہد از سر از دیدہ فرو بارم
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدم فرزانہ دانی رہِ ویرانہ
شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور

شورابۂ ایں وادی تلخست اگر رادی
از شہر بسوئے من سر چشمۂ نوش آور

دانم کہ زرے داری ہر جا گزرے داری
مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور

گر مغ بکدو ریزد بر کف نہہ و راہی شو
ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور

ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آں در رہِ چشم افگن ایں از پئے گوش آور

گاہے بہ سبکدستی از بادہ ز خویشم بر
گاہے بہ سیہ مستی از نغمہ بہ ہوش آور

غالبؔ کہ بقایش باد ہمپائے تو گر ناید
بارے غزلے فردے زاں موئینہ پوش آور

[۳ر اکتوبر ۱۸۵۵ء]

(٦٦)

بھائی صاحب!

کئی خط اس عرصہ میں تم کو لکھے۔ مگر جو لکھنا تھا وہ بھول گیا۔ پلنگ کے پائے مسلّم لیکن یہ تم نے نہیں لکھا کہ پائے بڑے پلنگ کے ہوں۔ یا چھوٹی سی پلنگڑی کے ہوں۔ مقدار مالیت تو معلوم مگر اندازہ پستی و بلندی کا نہیں معلوم۔ اس کا لکھنا ضرور ہے۔ ضرور لکھو اور جلد لکھو۔

بھائی کل خط مرزا تفتہ کا آیا۔ انھوں نے کچھ قطعہ اصلاح کے بھیجے ہیں۔ ازانجملہ دو قطعہ تمہاری مدح اور اظہار محبت میں ہیں۔ ایک مجھ کو بہت پسند آیا وہ تم کو لکھتا ہوں؎

دگر کہ گریہ کند سر بہ برگ ما زینسان
دگر کہ از لبش اینگوشہ ہای دہو بچکد

بود حقیر بہ فن محبّت آں یکتا
کہ خوں شود دل ما وز چشم او بچکد

چوتھے مصرعے میں کیا خیال نازک ہے۔ خدا اس عزیز کو جیتا رکھے اور اس کے حال پر رحم کرے۔

ازاسد۔ جواب طلب سہ شنبہ نہم اکتوبر ۱۸۵۵ء

[۲۷ محرم ۱۲۷۲ھ]

(٦٧)

بندگی عرض کرتا ہوں۔ یہاں آج بدھ کے دن تیسری جون کی شہر کے حساب سے ۲۹ رمضان کی ہے اور پانی پت کرنال کے آئے ہوئے خطوط کی رو سے تیسواں ہے۔ بہر حال کل عید ہے۔ تم کو اور تمہارے بچوں کو مبارک ہو۔ بیگم مگر دایر سایر ہے۔ کبھی اکبر آباد کبھی مرسان۔ دایر سایر کا سال بھر میں ایک دورہ ہوتا تھا۔ یہ غریب شاید چار مہینے

کول میں آرام سے نہ رہتی ہوگی۔

منشی عبداللطیف کی تنہائی نے یہ تقریب پیدا کی کہ سب لوگ اکبر آباد چلے گئے
عرفت ربی بہ فسخ العزائم۔

مہر نیمروز آپ کو مبارک۔ مول لیجئے۔ اور احباب کو بھیجئے۔ میں ایسی خرافات کا
مشتاق نہیں جو آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر تو کہے تو میں تجھ کو بھی بھیجوں۔ ستیا ناس جائے
اس کتاب فروش کا کہ جو یہ رسالے کول لے گیا اور آپ نے مجھکو لا نہ دیا۔ بھائی یہ تو میں جانتا
ہوں کہ یہ تم نے میرے چھیڑنے کو لکھا ہے ورنہ وہاں یہ نسخے نہ پہنچے ہوں گے۔ اگر کسی دوست
کے واسطے تم کو درکار ہو تو ایک آدھ نسخہ میں بھیجدوں۔ خفا نہ ہو مجھ کو لکھ بھیجو۔

حضرت تم تفتہ کا حال کیا لکھتے ہو۔ اب تفتہ آفتہ نہیں۔ از خود رفتہ ہے۔
خدا اس کو جیتا رہے۔ یہ شخص بھی غنیمت ہے۔ بڑا صدمہ اٹھایا ہے۔

گرمی کی کیوں شکایت کرتے ہو۔ اب کے سال نہ آگے کی سی گرمی پڑی نہ لو
چلی اور اب پانچ چار دن سے تو خاصی سردی پڑتی ہے کہ اکثر یار رات کو رضائی اور ضعفا
لحاف اوڑھتے ہیں۔ ہوا سرد پانی سرد ظاہرا کہیں اولے پڑے ہیں ورنہ اس موسم میں
یہ سردی کہاں۔ مگر یہ سردی مہمان ہے۔ ابھی جوزا کا آفتاب ہے۔ دن بڑھتا جاتا ہے۔
اس عارضی سردی کے رفع ہونے کے بعد گرمی پڑے گی۔ بہر حال ان دنوں میں یہاں
شدت امراض کی نہیں۔ شہر میں امن و امان ہے۔

تمہارے دونوں بچے باقر علی خاں و حسین علی خاں اچھے ہیں۔ دن بھر میں تین چار
بار روزہ کھولتے ہیں اور افطار کے وقت روزہ داروں کے حلق کے دربان بنجاتے ہیں۔

بیگم وغیرہ کے اکبر آباد سے آنے کی خبر لکھنی ہوگی۔

غالب

[بروز سہ شنبہ ۳۰ رمضان ۱۲۷۲ھ] ۴ جون ۱۸۵۶ء

(۶۸)

بھائی صاحب!

شکر ہے خدا کا کہ تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ تم بھی خدا کا شکر بجا لاؤ کہ میرے ہاں بھی اس وقت تک خیریت ہے۔ دونوں لڑکے خوش ہیں۔ آم آم کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی ان کو نہیں دیتا۔ ان کی دادی کو یہ وہم ہے کہ پیٹ بھر روٹی انکو کھانے نہیں دیتی۔

یہ تم کو یاد رہے کہ ولیعہد[1] کے مرنے سے مجھ پر بڑی مصیبت آئی۔ پس اب مجھ کو اس سلطنت سے تعلق بادشاہ کے دم تک ہے۔ خدا جانے کون ولیعہد ہوگا۔ میرا قدرشناس مرگیا۔ اب مجھ کو کون پہچانے گا۔ اپنے آفریدگار پر تکیہ کئے ہوئے بیٹھا ہوں۔ سردست یہ نقصان کہ وہ زین العابدین خاں کے دونوں بیٹوں کو میوہ کھانے کو دس روپے مہینہ دیتے تھے۔ اب وہ کون دے گا۔

دو دن سے شدت ہوائے وبائی کم ہے۔ مینہ بھی برستا ہے۔ ہوا ٹھنڈی چلتی ہے۔ انشاء اللہ تعالے بقیہ آشوب بھی رفع ہوجائے گا۔

تم اپنے شہر کا حال لکھو۔ اور بچوں کی خیر و عافیت بھیجو۔

جب تک یہ ہوا ہے ہر یکشنبہ کو خط لکھا کرو۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا کہ ہر ہفتے میں ایک بار تم کو خط لکھتا رہوں گا۔ منشی عبداللطیف کو میری دعا کہو اور یہ کہو کہ کیوں صاحب میرٹھ سے کول سے کبھی ہم کو خط نہ لکھا۔ باقی اور سب لڑکوں کو لڑکیوں کو دعا کہدینا۔ بیگم کو خصوصاً ازغالب

[۲۴ ذیقعد ۱۲۷۲ھ] یکشنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۵۶ء۔

(۶۹)

بھائی صاحب!

خط کے نہ پہنچنے کی شکایت کے کیا معنے۔ شنبہ سے جمعہ تک کو ہفتہ گنتا ہوں۔

سواس ہفتہ میں خط بھیج چکا۔ اب کے ہفتہ میں جمعہ تک مجھ کو اختیار ہے۔ کل منگل کو آپ کا خط آ گیا۔ بعینہ یہاں بھی وہی حال ہے جو وہاں ہے۔ وبا کم اور بہت۔ کل سے صورت آفتاب کی نظر آنے لگی وہ اس طرح سے

دیدار مے نمائی و پرہیز مے کنی

نظر آیا اور چھپ گیا۔

تپ کی بڑی شدت ہے۔ دونوں لڑکوں کو تپ آتی ہے۔ بڑے کو اتوار سے کہ آج بدھ چوتھا دن ہے۔ چھوٹے کو پیر سے کہ آج تیسرا دن ہے۔ مغلانی متوفیہ کی جگہ جو مغلانی رکھی گئی تھی وہ تپ زدہ ہو کر سراسیمہ اپنے گھر گئی۔ میرا ایک خدمتگار غلام حسین نام تپ میں بیخود پڑا ہے۔

منشی عبد اللطیف کا یہاں ہونا سن کر جی خوش ہوا۔ میری دعا کہنا۔ اب تو میرٹھ میں بھی وہ شدت نہیں ہے۔

زکیہ بیگم کو دعا کہنا اور میری طرف سے اور اس کی چچا یعنی میری بی بی کی طرف سے پیار کرنا۔ میاں نصیر الدین کو دعا پہنچے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔

غالب۔ چار شنبہ ۲ ماہ اگست سنہ ۱۸۵۶ء [۳۰ ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۲ھ]

(۶۰)

بھائی صاحب!

یکشنبہ کا لکھا ہوا خط پرسوں دوشنبہ کو یہاں پہنچا۔ عزیزوں کی سلامت حال پر خدا کا شکر بجا لایا۔ آج منگل کے دن میں آپ کو خط لکھتا ہوں۔ ہر ہفتہ میں ایک خط لکھوں اور ایک تم لکھو۔ تمہارے واسطے یکشنبہ کی قید ہے میں یکشنبہ کا پابند کیوں رہوں۔ منگل بدھ کو میں بھیجا کروں۔ اتوار کو تم بھیجا کرو۔

یہاں ہوائے وبائی بدستور ہے۔ لوگ مرتے ہیں مگر وہ شدت نہیں۔

یکشنبہ کے دن ابر آیا۔ دن بھر بوندا باندی رہی۔ آدھی رات سے زور کا مینہ برسا۔ پیر کے دن دوپہر تک برابر موسل دھار پانی پڑا۔ کل دوپہر سے مینہ برسنا موقوف ہے۔ ابر موجود ہے۔ میں اور بی بی اور دونوں لڑکے خیر و عافیت سے ہیں۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہاری بی بی کو اور بچوں کو خیر و عافیت سے رکھے۔

میرٹھ کا حال معلوم ہوا۔ پروردگار اپنے بندوں کا حافظ ہے۔

ہاں صاحب تم تفتہ کی خبر نہیں لکھتے آیا وہ وہاں ہیں یا نہیں۔ اب کے یکشنبہ کو جو خط لکھو تو لڑکے بالوں کی خیر و صلاح کے بعد ان کا بھی ذکر خیر لکھو۔ سب کو دعا سلام کہو۔

[۳ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ] سہ شنبہ پنجم اگست ۱۸۵۶ء

(۷۱)

بھائی صاحب کو سلام اور حسن انتمام شادی کی اور مع الخیر معاودت کی مبارکباد۔ ہنسی آتی ہے مگر اکیلا کیا ہنسوں۔ واہ سبحان اللہ۔ کیا دلہن اور کیا اس کی چاہ۔ خدا جیتا رکھے۔ حضرت آپ کا بھائی بن کر میں بھی مثل آپ کے عدیم الفرصت بن گیا۔

بیس بائیس دن سے حضور والا روز دربار کرتے ہیں۔ آٹھ نو بجے جاتا ہوں۔ بارہ بجے آتا ہوں۔ یا روٹی کھانے میں ظہر کی اذان ہوتی ہے یا ہاتھ دھوتے ہیں۔ سب ملازمین کا حال یہی ہے۔ اور کوئی روٹی کھا کر جاتا ہوگا۔ مجھ سے بعد کھانا کھانے کے چلا نہیں جاتا۔ یہ تو جو کچھ تھا سو تھا۔ پرسوں سے ازراہ عنایت حکم دیا ہے کہ شام کو رہتے ہیں لب دریا پتنگ بازی ہوتی ہے۔ تو بھی سلیم گڑھ پر آیا کر۔ خلاصہ یہ کہ صبح کو جاتا ہوں دوپہر کو آتا ہوں۔ کھانا کھا کر پانچ چار گھڑی دم لے کر جاتا ہوں۔ چراغ جلے آتا ہوں۔ بھائی تمہارے سر کی قسم۔ رات کو مزدوروں کی طرح تھک کر پڑ رہتا ہوں۔ آج چوتھے دن تمہارے خط کا جواب لکھنے کی فرصت پائی ہے۔ سو فرصت کیا۔ کھانا کھا کر لیٹا نہیں تم کو خط لکھا۔

میر قاسم علی خاں لکھنؤ سے آئے ہیں۔ کہتے تھے کہ کول میں منشی جی کے مکان پر گیا تھا۔ ان کے آدمی کہتے تھے کہ وہ کل آئیں گے۔ میں نے ان سے کہدیا کہ مجھ کو ان کا خط آیا ہے وہ کول آ گئے اور بیگم کی شادی سے فرصت پائی۔ یقین ہے کہ وہ بھی تم کو خط لکھینگے۔

منشی عبداللطیف کو دعا کہنا اور ان کی میرٹھ کی روانگی کی مجھ کو اطلاع دینا۔ اور جب بیگم آجائے تو اس کے آنے کی بھی خبر لکھنا۔ از اسد۔ روز چارشنبہ ۷ دسمبر ۱۸۵۶ء وقت نماز ظہر۔

[۱۱ ربیع الآخر ۱۲۷۳ھ]

(۷۲)

بھائی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ حال معلوم[1] ہوا۔ میاں کا عذر قبول و مسموع۔ حق تعالیٰ ان کو زندہ و تندرست اور خوش و خرم رکھے اور دولت و اقبال عطا کرے۔ بالفعل مرزا[2] حاتم علی صاحب کا خط آیا۔ انھوں نے جو صورت چھ[3] کتابوں کی آرائش کی جس تفریق سے ٹھیرائی ہے وہ مجھ کو بہت پسند آئی ہے۔ کل میں نے اجازت اسی طرح کی تزئین کی لکھ بھیجی ہے۔ حال تصحیح کا بتصریح آپ کو لکھ چکا ہوں۔ اسی پر عمل رہے۔ میں نے مرزا تفتہ کو کہ وہ غیاث[4] اللغات کے بہت معتقد ہیں اس امر کی اطلاع کر دی ہے۔

بھائی جان میں نے ایک قصیدہ جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے ساٹھ شعر ہیں۔ چھ صفحے یعنی تین ورق پر چھپ کر دستنبو سے پہلے شیرازے میں شامل کر دیے جائیں۔ تو کتاب کو قصیدہ سے عزت اور قصیدہ کو کتاب کے سبب سے شہرت ہو جائیگی۔ کل جناب مرزا صاحب کو لکھ چکا ہوں۔ یقین ہے کہ وہ بھی آپ سے کہیں گے اور آپ اور مرزا صاحب اور مرزا تفتہ اور منشی شیو[5] نرائن صاحب اس خواہش کو منظور اور اس قاعدے کو مقبول کریں گے۔ اور جب باتفاق تم چاروں صاحب پسند کرو گے یا باجلاس کونسل

اس قانون کا اجرا منظور ہو جائے گا اور امیدوار رہوں کہ اجرائے قانون سے پہلے مجھ کو منظوری کی اطلاع ہو جائے تاکہ مسودہ اس قصیدے کا بھیج دوں۔ مہتمم مطبع کو اگر کچھ تامل ہو تو ہو ورنہ بات آسان ہے۔

منشی عبداللطیف کو دعا کہنا اور ان کے عذر کے قبول ہونے کی ان کو اطلاع دینا۔

بیگم کو دعا پہنچے۔ اور سب لڑکے بالوں کو۔ یہاں باقر علی اور حسین علی تم کو بندگی اور اپنے بھائی بہنوں کو علیٰ قدر مراتب بندگی سلام دعا کہتے ہیں۔

ہاں حضرت۔ اب ایک امر مختصر کے واسطے جداگانہ خط مرزا تفتہ کو کیا لکھوں۔ میری طرف سے دعا کہہ کر ان کو کہیے گا کہ اخبار گزشتہ کے اوراق مع خط مہتمم مطبع آفتاب عالمتاب حکیم صاحب کو پہنچ گئے۔ کل وہ چار روپے کی ہنڈوی اور ان کے خط کا جواب روانہ کریں گے۔ آپ چتر بھوج سہائے سے کہہ دیجیے گا اور تاکید کر دیجیے گا۔ کہ چار نمبر سابق کا منتخب کاتب سے نقل کروا کر جلد بھیجیں۔

بھائی مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ ہیں مراسلت گویا مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ الحمد للہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہوتا

چار شنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء۔ جو باتیں جواب طلب ہیں ان کا جواب طلب ہے۔

[۱۳ صفر ۱۲۷۵ھ]

بنام منشی عبداللطیف ابن منشی نبی بخش

(۷۳/۲)

صاحب!

آگے تمہارا ایک خط پھر بارہ کتابوں اور ایک جنتری کا پارسل پہنچا۔ بعد اس کے

کل ایک خط اور آیا۔ ریڈ صاحب کے وہاں آنے کا حال معلوم ہوا۔ آج ۶ دسمبر کی ہے ۷ کو بموجب تمہارے لکھنے کے وہ وہاں سے جانے والے ہیں۔ اور مجھ کو معلوم ہے کہ میرٹھ آئیں گے۔ دو دن کے بعد بمقام میرٹھ خط روانہ کرونگا۔ خاطر جمع رکھو۔ وہ صاحب مہر جلیا لکھیں مجھ کو اطلاع دینا۔ رہی تمہاری مہر۔ اس کا کچھ خیال نہ کرو۔ وہ جس طرح تم نے لکھا ہے بن جائے گی۔ مگر بھائی ۵۸ھ میں دن کے باقی رہے ہیں۔ آج ۶ دسمبر کی ہے۔ ۲۴، ۲۵ دن باقی ہیں۔ ۵۹ میں جنوری کے مہینے میں خدا چاہے تو کھد جائے گی۔ تم میرے بجائے فرزند ہو۔ میرے بھتیجے ہو۔ جو تمہارا کام ہو بے تکلف کہو۔ شرم کیا اور تکلف کیوں یہ مہر کا کھدنا کون سا کام ہے۔

مرزا حاتم علی صاحب ملیں تو میرا سلام کہنا اور مرزا تفتہ کو خط لکھو تو میری سفارش لکھنا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ اور خط نہیں لکھتے۔

[دوشنبہ ۲۹ ربیع الآخر ۱۲۷۵ھ] غالب ۶ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۴۷)

بھائی! میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ آج میرے پاس لکھنؤ کے ایک پارسل کی رسید آگئی۔ دوسرا ابھی یقینی پہنچ گیا ہوگا۔ خاطر جمع رکھو۔ جناب آرنلڈ صاحب بہادر آج تشریف لے گئے۔ سنتا ہوں کہ کلکتے جائیں گے۔ میم اور بچوں کو ولایت بھیجکر پھر آئیں گے۔ مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں۔ کہ قیامت تک ان کا شکر گزار رہوں گا۔ مرزا حاتم علی صاحب مہر اگر آجائیں تو ان کو میرا سلام کہنا۔ مرزا تفتہ کو اگر کبھی خط لکھو تو میری دعا کہنا۔

از غالب مرقومہ دوشنبہ ہفدہم جنوری ۱۸۵۹ء

[۱۲ جمادی الآخر ۱۲۷۵ھ]

# حواشی

خط نمبر (۱)

(۱) ترجمہ:-

جو کچھ غالب ناکام پر گذری وہ کہنے کے قابل نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس بندہ کا کوئی خدا نہ تھا۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فکر گواہ ہے اور مشاہدہ شاہد کہ کانٹ چھانٹ آرائش کے لئے ہے اور صفائی نمائش کی خاطر۔ سرو کو جب آراستہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی کانٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ اور شراب کو پیمانوں میں الٹنے سے پہلے چھان لیتے ہیں۔ بانس کے ٹکڑوں کو جب تک کانٹ کانٹ کر چھوٹا نہ کریں اسے تراش کر قلم نہیں بنا سکتے۔ جب تک کاغذ کے ٹکڑے نہ کریں اس کا نام خط نہیں رکھ سکتے۔ اس کارگاہ تعمیر و تخریب میں کوئی تعمیر تخریب کے بغیر نہیں اور کوئی تخریب تعمیر کے بغیر نہیں۔

مجھے مٹی سے پیدا کیا اور آسمان پر اٹھا لے گئے اور کچھ عرصہ تک میرے اس مرتبہ کی نگہداشت رکھی۔ اور اس مرتبہ پر قائم رکھا۔ بعد ازیں زمین پر دے مارا۔ اور میرا پیکر زمین پر ایک ایسا نقش بن کر رہ گیا جیسے کسی نشتر کی تیز نوک اس خاک (یعنی عالم وجود) سے اٹھا نہیں سکتی۔ گویا مجھے امر عالم تخریب و تعمیر میں جو ناگہاں وجود میں آئی لے گئے۔ اور میری جگہ ایک خستہ کو وجود میں لے آئے۔ جو مرگ و زندگی اور ہنسنے رونے میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔ یارب یہ پیکر (صورت انسانی) جو خاک پر نقش ہو گیا اور یہ نقش جو اس پیکر کی وجہ سے خاک میں بیٹھ گیا ممکن ہے کہ عنقریب روئے زمین سے زیر زمین چلا جائے۔

ان دنوں جب میں ظلم کی قید سے چھٹ گیا ہوں اور غم کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہوں سخنور جادو بیان وازخود رفتہ منشی ہرگوپال تفتہ کا خیال آ گیا۔ میں نے سنا کہ وہ کرم فرما جو وطن گئے ہوئے تھے آپ کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ نے خط میں اس کا ذکر نہ کیا۔ البتہ میری اور تفتہ کی مجالست و گفتگو کو میری اور اپنی مجالست و گفتگو جانا ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔

کل رات شہزادگان تیموریہ میں سے ایک نے مشاعرہ منعقد کیا تھا اور شعرا کو غزلخوانی کی دعوت دی تھی۔ اگرچہ میں نے اس میں بہت دل لگایا لیکن طبیعت ریختہ کہنے پر مائل نہ ہوئی۔ لیکن اس روز جس کی رات کو مجھے اس انجمن میں شرکت کرنی تھی تو خاص اس وقت جب میں سواری میں جا رہا تھا۔ چند شعر خود بخود دل غمزدہ سے نکل آئے۔ چنانچہ ان اشعار کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ اس زمین میں غزل

کہہ کر مجھے بھجدیں۔

(۲) مرزا اسیری کے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ بند ستم سے تو رہائی ہوگئی لیکن رسوائی کے غم میں مبتلا ہوں۔ مرزا کو رہا ہوئے زیادہ سے زیادہ تین چار ماہ ہوئے ہوں گے۔

(۳) مرزا غالب کے خطوط کی مدد سے قلعے کے جن مشاعروں کا پتہ چلتا ہے ان میں سب سے پہلا یہی مشاعرہ ہے۔ اس کا مصرعہ طرح کیا تھا اور شہزادگان تیموریہ میں سے یہ شہزادے کون سے تھے۔ اس کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

خط نمبر (۲)

(۱) میاں نسیم اللہ۔ حکیم امام الدین خاں صاحب سے طب پڑھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حکیم نسیم اللہ خاں کے نام سے یاد کیے جانے لگے۔

حکیم صاحب علیگڑھ میں محکمہ فوجداری میں ملازم ہوگئے تھے۔ ایک بار دہلی آئے تو منشی نبی بخش حقیر نے ان کے ہاتھ مرزا کے پاس پھل کے مربہ اور اچار کی فرمائش بھیجی۔ لیکن مربہ مرزا کے ہاتھ نہ لگا اور تمام کیفیت حکیم صاحب کو بتا دی۔ لیکن خدا جانے کیا بات ہوئی کہ جب تک مرزا صاحب نے خود منشی نبی بخش کو یہ سارا واقعہ نہ لکھا حکیم صاحب نے اس کا ذکر نہ کیا۔ ان کے مراسم تفتہ سے بھی تھے۔

(۲) حکیم امام الدین خاں۔ آخری دور کے نامی طبیبوں میں سے تھے۔ نواب فرخ آباد کے خاص طبیب تھے لیکن جب اپریل ۱۸۴۶ء میں نواب زینت محل بیمار ہوئیں تو گورنر جنرل کی ہدایت کے بموجب انھیں فرخ آباد سے بلوایا گیا اور یکم مئی ۱۸۴۶ء کو ملاحظۂ شاہی میں پیش ہوئے۔ اتفاق کی

بات ہے کہ مئی کے پہلے ہفتہ میں نواب فرخ آباد بیمار ہو گئے۔ انھوں نے حکیم صاحب کو واپس بلانے کی درخواست کی۔ بہادر شاہ نے جواب میں لکھوا دیا "حکیم صاحب نواب زینت محل کے معالجہ میں مصروف ہیں اس لئے اگر انھیں رخصت کر دیا جائے گا تو بیگم صاحبہ کے علاج میں مشکل واقع ہو جائے گی۔" بیگم صاحبہ ۲۲ر مئی ۱۸۴۶ء تک تندرست ہو گئی تھیں اور حکیم صاحب بھی نواب فرخ آباد کے معالجہ کے لئے رخصت ہونا چاہتے تھے۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ انھیں جانے کی اجازت دی گئی یا نہیں لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں شاہی طبیبوں میں شامل کر لیا گیا تھا اور والیان ریاست بالعموم انھیں علاج کے لئے بلایا کرتے تھے۔

مرزا غالب شاہی ملازمت سے پہلے ان ہی سے رجوع کیا کرتے تھے لیکن جب حکیم احسن اللہ خاں کی عنایتیں ان کے حال پر روزافزوں ہوتی گئیں تو ان سے رجوع کرنا چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب ۱۸۶۲ء میں ٹونک میں مقیم تھے۔ ۱۲۸۱ھ میں انتقال کیا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں نے تاریخ کہی ہے

در جنت رفت چوں امام الدین خاں

تاریخ وفات ہم ازاں گشت عیاں

(۳) مولوی صدر الدین خاں آزردہ۔ اس دور کے بہت بڑے صاحب فضل و کمال اور غیر معمولی جامعیت کے بزرگ تھے۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ریزیڈنٹ بادشاہ اور امراء کے اصرار پر صدر الصدور کا عہدہ قبول فرمایا۔ جامع مسجد کے قریب ایک درسگاہ "دار البقا" کے نام سے قائم کر رکھی تھی جہاں دور

دور سے طلبا تحصیلِ علم کی خاطر آیا کرتے تھے۔ اکثر طلبا کے لباس وطعام کے کفیل خود مفتی صاحب ہوتے تھے۔

مفتی صاحب کا دیوانخانہ دہلی کے منتخب امرا کا مرکز تھا ہر موسم میں ہر شب کو یہ بزم منعقد ہوتی اور ہر فن کے اکابر وہاں موجود ہوتے۔ اگر کوئی شخص دہلی کے فضل وکمال کو ایک وقت میں دیکھنا چاہتا تو مفتی صاحب کے دیوانخانے میں چلا جاتا۔

غدر میں دوسرے علمار کی طرح مفتی صاحب کو بھی جہاد کے فتوے پر دستخط کرنے کیلئے مجبور کیا گیا۔ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ناچار عام رواج کی طرح دستخط کے نیچے لکھدیا "کتبت بالجبر" یعنی بالجبر پر نقطہ نہ لگائے۔ غدر کے بعد پوچھ گچھ ہوئی تو مفتی صاحب نے کہا کہ بے شک میں نے دستخط کیے اس لئے کہ مجبور تھا جیسا کہ دستخط کے نیچے لکھ چکا ہوں کہ کتبت بالجبر (یعنی میں نے بحالت مجبوری دستخط کیے) با ایں ہمہ انکی جائیداد ضبط ہو گئی۔ بعد میں کچھ حصہ بحال ہوا جس سے صرف چالیس روپے ماہانہ آمدنی ہوتی تھی۔ چونکہ امام بخش کی اولاد کے بھی وہی کفیل تھے۔ اس لئے آخری ایام بڑی عسرت میں گزرے۔

آزردہ شعر بھی اچھے کہتے تھے۔ فارسی کلام میں بھی دسترس تھی۔ مرزا غالب بھی انھیں سخن فہم مانتے تھے اور اپنے فارسی کلام کی خاطر خواہ داد پاتے تھے۔ مشاعرہ میں انکی موجودگی مرزا کی تسکین کا باعث ہوتی۔ آزردہ نے جو مرثیہ دہلی لکھا ہے اس میں دہلی کی تباہی کا بڑا المناک مرقع کھینچا ہے۔

۱۱ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو ان پر فالج گرا ۱۵ر جولائی ۱۸۶۸ء کو انتقال کیا۔

خط نمبر (۳۱)

(۱) مرزا غالب نے منشی نبی بخش حقیر کے لئے مندرجہ ذیل نسخہ تجویز کیا تھا:-
"ایک نسخہ" طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور بہت بے ضرر اور بہت سود مند ہے۔ مگر اس کا اثر دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ سات سیر پانی لیویں اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملادیں اور اس کو جوش کریں، اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں اور جب باسی ہو جاوے اس کو پئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں کھائیں، پانی دن رات جب پیاس لگے یہی پئیں۔ تبرید کی حاجت پڑے۔ اسی سے پئیں۔ روز جوش کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا اسلام کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا۔ آگے ان کو اختیار رہے۔"

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۸۳)

(۲) منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے فارسی دیوان کی تقریظ مرزا غالب سے لکھوائی تھی جو کلیات نثر فارسی (حقیقی آہنگ) میں موجود ہے۔ منشی صاحب نے شکایت کی تھی کہ مدح کم ہے۔ مرزا جواباً تحریر کرتے ہیں:-
"مہاراج! آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہرحال مجھکو کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں اپنا دعاگو سمجھتے رہو۔ کیا کروں۔ اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرہ

کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین حیا تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ "دیوان حافظ" کی بموجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ، اگر کسی شاہزادہ یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر، تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا۔ اس سے زیادہ بکنی میری روش نہیں۔"

دیباچہ میں مدحیہ فقرے اس طرح درج ہیں:-

"یارب این سخن پیوند دانشمند در فن فرزانگی یگانہ و در آئین یگانگی آسمان سخن را ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ کو این فہرست گنج خانہ راز رقم کردۂ اوست۔" "و این مجموعۂ سوز و گداز فراہم آوردۂ او چہ مایہ دیدہ و دل باہم آمیختہ باشد تا این نقش بدیع انگیختہ باشد۔"

(کلیات نثر غالب صفحہ ۱۶۳)

(۳) یہ دونوں شعر اس قصیدے کے ہیں جو مرزا غالب نے میر نظام الدین ممنون کے ایک مشاعرہ میں پڑھا تھا۔ یہ مشاعرہ شاہ صاحب کے پرانے مدرسہ میں ہوا کرتا تھا۔ حاضرین پر اس قصیدہ سے اتنی رقت طاری ہوئی کہ بزم مشاعرہ مجلس عزا بن گئی۔ اسے اعجاز سخن کہیے یا اتفاق کہ اسی وقت بارش بھی ہونے لگی اور عجیب سماں بندھ گیا۔ مفتی صدر الدین خاں

آزردہ بھی شریک بزم تھے۔ مرزا جب قصیدہ پڑھ چکے تو مفتی صاحب نے کہا "دو آسماں ہم گریست"

اس قصیدہ کی داد مرزا کو بصرہ کے عربی و عجمی حضرات سے بھی حاصل ہوئی۔ سید اکبر مرزا نے بصرہ کی ایک بزم عزا میں اس قصیدہ کے چند اشعار پڑھ دیئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ چند ہی اشعار سے خوب رقت ہوئی۔ اس بزم عزا کے شرکا میں عرب، عجم اور ہندی سب ہی موجود تھے۔ بہت داد ملی۔ اور خاص طور پر اس شعر کی بہت تعریف کی گئی۔ ؎

مزد شفاعت و صلۂ صبر و خوں بہا
ہیچ از کسے نخواستہ الا گریستن

مرزا دبیر کو بھی یہ شعر بہت پسند تھا اور انھوں نے اس پر مصرعے بھی لگائے تھے۔ لیکن پسند نہ آئے اور کہا کہ جس مرتبہ کا یہ شعر ہے ویسے مصرعہ نہیں لگ سکے۔

اس قصیدہ کے دیگر رقت انگیز اشعار یہ ہیں: ؎

رشک آیدم بہ ابر کہ در عہد بعد اوست
بر خاک کربلائے معلےٰ گریستن

رفت انچہ رفت بایدم اکنوں نگاہ داشتن
از بہر نور دیدۂ زہرا گریستن

گویند چشم روشنی دیدہ ماہ و مہر
نازد بہ ماتم شہ والا گریستن

پاس ادب نخواست کز اعجاز دم زند
بر مرگ شاہ داشت مسیحا گریستن

با خاکیاں بجنگم و ز افلاکیاں بہ رشک
خواہم بر آستانِ تو تنہا گریستن

(کلیات نظم فارسی صفحہ ۱۹۳)

خط نمبر (۴)

(۱) اغلب ہے یہ ملال واقعۂ اسیری کا نتیجہ ہو۔ جس کے متعلق مرزا نے تفتہ کو بھی لکھا تھا۔

"سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔"

خط نمبر (۵)

(۱) شیخ وزیر الدین۔ ان کے دادا مرزا کے دوست تھے۔ مالی حالت خراب تھی۔ ملازمت کے لئے کوشاں تھے۔ مرزا نے از راہِ ہمدردی منشی نبی بخش حقیر کو علیگڈھ لکھا کہ شیخ جی کو اپنا نیا زمند سمجھو۔ حتی الوسع خیال دوڑاؤ اور گنجائش نکالو۔ ان پر احسان مجھ پر احسان ہوگا۔ شیخ کا دہلی سے علیگڈھ اور علیگڈھ سے دہلی برابر آنا جانا رہا۔ بڑے خوش اوقات آدمی تھے۔

(۲) جانی بانکے رائے کے توسل سے تفتہ ریاست جے پور کے بندوبست سرکاری میں ملازم ہو گئے تھے۔

(۳) بابو ہر گوبند سنگھ۔ مولوی نجف علی صاحب کے شاگرد اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر سے بھی ان کے اچھے مراسم تھے۔ علیگڈھ اور اکبر آباد اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ تفتہ نے

انھیں جانی بانکے رائے سے بھی ملا دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جائیداد پر کسی نے بے جا تصرف کر لیا تھا۔ غالب نے خطوط میں ان کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔

خط نمبر (۶)

(۱) جانی بانکے رائے۔ اجمیر کے بندوبست سرکاری میں وکیل تھے تفتہ کے خطوط میں بھی ان کا ذکر ہے۔ مرزا کے ایک انگریز دوست جارج جوزف تھے۔ انہی کے ہاں ۱۸۵۱ء میں جانی بانکے رائے سے ملاقات ہوئی۔ لیکن یہ ملاقات بالکل سرسری سی تھی اور مرزا اُن کی سخن فہمی کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔ ان دنوں تاریخ تیموریہ کا پہلا حصہ یعنی "مہر نیمروز" زیر تصنیف تھا۔ مرزا جو کچھ لکھتے اس کی نقل کاتب سے کروا کر منشی نبی بخش کو بھیج دیتے۔ باہمی مراسم کے بڑھنے کی تقریب مرزا کی یہی فارسی نثر تھی۔ جانی جی کا تفتہ پر یہ احسان تھا کہ انھیں والئی جے پور کی سرکار میں ملازم رکھوا دیا تھا تفتہ نے حقیر سے ان کا تعارف کرایا۔ جانی جی کو جب علم ہوا کہ منشی صاحب کے پاس مرزا کی نثر ہے تو اس نثر کو منگوالیا۔ اس وقت تک غالب سے راہ و رسم پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن بعد میں انھوں نے چند اشعار اصلاح کے لئے بھیجے تو تعلقات بہت دوستانہ ہو گئے۔ اور غالب مہر نیمروز کے مسودے کی ایک نقل جانی جی کے لئے بھی کرانے لگے۔

اس تعلق کی ابتدا اگرچہ تفتہ کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن بعد میں کسی معاملہ پر جانی جی اور تفتہ میں رنجش پیدا ہو گئی اور نوبت ایک دوسرے سے علیحدگی تک پہنچی۔ تاہم غالب کے ساتھ جانی جی کا واسطہ بدستور قائم رہا۔ ان ہی کے ایما پر مرزا نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ

بہت تکلف سے لکھوایا اور ان ہی کی وساطت سے مہاراجہ جیپور کی خدمت میں پیش کیا۔ وہاں سے جو رقمیں ملیں وہ بھی جانی جی ہی کی وساطت سے ملیں۔

۱۸۵۴ء کے بعد جانی جی کے مفصل حالات کا پتہ نہیں چلا۔ البتہ ۳۰ جنوری ۱۸۵۵ء کو مرزا نے جو خط سید بدرالدین احمد المعروف بہ فقیر المتخلص بہ کاشف کو لکھا ہے اس میں ان کی ناسازی مزاج اور ان کے داماد کے انتقال پر اظہار افسوس کیا ہے۔ اس خط کے بعد انکا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لکھتے ہیں:۔

"بابو صاحب کے واسطے میرا دل بہت جلا۔ زمانہ ان دنوں میں ان سے بر سر امتحان ہے۔ پروردگار ان کو سلامت رکھے اور صبر و شکیب عطا کرے۔ علاقۂ مساعدت روزگار کی وہ صورت، شدائدِ رنج سفر کی وہ حالت، ناسازگاری مزاج کا وہ رنگ، ان سب باتوں سے علاوہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ جوان داماد مر جاوے اور بیٹی بیوہ ہو جاوے۔ مرگ و زیست کا سر رشتہ خدا کے ہاتھ ہے۔ آدمی کیا کرے۔ دل پر میرے جو گزری ہے وہ میرا دل جانتا ہے۔ ہاں بحسب ظاہر تعزیت نامہ لکھنا چاہیے۔ حیران ہوں کہ اگر خط لکھوں تو کس پتہ سے لکھوں؟ ناچار ابھی تأمل ہے۔ جب وہ بھرتپور آجائیں تو آپ انکے آنے کی مجھ کو اطلاع دیجیے گا کچھ لکھ بھیجوں گا۔"

(۲) غالب نے ماہ بماہ تنخواہ کے لئے منظوم التجا کی۔ یہ قطعۂ "گزارش مصنف بحضور شاہ" کے عنوان سے دیوان میں موجود ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے۔

اے شہنشاہِ آسمان اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیٔ بازار

. . . . . . . . . . . . . . . .

خط نمبر (۸)

(۱) خواجہ صاحب کی درگاہ یعنی حضرت نظام الدین کی درگاہ۔ آپکے والد احمد بن دانیال غزنی سے ہندوستان آئے ۱۲۳۸ء میں پیدا ہوئے پچیس برس کی عمر میں دہلی آئے۔ یہیں تحصیل علم کیا اور اتنا ریاض کیا کہ ولی اللہ مانے گئے۔ آپکا نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔

آپ کا مقبرہ دہلی سے تین میل کے فاصلے پر جنوب کی سمت واقع ہے۔ لاکھوں مسلمان اب بھی حضرت کے معتقد ہیں۔ بہادر شاہ بھی معتقد تھے اور ان کی درگاہ میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ہر سال ربیع الثانی کی سترہویں تاریخ کو یہاں بہت بڑا میلہ ہوتا تھا جسے سترھویں کہتے تھے بہادر شاہ اسی سترھویں کے میلے میں گئے ہوں گے۔

(۲) جانی بانکے رائے نے منشی نبی بخش حقیر کے پاس سے مرزا غالب کی زیر تصنیف کتاب "پرتوستان" کے کچھ اجزا منگوائے تھے۔ یہ اشارہ انہی اجزا کی جانب ہے۔

خط نمبر (۹)

(۱) علی بخش خاں رنجور: نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بیٹے اور مرزا کے سبی بھائی تھے۔ عمر میں مرزا سے چار سال چھوٹے تھے۔ نواب احمد بخش خاں ان کے کفیل تھے اور جب تک نواب صاحب موصوف زندہ رہے انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوئی لیکن ان کے عیش اپنے چچا کے دم کے ساتھ ختم ہو گئے۔ غالب کو کلکتے کے سفر میں نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی خبر ملی تو ان کی طرف سے بڑے فکرمند ہوئے۔

علی بخش رنجور کو فیروز پور جھرکہ کی ریاست سے دو سو روپے ماہوار ملتا تھا لیکن نواب شمس الدین خاں گدّی پر بیٹھے تو نظام ریاست ابتر ہو گیا۔ آخر علی بخش خاں نے وطن ترک کیا اور کچھ عرصہ تک لکھنؤ اور جے پور میں مارے مارے پھرے۔ ۱۲۵۱ھ میں جب ریاست ضبط ہو گئی تو سرکار انگریزی کی طرف سے پچاس روپے مہینہ مقرر ہوا جو آخر دم تک ملتا رہا۔ البتہ غدر کے ہنگامہ کی وجہ سے ۲۲ مہینے بالکل نہ ملا لیکن فروری ۱۸۵۹ء میں ۱۱۰۰ روپے میں سے ۶۰۰ مل گئے تھے۔ ممکن ہے بقایا بھی مل گئے ہوں۔

۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) میں انگریزوں نے جب بھرت پور پر لشکر کشی کی تو علی بخش رنجور اور مرزا بھی نواب احمد بخش کے دستے کے ساتھ تھے اور ایک ہی خیمے میں اترے ہوئے تھے۔ انھیں کی درخواست پر غالب نے پنج آہنگ لکھنی شروع کی۔

بقول غالب سخن طرازی اور کذب و گزاف میں ضرب المثل تھے ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو بوقت ۲ بجے صبح انتقال کیا۔

(۲) طرہ باز خاں۔ غالب کے ایک دوست جن کے مفصل حالات

معلوم نہ ہو سکے۔

(۳۳) نواب زین العابدین خاں عارف، حسین علی خاں شاداں، و باقر علی خاں کامل۔

نواب زین العابدین خاں عارف۔ شرف الدولہ سہراب جنگ نواب غلام حسین خاں مسرور کے بیٹے تھے۔ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کے تعلقات اپنے شوہر سے اچھے نہ رہتے تھے۔ اس لئے انھیں سات ہزار کی ملکیت کا مکان دے کر علیحدہ کر دیا تھا۔ چنانچہ عارف کو ان کی والدہ بنیادی بیگم نے پالا پوسا اور اس زمانے کے ماحول کے مطابق اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم دلائی۔ انھیں سرکار انگلشیہ سے ڈھائی سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اکیس سال کی عمر میں فخر الدولہ رستم جنگ نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکہ کی لڑکی نواب بیگم سے شادی ہوئی اور ڈھائی سو روپے ماہانہ اس ریاست سے بھی ملنے لگا جو تا زیست ملتا رہا۔ نواب بیگم کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۸۱۹ء میں شادی کے دو سال بعد انتقال کیا۔ عارف کی دوسری شادی دہلی کے ایک شریف خاندان میں مرزا محمد علی کی صاحبزادی بستی بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے باقر علی خاں اور حسین علی خاں پیدا ہوئے۔

مرزا کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے لیکن ان میں سے کوئی سوا سال سے زیادہ نہ جیا۔ آخر مرزا نے عارف کو اپنا بیٹا بنا لیا۔

عارف شروع شروع میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر غالب کے شاگرد ہو گئے۔ خمخانۂ جاوید، آثار الصنادید، تذکرہ گلستان سخن اور تذکرہ شعرائے ہند میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ آثار الصنادید

ہیں سرسید مرحوم نے شاید حق دوستی ادا کیا ہے اور کافی مبالغہ سے کام لیا ہے۔

ایلگزینڈر ہیدرلے، ظہیرؔ، انورؔ اور نواب مرزا خاں داغؔ، عارفؔ کے شاگردوں میں سے تھے۔ داغ کی قسمت چمکی تو قلعہ معلی تک رسائی ہو گئی۔ صاحب عالم فتح الملک عرف مرزا فخرو داغؔ کے سرپرست بن گئے۔ انھوں نے داغؔ کا کلام پسند کیا اور ذوق کا شاگرد کرا دیا۔ ذوق نے ان کا تخلص مرزا سے بدل کر داغؔ رکھدیا۔

غالب کو عارف سے جو محبت تھی اس کا باعث قرابت داری ہی نہیں تھی بلکہ عارف کی جودت طبع اور ذہن رسا نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ بہت پرگو شاعر تھے۔ مرزا نے عارف کی خوش فکری اور گہری محبت کے اظہار میں جو قطعہ فارسی لکھا اس میں اردو کو اپنی زبان قرار دیا ہے فرماتے ہیں :—

آں پسندیدہ خوئے عارفؔ نام
کہ ز خشش شمع دودمانِ منست

جاوداں باش اے کہ در گیتی
سخنت عمر جاودانِ منست

جائے دارد کہ خویش را نازم
کہ فلانے ز پیروانِ منست

اے کہ میراث خوار من باشی
اندر اردو کہ آں زبان منست

از معانی ز مبداء فیاض
یاد آنِ تو ہر چہ آنِ منست

مرزا کے اردو مکاتیب میں عارف کا تذکرہ بہت کم ہے اور وہ بھی باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے ضمن میں ہے مثلاً تفتہ کے ایک خط میں اس طرح ذکر آیا ہے:

"سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں عارف مرحوم میرا فرزند تھا۔ اب اس کے دونوں بچے میرے پوتے ہوتے ہیں۔ میرے پاس آتے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں۔ میں تحمل کرتا ہوں۔"

ان خطوط سے عارف اور ان کی دوسری بیوی بستی بیگم عرف نواب دلہن کی بیماری کی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت ان دونوں کی ۱۸۵۱ء کی بیماری کا حال ہے۔ دونوں کے امراض مہلک تھے اور کم از کم وقتی طور پر دونوں کو افاقہ ہو گیا تھا۔ مرزا لکھتے ہیں:

"کیا پوچھتے ہو زین العابدین خاں کا حال اور کیا کہوں اس کی بی بی کا حال۔ پہلے اس کی حقیقت سنو۔ بھائی اس کو ناگاہ رعاف ہوا۔ رعاف میں ناک سے لہو آتا ہے مگر اس کو منہ سے لہو آیا۔ ناک سے تھوڑا تھوڑا اور منہ کا کیا حال تھا گویا مشک کا دہانہ کھول دیا ہے۔ ایک ہفتہ میں خدا جھوٹ نہ بلوائے آٹھ دس سیر خون نکلا۔ سیاہ اور بدبودار توقع جینے کی باقی نہ رہی اور سب ناامید ہو گئے۔ بارے خدا نے بچالیا بچ گیا اس کو تصور کیجیے کہ تھا کیا۔ صرف استخوان و پوست رکھتا تھا۔ اب سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ اگرچہ ہنوز صاحب فراش ہے اور چلنا پھرنا تو کہاں پلنگ پر سے اٹھ بھی نہیں سکتا مگر بیم ہلاک نہیں ہے۔

اس کی بی بی کا حال سنیے تین مہینے سے تپ اور کھانسی میں گرفتار ہے۔ خدا اس پر اور اس کے بچوں پر رحم کرے اور اس کو بچالے۔ میں کچھ

نہیں کہہ سکتا۔ مگر یوں سمجھو کہ اگر یہ بچ جائے تو گویا مردہ جیا۔"

اس کے بعد زین العابدین اور اس کی بیوی کی افاقت کی یوں اطلاع دیتے ہیں:

"زین العابدین خاں اچھا ہے بی بی بھی اس کی فرصت پاتی چلی ہے۔ مرض کی صورت خطرناک نہیں رہی۔ خدا چاہے تو صحت ہو جائے۔"

جنوری ۱۸۵۲ء میں بستی بیگم کا درد گردہ سے انتقال ہو گیا۔ عارف کو اس سانحہ کا بے حد صدمہ ہوا۔ ایک روز جو صبح بیدار ہوئے تو طبیعت پر مالش تھی۔ تھوڑی دیر بعد خون کا استفراغ ہوا۔ پھر تو یہ سلسلہ بندھ گیا۔ شہر کے نامی گرامی اطبا معالجہ کو موجود تھے لیکن کسی کی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ تیسرے روز کی سحر پیغام اجل لائی۔ مرزا غالب وقت رحلت موجود تھے۔ شاگرد نے اپنے استاد پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور یہ شعر کہہ کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں اور سب کو روتا چھوڑ گئے ؎

آنکھوں میں دم ہے مثل چراغ سحر ہوں میں
لَو لگ رہی ہے جان کو کیا اختیار ہے

مرزا نے ان کی وفات پر جو اندوہناک مرثیہ لکھا ہے وہ اردو زبان کی اعلیٰ ترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مرثیہ کا یہ شعر کسے یاد نہیں ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں نے عارف کی اہلیہ کی وفات پر ایک اندوہگیں نامہ فارسی میں لکھا تھا جو کسی وجہ سے انکی کلیات

موسوم بہ "صحیفۂ زریں" میں شامل نہ ہو سکا۔ اس فارسی نثر کا آخری حصہ خاص طور پر بے حد دردناک ہے۔

عارف کی کلیات ان کی حیات میں مرتب ہو چکی تھی لیکن کسی وجہ سے اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔ ان کے دیوان کا ایک نسخہ میرے پاس محفوظ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

مانا یہ ناصحا کہ نہ اس سے ملا کریں
بہتر تو ہاں یہی ہے مگر دل کو کیا کریں

ہے عاشقوں کو ننگ تمنائے سلطنت
کیوں آرزوئے سایۂ بال ہما کریں

خوبی ہے ضبط دل کی کہ آنکھ نہیں نم نہیں
روؤں اگر تو خون کے دریا بہا کریں

رتبہ ہمارے جد کا فرشتوں سے پوچھئے
کیا اپنے خانداں کا بیاں سلسلہ کریں

---

دیارِ عشق میں تیرا گزر ہووے تو میں جانوں
اگر سر تک بھی جا کر راہ سر ہووے تو میں جانوں

مر اگریہ بہا دیتا ہے ہر اک بات کو میری ..
بس ان باتوں سے اس کے دل میں گھر ہووے تو میں جانوں

گزر کر جان سے اپنی قدم رکھ راہِ وحشت میں
اگر پھر عمر بھر تجھ کو خطر ہووے تو میں جانوں

لب ساحل کرے مذکور کوئی میری ناکامی
صدف میں قطرۂ نیساں گہر ہووے تو میں جانوں

...........................................

ہر چند کہ اب مجھ سے ستم اٹھ نہیں سکتا
لیکن ترے کوچہ سے قدم اٹھ نہیں سکتا
عالم میں لٹاتے ہو بڑی حسن کی دولت
میری ہی طرف دست کرم اُٹھ نہیں سکتا
کیا ضعف نے شرمندہ کیا صبر کے آگے
فرقت میں تری بار الم اٹھ نہیں سکتا

...........................................

**باقر علی خاں اور حسین علی خاں :-** زین العابدین خاں عارف کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام باقر علی خاں اور چھوٹے کا نام حسین علی خاں تھا۔ عارف کے انتقال پر مرزا اور ان کی بیوی حسین علی خاں کو بیٹا بنا کر اپنے گھر لے آئے۔ اور صرف باقر علی خاں کا بار بنیادی بیگم پر رہا۔ لیکن جب بنیادی بیگم کا بھی انتقال ہو گیا تو یہ بھی غالب کے ہاں آ گئے۔

مالی مشکلات کی وجہ سے غالب باقر علی خاں کے آنے پر بہت دل تنگ نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اس تحریر سے ظاہر ہے:

"تم کو خبر دیتا ہوں کہ زین العابدین خاں کی ماں یعنی دادی حسین علی خاں کی پنجشنبہ کے دن ۲۸ر رمضان کو مر گئی۔ زین العابدین کا بڑا بیٹا باقر علی خاں وہ بھی میرے پاس آ گیا۔ دیکھتے ہو بھائی۔ چرخ ستمگر

کیا شعبدہ بازی کر رہا ہے۔ بوجھ پر بوجھ مجھ پر ڈال رہا ہے۔ زخم پر زخم مجھ پر لگا رہا ہے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ مصارف بڑھ گئے۔ اگر مثلاً بے مروتی اور خدا ناترسی کر دوں تو کہیئے ان لڑکوں کو کس سے کہوں کہ تو اپنے لڑکوں کو سنبھال۔ مجھ میں مقدور نہیں۔ بہرحال چپ ہوں۔ اور متحیر ہوں خدا میری شرم رکھے۔

مرزا خود بڑے نازک مزاج تھے پھر بھی دونوں بچوں کے ناز اٹھاتے اور حسین علی خاں سے تو بہت ہی محبت کرتے تھے۔

ستمبر ۱۸۵۴ء میں جب دہلی میں بخار پھیلا تو مرزا کے گھر کے لوگ بھی بیمار ہو گئے لیکن حسین علی خاں بچے رہے۔ اس پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تمہاری بھابی یعنی میری بی بی اور حسین علی خاں کی پالنے والی کہ وہ گھر کی مدارالمہام ہے۔ بیمار۔ مزہ یہ کہ ان دونوں کا روز نوبت ایک ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ حسین علی اچھا ہے۔ آپ کو بندگی کہتا ہے اور اپنی بہن کو سلام اور اپنی چچی کو آداب۔"

لیکن چند روز بعد حسین علی کو بھی بخار آ گیا۔ مرزا کو اس کی طرف سے جتنی فکر ہوئی اس کا اس تحریر سے اندازہ لگائیے:-

"مجھ کو دیکھو۔ غم زدہ و بزہ بخبر۔ کہاں زین العابدین اور اس کی بیوی مرے اور دو بچے چھوڑ جائے اور ان میں سے ایک میں لے لوں۔ مختصر کہتا ہوں۔ آج تیرھواں دن ہے کہ حسین علی نے آنکھ نہیں کھولی۔ دن رات تپ اور غفلت اور بے خودی۔ کل بارھویں دن مسہل دیا تھا۔ چار دست آئے۔ مدار دو چار بار دوا اور ایک دو بار آش جو پر ہے۔

انجام اچھا نظر نہیں آتا دادی اس کی بیمار۔ روز دوپہر کو لرزہ چڑھتا ہے۔ آخر روز فرصت ہو جاتی ہے۔ ظہر قضا اور عصر وقت پر پڑھ لیتی ہے۔ تماشا یہ کہ تاریخ دونوں کے تپ کی ایک ہے۔ بھائی بی بی کی تو اتنی فکر نہیں لیکن حسین علی کی بیماری نے مار ڈالا۔ میں اس کو بہت چاہتا ہوں۔ خدا اس کو بچالے اور میں اس کو دنیا میں چھوڑ جاؤں۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے میں نے آگے تم کو نہیں لکھا۔ یہاں بڑی بیماری پھیل رہی ہے اور کوئی بیماری نہیں تپیں ہیں رنگا رنگ۔ بیشتر باری کی یعنی اگر گھر میں دس آدمی ہیں تو چھ بیمار ہوں گے اور چار تندرست اور چھ میں سے تین اچھے ہو جائیں گے تو وہ چار بیمار رہوں گے۔

جب بخار کی شدت میں کسی طرح کمی نہ ہوئی تو قرار پایا کہ بادشاہی خاص تراش سے حقنہ کرایا جائے۔ لیکن مرزا مایوس ہو چکے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"حسین علی کا حال اگلے خط میں لکھ چکا ہوں۔ آج سولھواں دن ہے تپ کو اور نواں دن ہے کہ کھانا نہیں کھایا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ آج حقنہ ہو رہا ہے۔ مجھ میں دیکھنے کی تاب نہیں۔ میں دیوانخانے میں بیٹھا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محل میں مردانہ ہے۔ بادشاہی خاص تراش حقنہ کر رہا ہے۔ دیکھئے کیا ہو۔ مجھکو تو یاس ہے۔"

حسین علی کو کچھ افاقہ ہوا تو مرزا کی وہ یاس آمیز تحریر بھی بدلی لکھتے ہیں:

"حسین علی اب اچھا ہے یعنی تپ نہیں۔ پیشاب میں ریگ آتی ہے۔ معدہ میں صلابت ہے۔ ضعف کی کچھ حد نہیں۔ خدا کرے بچ جائے

اور بالکل اچھا ہو جائے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"حسین علی اچھا ہو گیا مگر صلابت معدہ اور فم معدہ کی، ہاں ورم باقی ہے۔ کئی دن کے بعد کل پھر تپ چڑھ آئی۔ آخر شب تپ اتری۔ آج اچھا ہے۔ کل دیکھوں کیا ہو۔"

حسین علی ستمبر ۱۸۵۴ء سے دسمبر ۱۸۵۴ء تک اس بیماری میں مبتلا رہا۔ غالب حسین علی کی تعلیم کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے اور انھیں فکر یہ دامنگیر رہتی کہ اگر خدانخواستہ اس میں کوئی نقص رہ گیا تو لوگ مجھے نام دھرینگے۔
۱۸ جون ۱۸۵۴ء کو لکھتے ہیں:

"حسین علی آپ کو بندگی اور اپنے بہن بھائیوں کو علیٰ قدر مراتب سلام بندگی کہتا ہے۔ ا ب ج ح خ پڑھتا ہے۔ خدا میری شرم رکھ لے اور اس میں کوئی اس طرح کا قصور نہ رہجائے جو لوگ مجھ کو نام رکھیں کہ کیا بری طرح پرورش کی۔"

حسین علی نے پانچ سال کی عمر میں قاعدہ شروع کیا۔ ستمبر ۱۸۵۴ء میں بخار میں مبتلا ہو گیا جس سے اسے دو ماہ تک نجات نہ ملی۔ پھر اس کی تعلیم کا ذکر ۲۵ مئی ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں مرزا نے اسطرح کیا ہے:

"حسین علی اچھا ہے۔ لم یکن کے سورہ تک پہنچ گیا ہے۔"

باقر علی بھی جب مرزا کے پاس آ گیا تو مرزا دونوں بچوں کا ذکر کرنے لگے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یہاں دونوں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ اب وہاں کے لڑکوں کی خیر و عافیت لکھو۔"

جولائی ۱۸۵۵ء میں دونوں کو بخار آگیا ہوگا۔ ۱۴ر اگست ۱۸۵۵ء کو مرزا لکھتے ہیں:

"باقر علی خاں اور حسین علی خاں دونوں خوش ہیں۔ تپ رفع ہو گئی۔"

۱۸۵۶ء کے ماہ رمضان میں دونوں بچوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:
"تمہارے دونوں بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں اچھے ہیں دن بھر میں تین چار بار روزہ کھولتے ہیں اور افطار کے وقت روزہ داروں کے حلق کے دربان بن جاتے ہیں۔"

مرزا دو بار رامپور گئے اور دونوں بار یہ صاحبزادے ساتھ گئے۔ رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں کبھی میرا دل بہلاتے ہیں کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، کنکوا، سب سامان درست ہے۔ فروری کے مہینے میں دو دو روپے دئے۔ دس دن میں اٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرض حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے۔ مہینہ دور ہے۔ دیکھئے کے بار قرض لیں گے۔"

رامپور جاتے ہوئے اثنائے سفر سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار چل دئے۔ میں چار گھڑی دن رہے ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ ...... بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کے صلاح مشورہ سے کام کرتے ہیں۔

اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔"

ہاپوڑ سے آگے دونوں بچے رتھوں پر سوار ہو گئے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں:

"دونوں گھوڑے کوتل آئے۔ دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے۔ کھانا کھالیا اور چلے۔"

علاء الدین علائی کو دونوں بچوں کی دہلی کی روانگی کے متعلق لکھتے ہیں:

"آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں معہ چودہ مرغ۔ چھ بڑے آٹھ چھوٹے کے دلّی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ تھے۔"

رامپور کے دورانِ قیام میں مرزا نے ان دونوں بچوں سے نواب صاحب کو نذریں بھی دلوائی تھیں:

باقر علی خاں کامل غالب کی زندگی ہی میں الور میں ملازم ہو گئے تھے۔ عارف نے ان کی بات نواب ضیاء الدین احمد خاں کے ہاں ان کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگّا بیگم کے ساتھ ڈالی تھی جسے نواب موصوف نے منظور کر لیا تھا۔ عارف کی وفات کے بعد بھی نواب موصوف اپنے قول پر قائم رہے اور بگّا بیگم کی شادی باقر علی خاں کے ساتھ کر دی۔ شادی کے بعد باقر علی خاں مرزا سے الگ ہو گئے تھے۔ اردوئے معلیٰ میں مرزا کے تین مکتوب ہیں۔ ان میں سے ایک میں ان کے گھر کی خیریت اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"تمہاری دادی اچھی ہے۔ تمہارا بھائی اچھی طرح ہے۔ تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔"

"سبد چیں" میں باقر علی خاں کی بڑی لڑکی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم کی پیدائش پر مرزا کا یہ فارسی قطعہ موجود ہے ؎

بہ من ز مقدم فرزند میرزا باقر
سروش تہنیت زبدہ مطالب گفت

چو قصد شد متعلق بہ گفتن تاریخ
طریق تعمیہ در زید و "جان غالب" گفت

"جان غالب" کے اعداد میں قصد کے اعداد بھی شامل کئے جائیں تو ۱۲۸۱ھ نکلتی ہے۔ غالب جندو بیگم کو بہت عزیز رکھتے تھے اور پیار سے مرزا جیون بیگ کہتے تھے۔

الور میں باقر علی خاں ساٹھ روپے کے ملازم تھے لیکن دو تین برس کے بعد دہلی چلے آئے اور گھوڑوں کی تجارت شروع کی۔ یکم جمادی الاول ۱۲۹۳ھ (۲۵ مئی ۱۸۷۶ء) کو اٹھائیس برس کی عمر میں وفات پائی۔ تین لڑکیاں ہوئیں۔ اولادِ نرینہ کوئی نہ ہوئی۔

مرزا حسین علی خاں شاداں کی نسبت مرزا اکبر علی خاں کی صاحبزادی سے قرار پائی تھی۔ ان کی شادی کے لئے مرزا نواب رامپور سے روپیہ مانگتے رہے لیکن جب قرضخواہوں نے دباؤ ڈالا تو صرف قرض کی ادائیگی کے لئے روپیہ مانگنا شروع کیا۔ بعد میں حسین علی خاں رام پور میں پچیس روپے ماہوار کے ملازم ہو گئے تھے اور اس کے بعد شادی بھی ہو گئی تھی ۔۲۷ سال

کی عمر میں مرضِ توہم میں مبتلا ہو کر یکم شوال ۱۲۹۷ھ (۷ ستمبر ۱۸۸۰ء) کو وفات پائی۔ اس چھوٹی سی عمر میں مہر سپہر شاعری، خورشید فلک سخنوری، رطب اللسان اور شاعرِ معجز بیان کے خطابات سے سرفراز کئے گئے۔ شاعر کے لئے نحیف الجثہ اور مجنوں کی طرح بید لرزاں اور دبلا پتلا ہونا ضروری خیال کرتے اور کہتے کہ داغ کو شعر کہنا نہ آئیگا۔

شاداںؔ کی شاعری کی ابتدا کے متعلق جو دلچسپ واقعہ "خمخانۂ جاوید" میں درج ہے۔ اس کی کوئی سند نہیں اور نہ ہی قرینِ قیاس ہے۔ یہ ایک لغو من گھڑت ہے۔

(۴) مرزا احسن علی بیگ: منشی نبی بخش حقیرؔ اور غالبؔ کے گہرے دوست تھے اور اکثر علیگڈھ آتے جاتے رہتے تھے۔ پاکھل کا مربہ ایک بار ان ہی کے ہاتھوں منشی صاحب کے پاس پہنچا تھا۔

پہلے بیوی سے ناچاقی ہو گئی تھی۔ ملاپ کے بعد بیوی نے ایک مکارہ کے فریب میں آکر پانچ چھ ہزار روپے کا نقد و جنس تباہ کر دیا۔ اسکا مفصل حال مرزا نے بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

خط نمبر (۱۲)

(۱) شیخ نصیر الدین عرف کالے صاحب بہادر شاہ کے پیر تھے سلسلۂ نسب یوں ہے:

شیخ نصیر الدین ابن شیخ قطب الدین ابن شیخ فخر الدین فخرِ عالم جو آخری دور میں خاندان چشتیہ کے ایک مشہور بزرگ تھے اور جن کی وجہ سے شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کے فیوض و برکات کی عام اشاعت ہوئی۔

مرزا غالب شیخ نصیر الدین کی ایک حویلی میں بغیر کرایہ رہتے تھے۔

وہیں بہ سلسلۂ قمار بازی ماخوذ ہو کر قید ہوئے۔ پھر رہائی پا کر بھی اسی حویلی میں رہے۔

مرزا غالب کی ملازمت کے سلسلے میں حکیم احسن اللہ خاں کے علاوہ شیخ نصیر الدین نے بھی مدد کی تھی۔ بادشاہ کو شیخ سے اتنی محبت تھی کہ بیٹی کی شادی پر دس ہزار روپے اور بیٹے کی شادی پر چار ہزار روپے پیش کئے حالانکہ بادشاہ خود بے دست و پا تھے۔ غدر میں انھیں پھانسی دی گئی تھی۔

(۲) **میاں نظام الدین:-** مرزا کے ایک دوست اور حضرت کالے صاحب کے صاحبزادے تھے۔ کالے صاحب کے پھانسی پا جانے کے بعد تمام جائداد انکی ملکیت قرار پا کر ضبط ہوئی۔ نواب نور الدولہ شفق کو مرزا نے اس کی تفصیل اس طرح لکھی ہے:

"حال صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگے تھے وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودے میں رہے اورنگ آباد میں رہے۔ حیدر آباد میں رہے۔ سال گذشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی لیکن صرف جاں بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی۔ یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوئی اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں وہ ان کو یعنی نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں

نظام الدین پاک پٹن گئے ہوئے ہیں۔ شاید بہاولپور بھی جائیں۔

(۳۱) غلام حسین خاں مسرور۔ مرزا کے ہمزلف تھے۔ بڑے محبت والے اور بامروت شخص تھے۔ ان کے تعلقات اپنی بیوی بنیادی بیگم سے خوشگوار نہ رہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی بیگم کو سات ہزار روپے کی مالیت کا ایک مکان دیکر علیٰحدہ کر دیا تھا۔ لیکن مرزا ان سے اسی طرح ملتے رہے۔ ممکن ہے مرزا کی بیوی نے ان کے بیٹے زین العابدین خاں عارف کو اپنی ہمشیرہ کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے بیٹا بنایا ہو۔

عارف کے بڑے بیٹے باقر علی خاں کی نواسی محترمہ حمید سلطان نے اپنے مضمون بعنوان "زین العابدین خاں عارف" میں لکھا ہے کہ نواب غلام حسین خاں مسرور کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک عارف اور دوسرے حیدر حسن۔ عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی خورد سال ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔"

محترمہ کا یہ بیان درست نہیں۔ نواب غلام حسین خاں مسرور کا انتقال عارف کے انتقال کے ڈھائی سال بعد ۱۸۵۴ء میں ہوا مرزا غالب ۵ نومبر ۱۸۵۴ء کو لکھتے ہیں:

"حسین علی اچھا ہو گیا مگر صلابت معدہ اور رم معدہ کی، ہاں ورم باقی ہے۔ کئی دن کے بعد کل پھر تپ چڑھ آئی۔ آخر شب تپ اتری۔ آج اچھا ہے۔ کل دیکھوں کیا ہو۔ اس کا دادا یعنی زین العابدین کے والد اور میرے ہمزلف نواب غلام حسین خاں مر گئے۔ بہت افسوس کی

بات ہے۔ یہ شخص بہت صاحب مروّت اور صاحب مہر و وفا تھا۔"

نمونۂ کلام یہ ہے:

ماہ پر میری سیہ بختی کا گر سایہ پڑے
چادرِ مہتاب ہو سایہ شبِ دیجور کا

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا
ان کا نو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

ناداں نہیں جو اپنے کو رسوا کرے کوئی
دل ہی نہ بس ہو وے تو پھر کیا کرے کوئی

(۴) مغل علی خاں۔ یہ بھی مرزا کے دوستوں میں سے تھے۔ خواجہ قاسم کی حویلی میں رہتے تھے۔ غدر سے کچھ روز قبل استسقا میں مبتلا ہوئے اور انتقال کیا۔ مرزا ایک خط میں نواب انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔"

خط نمبر (۱۴)

(۱) بہادر شاہ کی مدح میں یہ سترھواں قصیدہ ہے۔ مطلع ہے۔

گفتم حدیثِ دوست بقراں برابر است
نازم بہ کفر خود کہ بایماں برابر است

اسی قصیدے کے سولھویں، اٹھائیسویں، بیالیسویں، انچاسویں اور پچاسویں شعر کی غالب نے اگلے خط میں تشریح کی ہے۔

خط نمبر (۱۵)

(۱) درگاہ قطب صاحب۔ خواجہ قطب الدین صاحب بختیار کاکی کی وفات ۶۳۳ھ میں ہوئی۔ شیر شاہ بادشاہ نے اس مزار کی چار دیواری

لکھوائی تھی۔ اس کے بعد اور بادشاہوں کے عہد میں مختصر چار دیواری بنوائی گئی اور دروازے قائم ہوئے جن پر بہت سے فارسی اشعار کندہ ہیں۔ اس کا شرقی دروازہ فرخ سیر کے عہد میں سنگ مرمر سے بنا تھا۔ اس میں بہت سی قبریں ہیں جو ان کے خادموں اور معتقدوں کی ہیں۔ اس کے دروازے بہت خوش قطع بنے ہوئے ہیں جن پر سنگ مرمر کی جالیاں کاٹی ہوئی ہیں۔ ماہ اگست میں یہاں ایک بہت بڑا میلا ہوتا تھا جسے پھول والوں کی سیر کہتے تھے اور اس میں لاکھوں آدمی شریک ہوتے تھے اور دور دور شہروں سے لوگ اس میلے کی رونق دیکھنے آتے۔ یہ میلا تین دن اور تین رات رہتا تھا اور بہادر شاہ ظفر کی یادگار تھا۔ تیسرے روز خواجہ صاحب کی درگاہ پر پنکھے چڑھائے جاتے تھے اور نذر و نیاز دی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ قطب صاحب کی شہرت کے باعث مینار ان ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

خواجہ صاحب کی درگاہ کے متصل ایک مسجد ہے جس کے تین درجے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ خواجہ قطب الدین صاحب نے خود بنوایا تھا۔ پوری مسجد فرخ سیر کے عہد میں تعمیر ہوئی۔

(۴) جس قصیدہ کے یہ اشعار ہیں وہ مرزا نے بہادر شاہ کی مدح میں لکھا تھا۔ اس سال عید الفطر ۳۰ جولائی کو ہوئی تھی اس لئے اس کی تاریخ تصنیف ۳۰ جولائی ۱۸۵۱ء سے چند روز قبل ہونی چاہیے۔ مرزا کا یہ قصیدہ ان کے بہترین قصائد میں شمار کیا جاتا ہے۔

خط نمبر (۱۶)

(۱) مولوی قمر الدین: ہر گوپال تفتہ، نبی بخش حقیر، مرزا حاتم علی بیگ مہر

اور منشی شیو نرائن کے خطوط میں ان کا ذکر پایا جاتا ہے سلازمت کے سلسلے میں کئی بار کانپور اور الہ آباد جانا ہوا۔ ایک مدت تک بحیثیت میرمنشی لفٹیننٹ گورنر، غرب و شمال کام کیا۔

روزے نماز کے بڑے پابند تھے اور اسی لئے مرزا انھیں از راہ مزاح مولوی معنوی کہا کرتے تھے۔

دستنبو کی طباعت کے اہتمام و خرچ میں مرزا نے تفتہ کا مولوی قمرالدین سے مشورہ لینا ضروری قرار دیا تھا۔ منشی نبی بخش کے انتقال پر مرزا غالب نے جو قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا وہ انھیں کو بھیجا گیا تھا جو انھیں پسند نہ آیا۔

(۲) **میر قاسم علی:۔** مرزا نے میر قاسم علی کا ذکر تفتہ منشی بخش حقیر اور مولوی عبدالرزاق شاکر سے بھی مختلف خطوط میں کیا ہے۔ میر صاحب ایک عرصہ آگرے اور ہاتھرس میں منصف رہے۔ لعبدمیں صدر امین کے عہدہ پر فائز کر دئے گئے۔ شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ دہلی بھی آتے رہتے تھے۔

مرزا نے اردو دیوان کا ایک نسخہ منشی نبی بخش حقیر کی نذر کیا تھا۔ منشی صاحب نے میر صاحب کی نذر کر دیا۔ مرزا کو جب اس صورت حال کا پتہ چلا تو بہت رنجیدہ ہوئے اور یہ خیال گذرا کہ شاید منشی صاحب کو انکا کلام ناپسند نہ آیا۔

خط نمبر (۱۷)

(۱) حکیم احسن اللہ خاں۔ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر شاہ کے طبیب خاص تھے۔ مرزا کے قلعہ معلے سے جو تعلقات پیدا

ہوئے تھے ان میں حکیم صاحب کا کافی ہاتھ تھا۔ انھوں نے ہی تاریخ تیموریہ کی تجویز پیش کی اور ملازمت کے لئے ایک مد نکالی۔ ....... اظہار میں کسی سے پایۂ علم و عمل میں کم نہ تھے حکیم صاحب کی عنایات روز افزوں دیکھ کر مرزا اپنے علاج معالجہ کے لئے انھیں سے رجوع کرنے لگے۔

مرزا نے منشی نبی بخش کے لئے پاکھل کا ٹھیکہ حکیم صاحب ہی کے توسل سے حاصل کیا تھا۔

تاریخ تیموریہ لکھنے کی خدمت جب مرزا کے سپرد ہوئی تھی تو یہ طے پایا تھا کہ مرزا تواریخ سے خود حالات کا انتخاب کریں اور اسے اپنی طرز کی فارسی کا جامہ پہنا دیں۔ لیکن مرزا جب ہمایوں کے حال تک پہنچے تو انھوں نے حکیم صاحب سے عذر کیا کہ انتخاب حالات مجھ سے ممکن نہیں۔ آپ اردو کا مسودہ میرے پاس بھجوا دیا کیجئے۔ اس کی کیفیت منشی نبی بخش کو اس طرح لکھی ہے:

"جب ہمایوں کے حال تک پہنچا تو میں نے از راہ حیلہ بلکہ لسبیل اظہار حقیقت واقعی حکیم صاحب کارفرما سے کہا کہ مجھ سے انتخاب حالات ممکن نہیں۔ آپ مدعا کتب سیر سے نکال کر زبان اردو میں مسودہ اسکا لکھوا کر میرے پاس بھیجدیا کیجئے میں اس کو فارسی کر کے تم کو دیدیا کروں گا۔ انھوں نے اس کو قبول کر کر ابتدائے آفرنیش عالم و آدم سے میرے پاس مسودہ اردو بھیجا۔ تو اب گویا ایک اور کتاب لکھنی پڑی۔ میں نے اس کا چھوٹا سا دیباچہ لکھ کر ایک اور ہی انداز کی عبارت میں لکھنا شروع کیا۔ آدم سے لے کر چنگیز خاں تک انھوں نے میرے پاس مسودہ بھیجا میں نے اپنے طور پر لکھا اور مسودہ حوالے کیا۔ رمضان کے مہینے سے کہ آج اس کو

دس مہینے ہوئے وہ مسودہ آنا موقوف ہوگیا۔ بہ ہمہ جہت چار جزو ہوئے ہوں گے۔ دو چار بار میں نے ان سے تقاضا کیا۔ یہی جواب سنا کہ اب رمضان ہے۔ پھر کہا کہ عید کا ہنگامہ ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھکو کیا۔ میں کیوں طالب مشقت ہوں۔ تقاضا موقوف کیا۔ وہ چار جزو میرے لکھے ہوئے حکیم صاحب کے پاس ہوں گے۔ اب کہاں ان سے مانگوں اور کیوں مانگوں۔ جانے دو۔ دور کرو۔ جو بنا اٹھی ہی نہیں اس سے غرض کیا۔"

غدر میں حکیم صاحب پر جو مصیبت آئی اس کی تفصیل مرزا غالب نے دستنبو میں لکھی ہے۔ باغیوں نے انھیں انگریزوں کا جاسوس جان کر قتل کرنے کی ٹھان لی اور ان کے گھر کو آگ لگا دی۔ حکیم صاحب اتفاق سے بادشاہ کے پاس موجود تھے۔ باغیوں نے حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ آخر بادشاہ نے ان کی جان بچائی۔ غدر کے فرو ہونے کے بعد شروع شروع میں انپر کچھ پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔

۱۸۸۵ء میں آگرے سے ایک اخبار آفتاب عالمتاب نکلتا تھا۔ اس میں ایک ڈیڑھ صفحہ بہادر شاہ کے حالات کا ہوتا تھا۔ حکیم صاحب مرزا غالب کی معرفت اس اخبار کے خریدار ہوئے۔ مرزا لکھتے ہیں:

حکیم احسن اللہ خاں کا نام خریداروں میں لکھ لیں۔ دوسرے اخبار مذکور میں ایک صفحہ ڈیڑھ صفحہ بادشاہ دہلی کے اخبار کا ہوتا ہے۔ جس دن سے وہ اخبار شروع ہوا ہے اس دن سے صرف اخبارات کا صفحہ نقل کر کے ارسال کریں۔

حکیم صاحب نے ایک مسجد بھی بنوائی تھی جس کی تاریخ بہادر شاہ ظفر نے

لکھی تھی:

مسجدے ساخت چوں بحسنِ عمل
احسن اللہ خانِ پاک سرشت

اے ظفرؔ بہر سال تاریخش
خانہ ام خانۂ خدا بنوشت

ان کے مکان پر بھی یہ کتبۂ تاریخ نصب تھا۔

از سال بنائے تو بدرگاہ
پیر خردم نمود آگاہ

برداشت سپر از دیار دہلی
تعمیر قصر احسن اللہ

دہلی کی تباہی کے بعد حکیم صاحب نے جے پور میں ملازمت کر لی تھی۔ اور پھر وہاں سے بڑودے چلے گئے اور وہیں ۱۸۷۳ء میں انتقال کیا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں نے تاریخ وفات کہی ؎

دریغا بہ شہر بڑودہ بمرد
بہ غربت بعید از وطن عنقریب

بدیں وجہ و ترکیب آں لفظہا
بود سال فوتش حکیم غریب
۱۲۹۰ھ

خط نمبر (۱۸)

(۱) حکیم الٰہی بخش ۔ صاحب عالم مارہروی کے شاگرد اور مرزا کے

دوست سکندرہ کے شرفا میں سے تھے۔ روزگار کی تلاش میں نکلے۔ صاحب عالم مارہروی نے ایک تعارفی خط غالب کے نام کا دیا۔ دہلی رہے لیکن کچھ کام نہ بنا آخر مرزا نے منشی نبی بخش حقیر کے نام کا ایک تعارفی خط ان کے سپرد کیا تاکہ اگر علیگڈھ میں کچھ دھندا لگ سکے تو لگ جائے۔

دہلی کے دوران قیام میں حکیم امام الدین سے مفرح القلوب پڑھی۔ بہت معقول اور مہذب آدمی تھے۔ اور حسن طبع بھی رکھتے تھے۔

(۲) صاحب عالم مارہروی۔ غالب کو ان سے بڑی محبت تھی۔ شاہ عالم کو لکھتے ہیں:

"یارب جب تک حضرت صاحب عالم کو مارہرہ میں اور انوار الدولہ کو کالپی میں نہ دیکھ لوں اور ان سے ہمکلام نہ ہوں، میری روح کو قبض کا حکم نہ ہو۔"

مرزا انھیں ہمیشہ نہایت ادب و احترام کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں۔ ایک بار صاحب عالم مارہروی نے مرزا کی تعریف کی۔ مرزا جواباً تحریر فرماتے ہیں:

"پیر و مرشد۔ اس مطلع و حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اس کا شکر کیونکہ بجالاؤں۔ خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصان درگاہ سے بھلا کہلواتا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادت عظمیٰ تھی کہ میں اس وبائے عام میں جیتا بچ گیا۔ اللہ اللہ کہ ایسے کشتنی و سوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس مرتبہ کو پہنچایا۔ کبھی عرش کو اپنا نشیمن قرار

دیتا ہوں اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں ۔"

(۳) جوالا سنگھ ۔ منشی نبی بخش کے ایک دوست جو اپنے کسی مقدمے کے سلسلے میں تعارفی خط لے کر مرزا سے ملے ۔ مرزا نے انکے لئے سعی و سفارش بھی کی ۔

خط نمبر (۱۹)

(۱) مومن خاں : حکیم مومن خاں مومن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے ۔ عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے ۔ ان کے اجداد مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں دہلی آئے اور بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے ۔ سرکار انگریزی سے پنشن ملتی تھی ۔ بچپن ہی سے ذہین و طباع تھے ۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا ۔ جو بات سنتے یاد ہو جاتی ۔ نجوم میں بھی کمال حاصل تھا ۔ خوش رو خوش وضع اور عاشق مزاج آدمی تھے ۔ جوانی کا کلام عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ۔ لیکن آخر عمر کے کلام میں پختگی و متانت پائی جاتی ہے ۔ شروع شروع میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے ۔

مومن کے انتقال پر مرزا نے یہ رباعی لکھی تھی ۔

شرطست کہ روی دل خراشم ہمہ عمر
خونابہ بہ رخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

خط نمبر (۲۰)

(۱) (۲) دیوان غالب کے متداول نسخوں میں "وہ کہ" کی جگہ "جو" لکھا ہے ۔

(۳) مروجہ دیوان میں یہ مصرع اس طرح ہے ؎
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں

(۴) متداول دیوان میں ان اشعار کی ترتیب میں فرق ہے۔ ان میں "ہم موحد ہیں" والا "جانفزا ہے بادہ" والے شعر کے بعد درج ہے۔

(۵) یہ مصرعہ مروجہ دیوان میں اس طرح درج ہے ؎
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

خط نمبر (۲۱)

(۱) مرزا کی مثنوی "بیان معراج" کا یہ پندرھواں شعر ہے۔ مگر کلیات میں "تو" کی جگہ "کہ" چھپا ہوا ہے۔ اس کے مقدم و موخر اشعار ہیں ؎

چناں گشتہ سرتاسرا جزائے خاک
فروغانی و روشن و تابناک

کہ گوئی نگوہر ز یرِ زمیں
فروزاں فوہ بو دلپشت نگیں

دیا خاک با جوہر آفتاب
بیامیخت چو دُردِ مے با شراب

(۲) **جنرل لارڈ لیک:۔** اس کا اصل نام جیراڈ لیک تھا۔ چارلس لیک کا لڑکا تھا۔ ۲۷ جولائی ۱۷۴۴ء کو پیدا ہوا۔ فوج میں ملازمت کی۔ ترقی کرتے کرتے ۱۸۰۱ء میں جنرل بنا۔ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۵ء تک سپہ سالار ہند رہا۔ کوئل (علیگڈھ) میں مرہٹوں سے لڑائی لڑی ۱۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو لسواڑی کی جنگ کے بعد دہلی پر

قبضہ جمایا۔ اکتوبر ۱۸۰۳ء میں آگرہ لے گیا۔ دسمبر ۱۸۰۴ء میں قلعہ دیگ (بھرتپور) پر حملہ کیا۔ پھر اس کی سپہ سالاری کی مدت ۱۸۰۷ء تک بڑھا دی گئی۔ بعد ازاں انگلستان گیا اور ۲۰ فروری ۱۸۰۸ء میں چونسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۳) نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں نواب احمد بخش خاں والئی فیروزپور جھرکہ وجاگیردار لوہارو کے تیسرے بیٹے تھے اور مرزا غالب کی بیوی کے چچازاد بھائی۔ جب سات سال کے تھے تو نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ماں اور ان کے بھائی امین الدین احمد خاں نے ان کی پرورش کی۔ اور تعلیم وتربیت کے فرائض انجام دئے۔ تفسیر وحدیث حضرت شاہ عبد القادر کے شاگرد رشید مولوی کریم اللہ صاحب سے پڑھی۔ ادب و فقہ جناب مفتی صدر الدین خاں آزردہ سے منطق وفلسفہ مولانا فضل حق خیرآبادی سے اور زبان فارسی اپنے بہنوی حضرت غالب سے پڑھی۔ حضرت غالب کے ساتھ ساتھ نواب ضیاء الدین احمد مفتی صاحب او ر مولوی صاحب کی محفلوں میں آیا جایا کرتے تھے۔ آخر اس ذوق نے نواب صاحب کو شاعر بنا دیا اور وہ مرزا غالب کے شاگرد ہوگئے۔ فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔

ان کی سلامتئ ذوق وحسن طبیعت کے مرزا غالب بہت مداح تھے۔ اور ان کے کلام کو اپنا نمونۂ کلام کہتے۔ مرزا غالب نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا جو فارسی کلیات میں موجود ہے۔ مرزا صاحب رتبہ میں انھیں اپنے سے بڑا کہتے اور ان پر مرزا کو جس قدر ناز تھا، وہ ان اشعار سے ظاہر ہے:۔

ہنم خزینۂ رازودر خزینۂ راز
ضیائے دین محمد کہیں برادر من

بدین و دانش و دولت یگانۂ آفاق
بہ عمر کہتر و از روئے رتبہ بہتر من

بہ نکتہ شیوۂ شاگردمن ہمن ماناست
صنم بصورت خود مے تراشد آذر من

اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم
بود بپایہ ارسطوئے من سکندر من

مطالعہ کا اتنا شوق تھا کہ صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی۔ علومِ مشرقی پر عبور حاصل تھا۔ تاریخ و جغرافیہ اور زبان و محاورات و مصطلحات کی تحقیق میں طاق ہو گئے تھے۔ الیٹ صاحب نے تاریخ ہند کی ترتیب میں ان سے مدد لی تھی۔

فارسی نثر میں بھی مرزا کی پیروی کرتے اور انھیں سے اصلاح لیتے۔ مرزا کے تلمذ کے فیض سے نیّر نے نظم و نثر فارسی میں وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ اہلِ زبان بھی داد دیتے اور فصاحتِ کلام کا اعتراف کرتے۔

منشی نبی بخش نے ان کی کچھ فارسی نظم و نثر مرزا کی معرفت منگوائی تھی۔ مرزا غالب نے نواب رامپور کی خدمت میں بھی ان کا کلام بھیجا تھا۔

مرزا صاحب کی تمام نظم و نثر نواب موصوف ہی فراہم کیا کرتے تھے۔ غدر میں ان کا کتب خانہ لٹا تو مرزا کی تصانیف بھی لٹ گئیں۔

نیّر رخشاں نے غدر کے بعد بہت کم کہا۔ اپنی زندگی میں کلام کو جمع کر کے شائع کرانے کا کبھی ارادہ نہ کیا۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں ان کے صاحبزادے

"مرزا سعید الدین احمد خاں عرف احمد سعید خاں طالبؔ نے ایک مختصر سا مجموعہ "جلوۂ صحیفۂ زریں" کے نام سے شائع کیا۔ اس میں قطعات تاریخ، غزلیات اور مثنوی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کلام اصل مسودے کا تقریباً نصف ہے۔ طالبؔ صاحب لکھتے ہیں:۔

"مجموعۂ نثر و نظم حضرت مرحوم از اوراق پریشاں شیرازہ بند کردہ کہ بہ زیور طبع محلی کردہ ام دو چند بود لاکن بہ چند وجوہ تلف شد و برباد رفت۔ و ماندہ را البقیہ لقیہ شمردہ شائع کردن بایں چند سطور کہ مجملاً احوال فرخ فال آں یگانہ روزگار در ضبط تحریر آوردہ ام"

طالبؔ صاحب نے "بہ چند وجوہ تلف شد" کی تشریح اس طرح کی ہے:۔

"اول زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں تمام وکمال تصنیف تلف ہو گئی تھی بعد غدر جو کچھ کہا یا پہلا ملا اور حافظہ میں محفوظ تھا وہ بطور مسودات رہا۔ حضرت نے اپنی زیست میں صرف غزلیں اور قصائد طرز جدید اور چند قطعات تاریخ اور رباعیاں صاف کرائی تھیں۔ مابقا کلام مسودہ تھا جو بمشکل پڑھا جاتا تھا۔ اور مسلسل بھی نہ تھا اور جو کچھ پڑھا گیا معرض تحریر میں آیا۔

اور اردو کلام جو ایک دوسری کتاب میں تھا وہ کتاب بھی کسی کمبخت نے اڑا لی۔ اب جو کچھ لکھا گیا یہ تذکروں سے نکال کر نقل کیا گیا۔ ۱۲۔ طالبؔ"

فارسی کلام کا نمونہ:۔

عمرے گزشت باتپش و باگریستن
روزاں بخوں تپیدن و شبہا گریستن

کو نوح و کو سفینۂ او تا کنیم غرق
آمد بدر ز بندِ مجا با گریستن

ریزم دگر بساحل دریا سرشک گرم
کاتش زدہ بدامن صحرا گریستن

زیں پس بضبط کوشم و سوزم بسوز اشک
فرسودہ شیوہ ایست ہمانا گریستن

از دیدہ ہائے حلقۂ زنجیر مے سزد
برحالِ قیس سلسلہ برپا گریستن

نیر بہ پردہ داری دردِ تو داشت سعی
افشائے راز میکند اما گریستن

اردو کلام کا نمونہ :۔

کیا پہنچے تو، فرشتے کا جس جا گزر نہ ہو
بیت الصنم ہے شیخ خدا کا یہ گھر نہ ہو

رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک
آنکھوں میں آگیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

چاک یکسر مرا گریباں ہے
دل کا محضر مرا گریباں ہے

لاغری میں بریدہ ناخن سے
مختصر تر مرا گریباں ہے

پھر بہار آئی اب جنوں کا ہاتھ
اور پھر مرا گریباں ہے

.................

شاید بہار آئی کہ جو پنجۂ جنوں
پھر کر رہا ہے جامۂ دستار تار تار
سر پیٹے سینہ کوٹے کہ افسوس ہیں ملے
عاشق کو ہاتھ چاہئیں ناچار چار چار

.................

خط نمبر (۲۲)

(۱) مرزا غالب نے اپنا اردو دیوان بہت تکلف سے لکھوا کر جانی جی کے پاس اجمیر بذریعہ پارسل بھیجا تھا جو ان کی کوشش سے مہاراجہ جے پور کی خدمت میں پیش ہوا۔

خط نمبر (۲۳)

(۱) حیات بخش باغ۔ رہنمائے دہلی مصنفہ عیش دہلوی مطبوعہ ۱۸۷۴ء میں اس باغ کے متعلق لکھا ہے:۔
"اس کے دیکھنے سے دل کو فرحت اور انبساطِ تازہ اور جان کو نشاط بے اندازہ حاصل ہوتی تھی۔ ہر درخت اس کا رشکِ قامتِ یار اور ہر گل غیرتِ گلِ رخسار تھا۔ اس کے درمیان میں ایک حوض تھا جس کے چھ گز کے فاصلے سے سنگ سرخ کی نہریں بنی ہوئی تھیں اور دونوں جانب دو مکان تھے۔ جن کو ساون بھادوں کہتے تھے مگر اب اس میں سوائے چند درختوں کے اور کچھ بھی باقی نہیں۔

اس باغ کے گرد و نواح میں اور بہت سی قدیم عمارتیں شامل تھیں جن کو سرکار انگریزی نے منہدم کراکر بارکیں تعمیر کرالی ہیں۔"

بادشاہ اس باغ کی بھی کانٹ چھانٹ کا خاص خیال رکھتے تھے بہادر شاہ کے روزنامچہ میں ۲۹ رجون ۱۸۴۶ء کو اس کا اس طرح ذکر آیا ہے:

"حکم دیا گیا کہ باغ حیات بخش اور مہتاب باغ کے دو ہزار درختوں کی کاٹ چھانٹ کر کے ان کو ہموار کر دیا جائے۔"

خط نمبر (۲۴)

(۱) جانی جی نے اوّل اوّل غالب کو جے پور سے تقریباً دو ہزار روپے دلانے کی امید دلائی تھی۔

خط نمبر (۲۵)

(۱) ہردیو سنگھ

(۲) راول مختار راج

سعد اللہ خاں وکیل راج

مرزا غالب نے جانی بانکے رائے کی وساطت سے ایک اردو دیوان والئ جے پور کی خدمت میں ارمغاں کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک عرضی بھی گزرانی تھی۔ جانی بانکے رائے نے اپنا معتمد ہردیو سنگھ کو جواب لینے کی غرض سے مقرر کیا۔ اہالی راج جے پور نے ہردیو سنگھ کو بعد ہولی رخصت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مرزا کے لئے آخر پانچسو روپیہ تجویز ہوئے۔ مرزا کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے پچیس روپے بطور انعام منشی ہردیو سنگھ کو اس میں سے دینے طے کئے اور جانی جی کو

لکھ بھیجا کہ پانسو روپے کی ہنڈوی میں سے پچیس روپے ہردیو سنگھ کو دے دیے جائیں اور باقی کی ہنڈوی کی جائے۔ بعد میں جب انھیں اطلاع پہنچی کہ ہردیو سنگھ نے اس ضمن میں انتیس روپے کچھ آنے اپنے پاس سے خرچ کیے ہیں تو جانی جی کو لکھا کہ چون روپے کچھ آنے کاٹ کر کچھ کم ساڑھے چار سو روپے کی ہنڈوی روانہ کر دی جائے۔ لیکن جانی جی نے ہردیو سنگھ کو اپنے پاس سے روپے دے دیے اور مرزا صاحب کو پورے پانسو روپے کی ہنڈوی بھیجدی۔

راول مختار راج اور سعد اللہ خاں وکیل راج نے مرزا غالب کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا اور مرزا کو یقین تھا کہ ان کی حمایت سے ایک معقول رقم والئے جے پور سے حاصل ہو سکے گی۔ لیکن راجہ کے اچانک انتقال سے مرزا کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور ان دونوں کے دن بگڑ گئے راول مختار راج غالباً ریاست چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور سعد اللہ خاں وکیل راج کی ملازمت تک خطرے میں پڑ گئی۔

خط نمبر (۲۶)

(۱) سعد اللہ خاں وکیل راج: خط نمبر ۲۵ کے حواشی دیکھیے۔

خط نمبر (۲۷)

(۱) کلیات نظم فارسی میں یہ غزل صفحہ ۴۰۹ پر درج ہے۔ کسی لفظ یا ترتیب اشعار میں بھی فرق نہیں۔

ترجمہ

(۱) میری جیب کا چاک دامن تک چلا گیا ہے۔ اب دیکھئے گریبان کے چاک پر کیا گزرتی ہے اور اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔

(۲) میری طبیعت کا جوہر درخشاں ہے لیکن میرا روز ابر میں پنہاں ہو جاتا ہے یعنی میری طبیعت تو اچھی ہے لیکن مقدر خراب ہے۔

(۳) اے دل اگر کوئی کام مشکل ہو تو اس کا رنج نہ کر کیونکہ وہ مشکل ہو کر ہی آسان ہو جاتا ہے ؎

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

(۴) کفر اور ایمان سوائے کہنے کی باتوں کے اور کیا چیزیں ہیں کفر اور ایمان میں بھی جائے سخن باقی ہے۔

(۵) ہر خوشبو کے لئے دماغ چاہیئے یعنی دماغ ایسا ہونا چاہیئے جو خوشبو سونگھ سکے کیونکہ پیرہن کی خوشبو کنعاں تک پہنچ جاتی ہے۔

(۶) جب ان کا خیال آتا ہے تو میں ذوق کی وجہ سے یہ بھی نہیں تمیز کر سکتا کہ کس کا خیال آیا۔ اور جب وہ خیال چلا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جان چلی گئی۔

(۷) ان کا خیال صرف ایک جگہ نہیں بلکہ جگہ جگہ لے جاتا ہے اور جب جاتا ہے تو پریشان کر جاتا ہے۔

(۸) جو کوئی انھیں راستے میں دیکھتا ہے کہتا ہے کہ قبلۂ آتش پرستاں تشریف لئے جا رہے ہیں۔

(۹) اس شعر کی مرزا غالب نے خود خط نمبر ۲۸ میں تشریح کی ہے۔ کہتے ہیں کہ چاند اوّل ماہ قمری میں تیری شرم سے آخر شب کو بھاگ جاتا ہے اور تمام رات تیرے مقابل نہیں رہ سکتا۔

(۱۰) دشمن کو چھوڑ دے کیونکہ اس کا دل سخت سے سخت ہے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اس سے تیر و پیکان کی آبرو جاتی ہے۔

"آبروئے تیر و پیکاں مے رود" کیا خوب کہا ہے۔

(۱۱) کون ہے جو اس ایوان نشین کو بتلائے کہ غالب، پر اس کے دربان کے ہاتھوں کیا گذرتی ہے۔

(۲)(۳) اور (۴) مرّوجہ دیوانوں میں "کڑھئے" کی جگہ "لڑیئے" اور "نہ ہو" کی جگہ "نہیں" مرقوم ہے۔

خط نمبر (۲۸)

(۱) خط نمبر ۸ کی طرف اشارہ ہے۔

خط نمبر (۳۰)

(۱) وقائع نگار سے مراد منشی ہرگوپال تفتہ ہیں۔

خط نمبر (۳۱)

(۱) **مرزا یوسف علی خاں ابن مرزا نجف علیخاں**: مرزا نجف علیخاں غالباً علیگڈھ کے رہنے والے تھے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ نہایت فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔ علیگڈھ میں ایک دو حویلیاں بھی تھیں۔ مرزا غالب اور منشی نبی بخش کے دوست تھے۔ جنوری ۱۸۵۴ء میں دہلی میں انتقال کیا۔

مرزا یوسف علی خاں ان ہی کے بیٹے تھے۔ بڑے ناز و نعم سے انکی پرورش ہوئی۔ علیگڈھ اور دہلی میں آنا جانا رہا کرتا تھا۔ منشی نبی بخش کی بہو کی وفات پر مرزا غالب نے انھیں رسم تعزیت بجالانے کے لئے بطور نمائندہ علیگڈھ بھیجا۔ واپسی پر منشی صاحب کی طرف سے مرزا کے لئے جاجم کا تحفہ لائے۔

خط نمبر (۳۲)

(۱) محبوب خاں رسالدار۔ غالب اور منشی نبی بخش حقیر کے دوست

جن کا دہلی سے علیگڈھ اکثر آنا جانا رہتا تھا۔

(۲) میاں محمد حسین دہلوی۔ مرزا غالب اور منشی نبی بخش کے دوست تھے اکثر علی گڈھ جاتے رہتے تھے۔ ایک بار منشی نبی بخش کی ایک غزل مرزا کے پاس بغرض اصلاح لائے۔ کوچہ رحمان میں مصوروں کی حویلی میں رہتے تھے۔ ان کا ایک چھاپہ خانہ مطبع احمدی کے نام سے شاہدرہ میں تھا۔ مرزا کے اردو دیوان کا ایک اڈیشن جولائی ۱۸۶۱ء میں اسی مطبع میں چھپا تھا۔

(۳) شیخ مومن علی صاحب۔ صدر امین کول (علیگڈھ) تھے۔ بعد میں ترقی کر کے میرٹھ میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ شیفتہ پر غدر کے سلسلے میں جو مقدمہ چل رہا تھا اس کے فیصلہ میں ان کا بھی کچھ دخل تھا۔ اس لئے مرزا نے صدیق حسن خاں (بھوپال) سے ان کے نام سفارشی چٹھی لکھوائی تھی۔

خط نمبر (۳۳)

(۱) اس فتوح کے روپے سے مراد شاید وہ پان سو روپے ہیں، جسکی ہنڈی مرزا نے جون ۱۸۵۳ء میں وصول پائی تھی۔ جانی بانکے رائے کے توسط سے مرزا غالب کا اردو دیوان مہاراجہ جے پور کی خدمت میں پیش ہوا تھا۔ یہ پان سو روپے اسی کا صلہ تھے۔

(۲) جیمس تامسن اس زمانے میں یوپی کے لفٹیننٹ گورنر تھے کلیات میں ان کی مدح میں بھی ایک قصیدہ اور ایک قطعہ شامل ہے۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے ؎

آنکہ از دوست دریں دائرہ تنہا ماند

جز درِ آں خانہ نماند کہ بصحرا ماند

قطعہ کے نو اشعار ہیں پہلا شعر ہے ؎

ہوا عبیر فشانست و ابر گوہر بار

جلوس گل بسریر چمن مبارکباد

اور آخری شعر اس طرح ہے ؎

ہزار بار فزوں گفتم و کم است ہنوز

گورنری بہ جمیس تامسن مبارکباد

(۳) میر اشرف علی ابن میر اسد علی دہلی کے رہنے والے تھے۔ صاحب جائداد تھے۔ غدر میں قید ہوئے اور ان کی املاک پر سرکاری تصرف ہو گیا تھا۔ میر مہدی حسین مجروح کے دوست تھے۔ اکثر پانی پت آنا جانا رہتا تھا۔ ان ہی سے تعارفی خط لائے۔ ان کا حلیہ وغیرہ مرزا صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی سانولے سلونے ڈاڑھی منڈے بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمہارا خط دیا صرف انکی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا۔ فرمایا: اشرف علی۔ قومیت کا استفسار ہوا۔ معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا۔ حکیم نکلے۔ یعنی حکیم میر اشرف علی۔ میں ان سے مل کر خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔"

خط نمبر (۱۴) ۳

(۱) جس شعر کو مرزا نے اپنے انداز کا قرار دیا ہے۔ اسے انھوں نے ایک خط میں اس طرح نقل فرمایا ہے۔

؎

بڑھ گئی توقیر میری اتنا رِخ دخل سے

اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مجھ کو اسکے درباں دیکھکر

اس غزل کا مطلع تذکرہ بزم سخن میں بطور نمونۂ کلام اس طرح درج ہے ؂

ہاتھ دوڑائے جنوں نے پھر گریباں دیکھ کر

پاؤں پھر وحشت نے پھیلائے بیاباں دیکھکر

(۲) غالبًا انہی عطار اللہ خاں کے خط کے متعلق غالب تفتہ کو لکھتے ہیں :

"کل ایک رقعہ میرے پاس آیا۔ کوئی صاحب ہیں عطار اللہ خاں اور ناؔمی تخلص کرتے ہیں۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے اس کا جواب لکھ کر اسیوقت دوست کے پاس بھیجدیا۔ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ کر حال معلوم کرو گے۔"

غدر کے بعد ایک خط میں غالب نے عطار اللہ خاں کا اس طرح ذکر کیا ہے :

"بندہ پرور، نواب عطار اللہ خاں میرے پرانے دوست اور شفیق ہیں۔ ان کے فرزند رشید میر غلام عباس المخاطب بہ سیف الدّولہ یہ دونوں صاحب صحیح و سالم ہیں۔ شہر کے پاس دو چار کوس پر کوئی گانو ہے، وہاں رہتے ہیں۔ شہر میں اہل اسلام کی آبادی کا حکم نہیں اور ان کے مکانات قرق ہیں۔ نہ ضبط ہو گئے نہ واگذاشت کا حکم ہے۔"

خط نمبر (۳۵)

(۱) **ٹامس مٹکاف:-** سر ٹامس تھیوفلس مٹکاف جن دنوں غدر کا ہنگامہ بپا ہوا دہلی کے ریذیڈنٹ تھے۔
بڑی مشکل سے جان بچا کر پہاڑ گنج کے تھانہ میں پہنچے وہاں کے تھانہ دار نے ان کی جان بچائی اس کے بعد وہ جھجر اور حصار کے علاقوں میں مارے مارے پھرے۔ دہلی کے فتح ہو جانے کے بعد پھر دہلی آئے اور باشندگان دہلی پر جو سختیاں ہوئیں ان میں انھوں نے نمایاں حصّہ لیا۔

بہادر شاہ انھیں فرزند ارجمند سلطانی معظم الدولہ، امین الملک اختصاص یار خاں طامس تھیافلس مٹکاف بہادر فیروز جنگ کے خطاب سے یاد فرماتے تھے۔ انھوں نے ایک بار بادشاہ کی فرمائش پر قلعہ کی مرمت و درستی کا کافی انتظام کر دیا اور شاہی دیہات کے انتظام و انصرام اور بعض دوسرے کام ایسی خوبی سے انجام دئے کہ بادشاہ اور بھی خوش ہوئے اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ مجھے صاحب کلاں معظم الدولہ بہادر کی خیر خواہی اور ہمدردی سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اس لئے دفتر خانہ میں حکم دیا جائے کہ انکے پورے القاب کے ساتھ "فرزند ارجمند بجاں پیوند سلطانی" بھی ضرور لکھا جائے۔"

(۲) **سکندر صاحب کی گرجا گھر:-** یہ گرجا گھر متصل کشمیری دروازہ واقع ہے۔ بہت خوبصورت عمارت ہے۔ اس کا کلس جو شکل صلیب بنا ہوا ہے۔ بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے اور اتنا بلند ہے کہ بہت دور سے دکھائی دیتا ہے۔

اندر سنگ مرمر کا فرش ہے۔ اسے کرنیل جیمس اسکنیر صاحب بہادر جو بڑے عالی ہمت اور نام آور تھے۔ اپنی ذاتِ خاص کا روپیہ صرف کر کر بنوایا تھا۔ ۱۸۲۶ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ دس سال میں بن کر تیار ہوا۔ علاوہ سنگ مرمر کے جو صاحب موصوف کے پاس موجود تھا۔ نوے ہزار روپیہ اس پر لاگت آئی۔ اس کے صحن میں غرب کی جانب ولیم فریزر صاحب کمشنر دہلی کی قبر ہے جس کو چند سواروں نے بضرب قرابین زیر کوٹھی ہندو راؤ مارا تھا۔ ان کے پہلو میں ٹامس مٹکاف صاحب کی قبر ہے۔

(۳) **فریزر صاحب:۔** ۱۸۳۲ء میں ولیم فریزر دہلی میں ایجنٹ مقرر ہو کر آئے تھے۔ نواب احمد بخش خاں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ریاست لوہارو نواب شمس الدین خاں کے بجائے نواب امین الدین خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملنی چاہیئے نواب شمس الدین خاں کو کیونکہ ولیم فریزر سے نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا اس لئے انھوں نے اپنے دو ملازموں سے ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو قتل کرا دیا۔

ولیم فریزر مرزا غالب کے بھی دوست تھے اور تمام ہندوستانیوں سے بہت خلوص سے پیش آتے تھے اس لئے ان کے قتل کا ہر ایک کو رنج ہوا۔

خط نمبر (۳۷)

(۱) شیخ رحمت اللہ۔ ان کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔

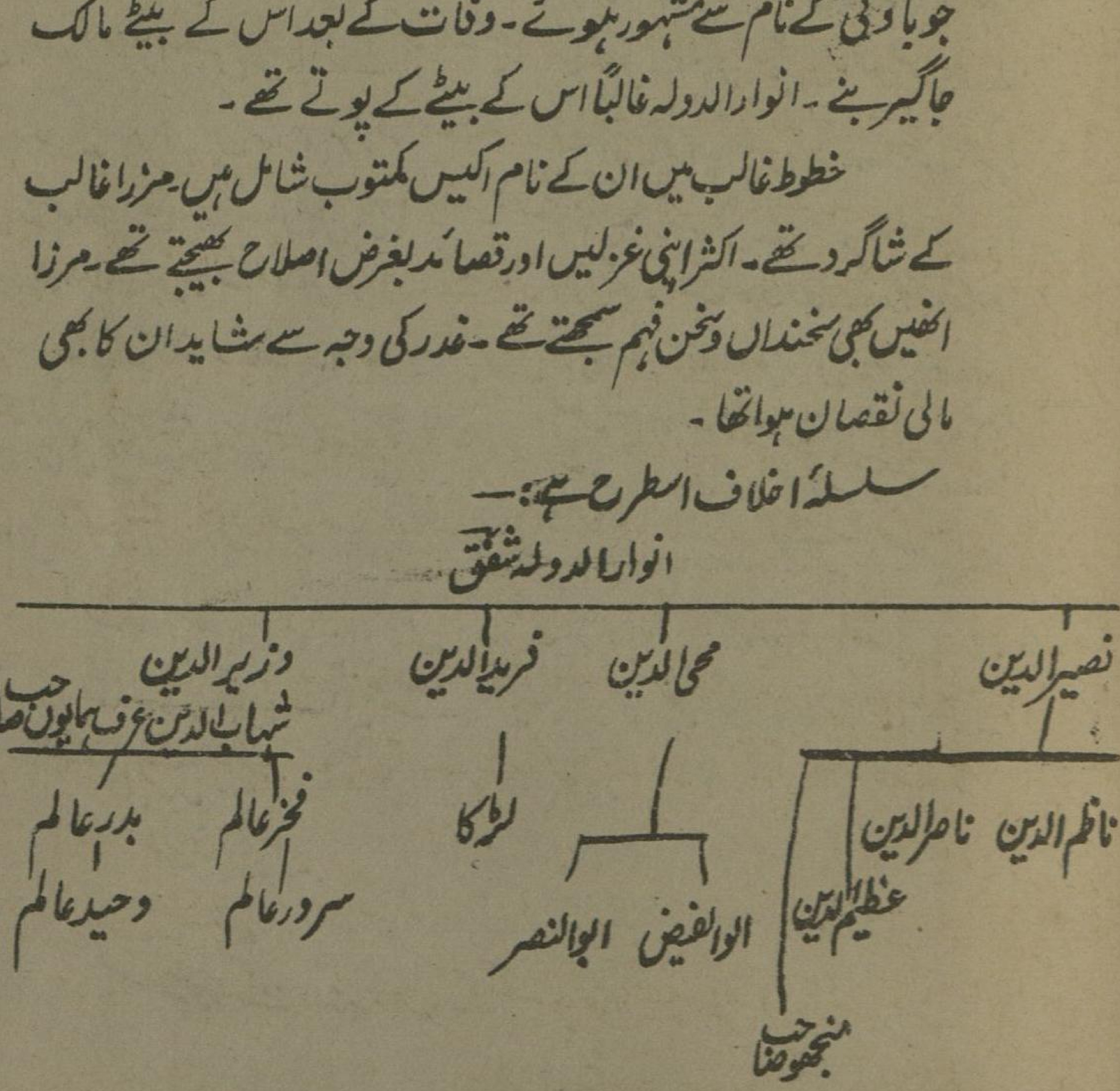
(۲) **مثنوی اور اعلام نامہ:۔** بہادر شاہ کا جب شیعہ ہونا مشہور ہوا تو بادشاہ کے ایما پر مرزا نے ایک فارسی

مثنوی لکھی تھی۔ اعلام نامہ بھی غالباً اسی قسم کی کوئی تصنیف تھی۔

(۳۳) نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق۔ وزیر عماد الملک کے اخلاف میں سے تھے۔ عماد الملک قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ اوّل کے بڑے بیٹے غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کا بیٹا تھا سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم بنا اور اس کو تباہی کے قریب پہنچا دیا۔ پھر پریشان ہو کر بھاگا۔ پھرتا پھراتا گوالیار پہنچا تو مہاراجہ گوالیار نے بارہ گانو جاگیر میں دئے جو باونی کے نام سے مشہور ہوئے۔ وفات کے بعد اس کے بیٹے مالک جاگیر بنے۔ انوار الدولہ غالباً اس کے بیٹے کے پوتے تھے۔

خطوط غالب میں ان کے نام اکیس مکتوب شامل ہیں۔ مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ اکثر اپنی غزلیں اور قصائد بغرض اصلاح بھیجتے تھے۔ مرزا انھیں بھی سخنداں و سخن فہم سمجھتے تھے۔ غدر کی وجہ سے شاید ان کا بھی مالی نقصان ہوا تھا۔

سلسلۂ اخلاف اس طرح ہے:—




غالب اور ذوق کے مشہور معرکے کس نے نہیں سنے۔ غالب کے ایک شاگرد کا بھی

سہرا دیکھیے ؎

انجم بخت سلاطیں کا بنا کر سہرا — دست تقدیر نے باندھا ترے سر پر سہرا
شجرِ وادیٔ ایمن کے جو گل ہاتھ آئیں — لائیں موسیٰ یدِ بیضا سے بنا کر سہرا
کس جواں بخت کے پہنچا ہے سرِ اقدس تک — اپنے جامے سے نہ کس طرح ہو باہر سہرا
عقدِ پرویں سرِ دستار پہ ہر طرّۂ زر — کہکشاں پر تو رخ سے ہے سراسر سہرا
تارِ مقیش کے ہیں تارِ نگاہِ مشتاق — پھر رہا ہے جو ترا آنکھوں کے اندر سہرا
لب لعلیں کا پڑا عکس تو ہر اک نے کہا — موتیوں کا ہے کہ یاقوت کا سر پر سہرا
سورۂ نور کی سطریں ہیں سنہری مرقوم — مصحفِ رخ پہ نہیں تیرے منور سہرا
کیوں نہ ہو صورتِ سیماب ہر اک دل بیتاب — آئینہ چہرہ پرنور ہے، جو ہر سہرا
دیکھ دولہا کو ہر اک جن و بشر غش کرتا — اس سبب سے ہے نقابِ رخ انور سہرا
دھوم سہرے کی ترے تا بہ فلک پہنچی ہے — زہرہ گاتی ہے سرِ تارمِ اخضر سہرا
غالب و ذوق کی ہے سحر بیانی مشہور — کس کی طاقت جو کہے ان کے برابر سہرا
پیروی ان کی ہے منظور نہ دعوائے سخن — شفق ہیچمداں لایا جو کہہ کر سہرا

(۳۵) سید احمد خاں ۔ یہ سید احمد کون بزرگ تھے کچھ پتہ نہ چل سکا
سید احمد بریلوی شاہ اسمٰعیل شہید کے ہمراہ بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے
مقابلہ کرتے ہوئے مئی ۱۸۳۱ء میں شہید ہو چکے تھے اور سر سید احمد نہ
کبھی بریلی گئے اور نہ بریلی ان کا وطن تھا۔

خط نمبر (۳۶)

## (۱) مسجد فتحپوری :-

"یہ مسجد نہایت ہی تحفہ اور نفیس بنی ہوئی ہے۔ طول میں ۱۳۵
فٹ اور عرض میں چھیاسٹھ فٹ ہے۔ سراپا سنگ سرخ سے بنی ہے۔ اس کے

گنبد کے دونوں طرف تین تین در کے ایوان درایوان ہیں - کرسی میں تمام منبتکاری کی ہوئی ہے اور اندر اس کے سنگ مرمر کا فرش ہے - دونوں کونوں پہ دو مینار نوّے نوّے فٹ کے اونچے ہیں - مگر اب ان کی چھجیاں ٹوٹ گئی ہیں - صرف مینار باقی ہیں - اس کے صحن میں ایک چبوترہ سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے - یہ عرض وطول میں مربع ۳۵ فٹ ہے اور صحن میں ایک عمدہ حوض بنا ہوا ہے - چاندنی چوک کی نہر بھی اس میں سے ہو کر پانی آتا تھا - نواب فتحپوری محل بیگم نے جو شاہجہاں بادشاہ کی بیگم تھیں اسے تعمیر کرایا تھا -"

خط نمبر (۴۰)

(۱) مرزا غالب کو آم تو ویسے ہی بہت بھاتے تھے لیکن بنگال کے آم بہت پسند تھے - یہ آم جون میں چل پڑتے ہیں - غالب نے انھیں آموں کی تعریف میں لکھا ہے ؎

ہمہ گر میوۂ فردوس بہ خوانت باشد

غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ایک اردو قطعہ "در صفت انبہ" کے عنوان سے دیوان غالب میں شامل ہے - اس کا مطلع ہے ؎

ہاں دل دردمند زمزمہ ساز

کیوں نہ کھولے در خزینۂ راز

اس قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر

کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتش گل پہ قند کا ہے قوام
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرط رافت سے
باغبانوں نے باغ جنّت سے
انگبیں کے بہ حکم رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخ نبات
مدتوں تک دیا ہے آب حیات

خط نمبر (۴۱)

(۱) حقیقی سالے سے مراد مرزا علی بخش خاں رنجور ہیں۔ ان کے حالات خط نمبر ۹ کے حواشی میں ملاحظہ کیجئے۔

خط نمبر (۴۲)

(۱) ان ہی دونوں قصیدوں کے متعلق مرزا غالب تفتہ کو لکھتے ہیں:
"بادشاہ کا قصیدہ سارا اور ولی عہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے کہہ رکھا تھا۔ اس کا خاتمہ بہ ہزار مشقت رمضان میں کہہ لیا اور عید کو دونوں پڑھ دئے۔ بھائی منشی نبی بخش حقیر صاحب کو پرسوں یا اترسوں بھیجوں گا۔ ان سے لے کر تم بھی دیکھنا۔ میں نے ان کو لکھکر بھیجا ہے کہ منشی ہرگوپال کو بھی دینا کہ وہ پڑھ لیں اور چاہیں تو نقل لے لیں"

خط نمبر (۴۳)

(۱) کلیات میں یہ سینتالیسواں قصیدہ ہے۔ اس میں اکیاون اشعار ہیں۔ اس کے چند مدحیہ اشعار یہ ہیں: ؎

بہ خلق رخ نہ نماید شبانہ اختر روز
زاشک روشنئ شمع در شبستانش
شمردہ اند بزرگاں بزرگ آفاقش
نوشتہ اند خدیوان خدیو گیہانش
چرا بہ ہمسرئ جم سرش فرود آید
یگانہ کہ بود باد گر بہ فرمانش
زباد کارنہ گیرد خدا نگہدارد
زننگ نسبت ہیچشمئ سلیمانش

خط نمبر (۵۱)

(۱) یہ نظم و نثر چند فارسی غزلیات اور اس اندوہگیں نامہ پر مشتمل تھی جو عارف کی بیوی کی وفات پر لکھا گیا تھا۔

خط نمبر (۵۶)

(۱) **نواب زینت محل بیگم:**۔ بیگمات میں بہادر شاہ سب سے زیادہ نواب زینت محل بیگم ہی سے محبت کرتے تھے۔ دہلی میں فراشخانہ کے قریب میٹھے کنویں کی گلی سے تھوڑی دور آگے ایک عمارت ان کے نام سے مشہور ہے۔ اسے زینت محل بیگم نے لب سڑک خود تعمیر کروایا تھا۔

اپریل ۱۸۴۶ء میں جب زینت محل بیمار ہوئیں تو ان کے معالجہ کے لئے نواب فرخ آباد کے طبیب خاص حکیم امام الدین خاں کو بلوایا گیا۔ شفایابی کے بعد غالباً انھیں کی سفارش پر حکیم صاحب کو شاہی طبیبوں میں شامل کر لیا گیا۔

مرزا جواں بخت نواب زینت محل ہی کے بطن سے تھے۔ مرزا فخرو کے بعد انھوں نے کوشش کی کہ جواں بخت کو ولی عہد مقرر کر دیا جائے لیکن سرکار انگریزی نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ غدر کے ہنگامے میں الٰہی بخش کی معرفت انگریزوں کو خبریں پہنچاتی رہیں اور وعدہ لیا کہ فتح دہلی کے بعد مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنا دیا جائے گا۔ لال قلعہ سے جب تمام بیگمات، بہادر شاہ اور دوسرے شاہزادے ہمایوں کے مقبرے جانے لگے تو جواں بخت کی شادی کے سامان کو ایک خاص مقام پر دفن کر دیا اور جاتی دفعہ انگریزوں کو خبر بھیج دی۔ فتح دہلی کے بعد انھیں بھی بہادر شاہ کے ساتھ رنگون روانہ کر دیا گیا۔

خط نمبر (۵۷)

(۱) **تفتہ کی خفگی اور دیوان کا دیباچہ:۔** تفتہ نے اپنے دیوان کے دیباچہ کے لئے مرزا غالب سے درخواست کی تھی۔ غالب جواباً لکھتے ہیں:

"صاحب دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لوگے میں کہاں تک دیباچہ لکھا کرونگا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو فراہم ہو جائے دوسرے دیوان میں اس کو درج کرو۔"

غالب نے پہلے دیوان کا جو دیباچہ لکھا تھا اس سے بھی تفتہ خوش نہ ہوئے تھے اور اس کو اپنی ہجو بلیح جانتا تھا۔ غالب کو اس کا بھی رنج تھا۔ جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے۔

خط نمبر (۶۴)

(۱) عید کی مثنوی:۔ کلیات نظم فارسی میں بہادر شاہ کی مدح میں صرف ایک مثنوی شامل ہے اس بیالیس اشعار کی مثنوی کا عنوان "تہنیت عید شوال" ہے۔

۱۸۵۵ء میں عید شوال ۱۷ جون کو اور عید الضحیٰ ۲۵ اگست کو ہوئی تھی۔ اور یہ خط ۲۴ ستمبر ۱۸۵۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ مثنوی کا پہلا شعر اس طرح ہے ؎

دولتِ شہ دولتِ جاوید باد

تا ابدش عید پس از عید باد

خط نمبر (۶۵)

(۱) مرزا کی مراد اپنے اردو دیوان کے دوسرے ایڈیشن سے ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا یہ خط چونکہ ۳ اکتوبر ۱۸۵۵ء کا مرقوم ہے اس لئے یہ نسخہ اکتوبر ۱۸۵۵ء سے قبل شائع ہو چکا تھا۔ اس دیوان میں ۱۰۹۳ اشعار تھے اور اس کی ترتیب کلیات فارسی کی موجودہ ترتیب سے مشابہ تھی یعنی ابتدا میں قطعات، پھر مثنوی، پھر قصائد اس کے بعد غزلیں اور آخر میں رباعیات۔

غالب نے ایک نسخہ منشی نبی بخش حقیر کی نذر کیا ہوگا۔ انھوں نے اسے اپنے کسی اور دوست کو دے دیا اور ایک اور نسخہ کی فرمائش کی جس کے

بجالانے میں مرزا پس وپیش کرتے نظر آرہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان بہت جلد ختم ہوگیا تھا۔

(۲) ترجمہ

(۱) اے ذوق نوانجی مجھے پھر آمادہ شورش کر۔ اور میرے ہوش پر شبخون مار۔

(۲) اگر خون سر سے خود بخود نہیں نکلتا تو اسے آنکھوں کے راستے سے زمین پر برسا دے۔ دل کو خون کر اور اس خون کو اپنے سینے میں جوش زن کر۔

(۳) اے عقلمند دوست تو بیابان کا راستہ جانتا ہے۔ ایسی شمع لا جو ہوا سے نہ بجھ سکتی ہو۔

(۴) اس وادی کے کھاری پانی کا چشمہ بہت تلخ ہے۔ اگر تو دلیر اور سخی ہے تو شہر سے میری جانب چشمۂ شیریں لا۔

(۵) میں جانتا ہوں کہ تیرے پاس روپیہ پیسہ ہے اور تیرا ہر جگہ گزر ہے اگر سلطان تجھے شراب نہ دے تو کلال کی دکان سے لے آ۔

(۶) مغ جس کی تحویل میں شراب رہتی ہے۔ اگر تیرے تونبے میں شراب ڈال دے تو اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر راستہ لے۔ یعنی اسے ہاتھ پر رکھ کر چلا آ۔ اور اگر بادشاہ تجھے ایک سبو بخش دے تو اسے کندھے پر اٹھا کر لے آ۔

(۷) ریحاں مینا سے اگتی ہے اور نغمہ قلقل سے ٹپکتا ہے۔ ریحاں کو آنکھ کی راہ میں ڈال دے اور اسے کان کے لئے لے آ۔

(۸) کبھی جلد اس شراب کی تاثیر کی وجہ سے مجھے بنجو دنیا دے اور

کبھی اس سیہ مستی کی حالت میں نغمہ سنا کر مجھے ہوش میں لا۔

(۹) غالب خدا اس کو جیتا رکھے اگر تیرے ساتھ نہ آ سکے تو خیر اس کمبل پوش درویش سے کوئی غزل یا کوئی شعر ہی لے آ۔

مرزا غالب نے یہ غزل نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو بھی بھیجی تھی۔ لکھتے ہیں:

"شب کو ناگاہ ایک نئی زمین خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی۔ غزل تمام کی۔ اسی وقت سے خیال میں تھا کہ کب صبح ہو اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیجوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں اور میرے قبلہ جناب میر واجد علی صاحب کو سنا دیں اور میرے شفیق منشی نادر حسین خاں صاحب اور ان کے بھائی صاحب اس کو پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے۔"

خط نمبر (۶۶)

(۱) ترجمہ

اور کون ہے جو ہماری موت پر اس طرح سے رونا شروع کرے اور اس کے لبوں سے اس طرح آہ و زاری جاری ہو۔

اس فن محبت میں حقیر یکتا ہے کہ ہمارا دل خون ہو کر اس کی آنکھ سے ٹپک پڑتا ہے۔

"کہ خوں شود دل ما وز چشم او بچکد" کیا خوب کہا ہے۔

خط نمبر (۶۷)

(۱) مرزا کا اشارہ منشی ہرگوپال تفتہ کے لڑکے تیمبر سنگھ کے انتقال کی جانب ہے جس کا ذکر خط نمبر ۶۱ میں آیا ہے۔

خط نمبر (۶۸)

(۱) ولی عہد

"شہزادہ غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو مخاطب بہ فتح الملک ابن بہادر شاہ اپنے بڑے بھائی مرزا دارا بخت ولی عہد اول کے انتقال (۱۱ر جون ۱۸۴۹ء) کے بعد ولی عہد بنے۔ غالب کے قدردان اور شاگرد تھے۔ مہر نیمروز انہی کے حکم سے ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئی۔ ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو وفات پائی۔ بعض لوگوں کو شبہ تھا کہ انھیں زہر دیا گیا۔

۹ر جولائی کی رات کو انھیں خلاف عادت چار مرتبہ اجابت ہوئی۔ بھوک لگی تو شوربہ چاول کھائے اجابت نہ رکی اور کمزوری بڑھتی گئی۔ حکیم احسن اللہ خاں کو بلایا گیا۔ انھوں نے نسخہ تجویز کر کے بادشاہ کو اطلاع دی ۱۰ر جولائی کی شام کو نیم بیہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ سات بجے کے قریب انتقال کیا۔ اس وقت چالیس برس کی عمر تھی۔

مرزا فخرو نے غالب کا چار سو روپے سالانہ مقرر کر رکھا تھا۔ حسن علی اور حسین علی کے لئے دس روپے ماہانہ الگ تھے۔ کلیات نظم فارسی میں ایک مثنوی، چند قطعات اور تین بلند پایہ قصیدے ان کی مدح میں موجود ہیں۔ ایک معرکتہ الآرا قصیدے کے چند اشعار ہیں۔

؎

دادرِ سلطان نشاں آید ہمے
سرورِ گیتی ستاں آید ہمے

دادرِ و سرور چہ میگوئی بگوے
والئی ہندوستاں آید ہمے

شہریاراں نکتہ داناں بودہ اند
شہریارے نکتہ داں آید ہمے

مہرباں بر خلق باید شہریار
شہریارے مہرباں آید ہمے

شہریارے باجوانی خوشتر است
شہریارے نوجواں آید ہمے

خط نمبر (۶۹)

(۱) غالباً یہ مصرعہ سعدی کا ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے ؎
دیدار مے نمائی و پرہیز مے کنی
بازارِ خویش و آتشِ ما تیز مے کنی

خط نمبر (۷۱)

(۱) سلیم گڈھ
لال قلعہ کے متصل شمال کی جانب واقع ہے۔ اسے سلیم شاہ بن شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۶ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ہمایوں نے اس کا نام نور گڈھ رکھا۔ اس کا اصلی دروازہ جنوب کی سمت نگم بودگھاٹ کی طرف تھا۔ شاہجہاں نے جب دہلی آباد کی تو یہ عمارت بطور قید خانہ استعمال میں آنے لگی۔ اب اس کے ایک کونہ سے ریلوے لائن بھی گزرتی ہے۔

خط نمبر (۷۲)

(۱) مرزا غالب نے حکام سے تجدید مراسم درو الطکی خاطر ایک کتاب بنام دستنبو مشتمل بر حالات غدر لکھی تھی۔ چونکہ یہ کتاب افسران بالا کو پیش کی جاتی تھی اس لئے غالب کی خواہش تھی کہ کتاب اچھی چھپے۔ حکام

کے لئے چند نسخے مجلد کرانے تھے۔ منشی نبی بخش کے بیٹے منشی عبداللطیف بڑے اچھے صحاف تھے۔ اس لئے مرزا نے چاہا کہ ان جلدوں کی تزئین انھیں کے ہاتھوں ہو۔ منشی عبداللطیف نے معذرت چاہی۔ جو اصل کیفیت تھی وہ تفتہ نے غالب کو لکھ دی تھی لیکن یہاں مرزا منشی عبداللطیف کا عذر قبول کر رہے ہیں۔

## (۲) مرزا حاتم علی

غالباً آگرے کے رہنے والے تھے۔ کشمیری بازار میں مکان تھا۔ عہدۂ وکالت پر مامور تھے۔ انھوں نے بھی دستنبو کی آرائش و طباعت میں حصہ لیا۔ متعدد خطوط میں مرزا غالب نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں ان کے کسی بہادری کے کارنامہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"واقعی یہ کہ تم نے بڑی جرأت کی۔ فی الحقیقت اپنی جان پر کھیلے تھے بات پیدا کی مگر اپنی مردی و مردانگی سے۔ دولت کا ہاتھ آنا معہ نیک نامی اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں۔ اب یقین ہے کہ خدمت منصفی ملے اور جلد ترقی کرو۔ ایسا کہ سال آئندہ تک چشم بد دور صدر الصدور ہو جاؤ"۔

ان کی تصویر بھی مرزا غالب کی نظر سے گزری ہوگی۔ لکھتے ہیں:

"تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔

وہ مرنے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔"

مہر کی محبوبہ کا انتقال ہوا تو غالب نے لکھا:

"ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد وورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق وفجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک افشانی کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔"

(۳) منشی عبداللطیف نے جب دستنبو کی جلدوں کی تزئین سے انکار کر دیا تو یہ کام مرزا حاتم علی مہر کے سپرد ہوا۔ طے پایا تھا کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں اور باقی چار جلدیں سیاہ قلم کی لوح کی ہوں۔ بعد میں ان چار جلدوں کے بجائے پانچ جلدیں بنوائی گئیں۔ ان پر مرزا کے بارہ روپے صرف ہوئے۔

(۴) غیاث اللغات مرتبہ غیاث الدین رامپوری ایک فارسی لغت ہے۔ مرزا غالب نہ تو غیاث الدین رامپوری کی فارسی دانی کے قائل تھے اور نہ غیاث اللغات کو صحیح لغت مانتے تھے۔ دستنبو کیونکہ آگرے میں چھپ رہی تھی اس لئے مرزا نے اس کی تصحیح کا ذمہ منشی نبی بخش حقیر کا کر دیا تھا۔ حقیر نے بعض الفاظ کی لغت غیاث اللغات میں دیکھی جسے مرزا نے ناپسند کیا اور تفتہ کو لکھا:

"بھائی میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان اجزا کا جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے فارسی کا عالم ہے۔ علم اس کا غیاث الدین رامپوری اور

حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق ان اوراق کے ہو نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔ آگے اس سے تم کو بھی اور بھائی کو بھی لکھ چکا ہوں۔ اب صرف اس تحریر کا اشارہ لکھنا منظور تھا۔"

نواب انوار الدولہ شفق کو غیاث اللغات کے متعلق لکھتے ہیں:

"غیاث اللغات ایک نام موقر و معزز جیسے الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ ایک معلّم فرومایہ رامپور کا رہنے والا فارسی سے نا آشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام، "انشائے خلیفہ" "منشیات مادھورام" کا پڑھنے والا، چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھورام و "غنیمت" و "قتیل" کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہ سخن کے غول ہیں آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں۔ ہاں طبع موزوں رکھتے تھے۔ شعر کہتے تھے ؎

ہرزہ مشتاب و پے جادہ شناساں بردار

اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

## (۵) منشی شیو نرائن آرام

منشی شیو نرائن بھی آگرے کے رہنے والے تھے اور ان کے بزرگوں کے مراسم غالب کے بزرگوں سے تھے۔ مرزا غالب انھیں ایک خط میں ان کے اور اپنے بزرگوں کے حالات اس طرح لکھتے ہیں:

برخوردار نور چشم منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار۔ تم کو ہمارے خاندان

اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال معلوم ہے؟ مجھ سے سنو:

تمہارے دادا کے والد عہد "نجف خاں" و "ہمدانی" میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر "خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے "کچھ کٹھم گانو" اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت، آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس، ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جواب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اس کے ایک "کھٹیا والی حویلی" اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑا کہ وہ "گڈریوں والا" مشہور تھا اور ایک کٹڑا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ "واصل خاں" نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور وہ کٹڑوں کا کرایہ اُگاہ کر ان کے پاس جمع کرتا تھا۔"

مطبع مفید خلائق آگرہ انھیں کی ملکیت تھا۔ مرزا غالب کے اردو خط چھاپنے کی سب سے پہلے انہی کو سوجھی تھی۔ ان ہی کی فرمائش پر مرزا غالب نے لارڈ ڈالن برا کی مدح میں ۲۱ اشعار کا قصیدہ ایک رات میں لکھ ڈالا تھا جس کا مطلع ہے ؎

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ

جنابِ عالی ایلن برون والا جاہ

دستنبو چونکہ انھیں کے مطبع میں چھپ رہی تھی اس لئے مرزا غالب جہاں حاتم علی خاں مہر، منشی نبی بخش حقیر اور منشی ہرگوپال تفتہ کو ہدایات بھیجتے تھے وہاں انھیں بھی مخاطب کرتے تھے تاکہ اگر ان لوگوں سے سہو ہو جائے تو منشی شیو نرائن ضروری ہدایات بجا لائیں۔

(۶) "حکیم صاحب سے مراد حکیم احسن اللہ خاں ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں آگرے سے ایک ہفتہ وار اخبار آفتاب عالمتاب نکلتا تھا۔ اس اخبار میں تقریباً ایک ڈیڑھ صفحہ بہادر شاہ کے حالات پر مشتمل ہوتا۔ حکیم صاحب یہ تمام حالات جمع کرنے چاہتے تھے۔ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"ان دنوں میرے محسن حکیم احسن اللہ خاں "آفتاب عالمتاب" کے خریدار ہوئے ہیں اور میں نے بموجب ان کے کہنے کے برادر دین مولانا مہر کو لکھا ہے۔ حضرت نے لا و نعم جواب میں نہیں لکھا۔ تم ان سے کہو کہ وہ ستمبر ۱۸۵۸ء سے خریدار ہیں۔ آج ۱۶ ستمبر کی ہے۔ دو نمبر اخبار کے حکیم صاحب کے نام کے سرنامہ "خان چند" کے کوچہ کا پتہ لکھ کر روانہ کریں۔ آئندہ ہفتہ بہ ہفتہ بھیجے جائیں اور حکیم احسن اللہ خاں کا نام خریداروں میں لکھ لیں۔ دوسرے اخبار مذکور میں ایک صفحہ ڈیڑھ صفحہ بادشاہ دہلی کے اخبار کا

ہوتا ہے جس دن سے وہ اخبار شروع ہوا ہے اس دن سے صرف اخبارات شاہی کا صفحہ نقل کر کے ارسال کریں۔"

تفتہ نے لکھا کہ اگر حکیم صاحب کاتب کی اجرت اور اخبار کی قیمت دینے کو تیار ہوں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ حکیم صاحب اس پر راضی ہو گئے اور چار روپے بطور دست مزد کاتب و چندہ بھیجنے پر تیار ہو گئے۔

خط نمبر (۳۱) ۷۲

## (۱) ریڈ صاحب

مرزا غالب کے خطوط میں ان کا ذکر سب سے پہلے ایک خط مرقومہ ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء میں آیا ہے۔ غالب اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے تفتہ کو لکھتے ہیں:

"ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے۔ اور ہاں بھئی ایک تماشا اور ہے۔ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔"

ریڈ صاحب نے مرزا غالب سے اردو نثر کی فرمائش بھی کی ہوگی۔ چنانچہ مرزا منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا ان کی فرمائش ہے اردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ انکو خط لکھوں۔

مگر بھائی، غور کرو، اردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا؟ اور اس عبارت میں معانی نازک کیونکر بھروں گا؟ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں؟ کون سی بات، کون سی کہانی، کونسا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں؟ تمہاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ۔ ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہوا کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو "دستنبو" کی خریداری کرے گی۔ اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔"

اس کے بعد ایک اور خط میں ریڈ صاحب اور اردو نثر کا اسطرح ذکر کیا ہے۔

"میاں اردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو؟ خیر ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کتاب میرے پاس نہیں۔ پنشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں؟"

خط نمبر (۱۲)

(۱) جناب آرنلڈ صاحب۔ ان کے بھی تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ لیکن ایک خط بنام منشی شیونرائن آرام میں ان کا اسطرح ذکر آیا ہے:-

"پرسوں اور کل، دو ملاقاتیں جناب آرنلڈ صاحب بہادر سے ہوئیں۔ کیا کہوں کہ مجھ پر بے سابقہ معرفت کیا عنایت فرمائی؟ میں یہ جانتا ہوں گویا مجھ کو مول لے لیا۔ آج وہ یہاں اور ہیں، کل جائیں گے۔ "دستنبو" تمہاری بھیجی ہوئی ان کے پاس نہیں پہنچی۔ ناچار ایک دستنبو اور ایک پنج آہنگ اپنے پاس سے ان کو نذر کر آیا ہوں۔"

———×———